چوہدری غلام عباس
کشمیر اسٹیڈیز فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ)
مدینہ چوک گاؤکدل سری نگر کشمیر
KSF

نام کتاب	:	کشمکش
مصنف	:	چودھری غلام عباس (مرحوم)
ناشر	:	کشمیر اسٹیڈیز فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ) سرینگر
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	شبیر احمد (سرینگر کمپیوٹرز)
تاریخ اشاعت	:	جون ۲۰۰۱ء
طباعت	:	میکاف پرنٹرس دہلی
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	Rs 100

E-mail:ksfoundation@rediffmail.com

ملنے کا پتہ:

- عبداللہ نیوز ایجنسی، امیرا کدل سرینگر
- ریاض نیوز ایجنسی کدلہ بل پانپور
- بڈشاہ نیوز ایجنسی لال چوک سرینگر

چودھری غلام عباس

کشمیر اسٹیڈیز فاؤنڈیشن
رجسٹرڈ
مدینہ چوک، گاؤکدل، سرینگر کشمیر

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف اول

کوئی قوم آگے بڑھنا اور ترقی کرنا چاہتی ہے تو اسے حال کی ضرورتوں کے ساتھ ماضی کا بھی جائزہ لینا پڑتا ہے۔ ماضی میں اس نے کیا کھویا؟ کیا پایا؟ اس سے کیا سیاسی اور تاریخی غلطیاں سرزد ہوئیں اور ان کے کیا نتائج برآمد ہوئے۔؟ موجودہ صورتحال تک اسے پہنچانے میں کیا عوامل کارفرما رہے؟ یہ جائزہ اسے ماضی کے تجربات اور کوششوں سے سبق حاصل کرنے میں مدد دے گا۔ وہ ان غلطیوں سے اجتناب کرے گی جو اس کے نقصان کا باعث رہی ہیں۔ اسلاف کے کارناموں سے جہاں اسکے اندر حرکت عمل پیدا ہوگی، وہیں ان کی غلطیوں کا محاسبہ صحیح لائحہ عمل کی جانب اسکی رہنمائی کرے گی۔ جس قوم میں احتساب عمل کا جذبہ کارفرما ہو وہی قوم مستقبل میں منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکتی ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اسے زیر نہیں کرسکتی ہے۔

صورت شمشیر ہے دست قضاء میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

اقبال

"کشمیر اسٹیٹیز فاؤنڈیشن" نامی تحقیقی، اشاعتی اور ہیومن رائٹس ادارے کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر سے متعلق تاریخی کتب کو منظر عام پر لاکر کشمیری قوم کو اپنے ماضی سے واقف کرایا جائے

تا کہ وہ اپنے ماضی کا مطالعہ کر کے مستقبل کی راہیں متعین کر سکے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہماری یہ آرزو اور تمنا اُس وقت پوری ہوئی جب کافی دوڑ دھوپ، کوشش اور تحقیق کے بعد ہمیں ایک مستند اور نایاب کتاب "کشمکش" کی ایک کاپی حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ "کشمکش" مرحوم چودھری غلام عباس کی آٹو بیوگرافی Autobiography ہے جو انہوں نے دورانِ اسیری تحریر کی ہے۔ چودھری غلام عباس ریاست جموں وکشمیر میں تحریک حریت کے بانیوں میں سے تھے۔ جنہوں نے ظلم و جبر اور استبدادی قوتوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے مظلوم قوم کی قیادت کی۔ اپنی حق گوئی اور بیباکی سے ریاست کی سیاسی فضاء میں ایسا جادو جگانے لگے کہ غلام قوم کے خوابیدہ جذبات جاگنے لگے۔ انہوں نے ایک واحد راستباز اور غیر متزلزل سیاسی رہنما کے طور پر اپنا لوہا منوایا۔ دھوکہ اور فریب کی سیاست سے فطری طور پر متنفر تھے۔ تحریک حریت کو ریاست بھر میں منظم کرنے کیلئے شہروں، قصبوں، دیہاتوں اور کوہ و بیابان کا شب و روز سفر کیا اور اسی جرم کی پاداش میں سب سے پہلے انہیں گرفتار کیا گیا۔ اور یوں انہیں "اسیرِ اول" کا شرف حاصل ہے۔

گذشتہ ایک دہائی سے ریاست جموں وکشمیر کے عوام نے حصولِ آزادی کیلئے ریکارڈ توڑ قربانیاں دی ہیں۔ شیر خوار بچوں سے لیکر عمر رسیدہ بُزرگوں تک سماج کے ہر طبقے سے وابستہ ہزاروں افراد کو شہید کر دیا گیا۔ کپواڑہ کے فلک بوس پہاڑوں سے لیکر ڈوڈہ، راجوری اور پونچھ تک ہر طرف وسیع و عریض مزارِ شہداء نظر آتے ہیں۔ قتل و غارت گری، لُوٹ مار، آتشزنی، حراستی ہلاکتیں، عصمت دری کے دلخراش واقعات کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ کشمیریوں کیلئے ہر صبح، صبحِ کربلا اور ہر شام، شامِ غریباں بن کر آجاتی ہے۔

ہرطرف یتیموں کی آہیں، بیواؤں کے آنسوں، معذوروں کی چیخ وپکاراور مظلوموں کی نالہ وفریاد ہیں۔ یہ بیش بہاقربانیاں جس مقصداور مشن کیلئے مسلمانانِ ریاست نے دی ہیں اِسی مقصد کو حاصل کرنے کیلئے چودھری غلام عباس نے آج سے ۷۰ سال قبل تحریک آزادی کی بنیاد ڈالی۔ جابراور ظالم قوتوں نے ان کے عزائم کو توڑنے کیلئے مختلف قسم کے حربے استعمال کئے لیکن ملت کے یہ غم خواراور محسن اپنے موقف پر چٹان کی طرح ڈٹے رہے۔ تحریک آزادی سے چودھری صاحب کو اتنا والہانہ اور عاشقانہ لگاؤ تھا کہ وہ اپنی ذاتی اور گھریلو ذمہ داریوں کو یکسر بھول چکے تھے۔ ملت کے تئیں ان کی وفاداری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں زندگی بھر اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کیلئے فرصت نہیں ملی اور جب ۱۹۴۳ء میں ان کے والد کا انتقال ہوا تو سرینگر میں مسلم کانفرنس کے مجلس عاملہ کے اجلاس کے دوران تنظیمی مصروفیات کی وجہ سے چودھری صاحب اپنے والد کی تجہیز و تکفین میں بھی شرکت نہ کرسکیں۔

"کشمکش" چودھری صاحب کی خود نوشت سوانح حیات ہی نہیں بلکہ مسلمانانِ ریاست کے ایک طویل عرصہ پر محیط تاریخی، قومی اور سیاسی واقعات کی مستند تاریخ ہے۔ ۲۶ ابواب پر مشتمل یہ کتاب بے شمار اہم واقعات اور اہم نکات کی ترجمان ہے۔ اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے اس میں دلچسپ معلومات جمع کردی گئی ہیں۔ پوری کتاب پڑھنے کے بعد تشنگی کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتی ہے۔ بِلا شُبہ "کشمکش" کو پڑھ کر کشمکش کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ کسی عظیم شخصیت کے حالات اور سوانح پڑھنے کا فائدہ یہی ہے کہ اس کی ذات ہمارے لئے مشعلِ راہ بن جائے اور ہماری زندگی میں جو کاہلی اور جمود ہے وہ ختم ہوجائے۔

"کشمکش" کا پہلا ایڈیشن بیسویں صدی کے وسط میں شائع ہوا تھا۔

اور بعد میں اگرچہ "تحریک آزادی کشمیر سیل" نے غالباً بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں اسکو دوبارہ شائع کیا تاہم آج یہ تاریخی کتاب نہ صرف ہندستان بلکہ پورے برصغیر میں دستیاب نہیں اور کہیں سے اس کا حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اس لئے ہم نے اس کتاب کو شایع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ کتاب کی پرنٹنگ چونکہ آج سے نصف صدی قبل کی گئی تھی اور اکیسویں صدی کے اس اِنفارمیشن اور ٹیکنالوجی کے دور کے تقاضات کے پیشِ نظر کتاب کے مُسودہ کو کمپیوٹرائز کیا گیا اور دو تین مرتبہ اس کی پرُوف ریڈنگ کرکے یہ کوشش کی گئی کہ اس میں کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ کتاب کو دلکش اور جاذبِ نظر بنانے کیلئے کتاب کا ٹائٹل (سرورق) نئے سرے سے مرتب کیا گیا۔ اور ساتھ ہی کتاب کے آخری ٹائٹل پر مصنف کی یادگار تصویر شائع کی گئی۔

ہماری کوشش ہے کہ تحریک آزادی کشمیر کو علمی اور فکری سطح پر اُجاگر کیا جاسکے۔ تاکہ آنے والی نسلیں اس تحریک کے پس منظر، خدوخال، اُتار وچڑھاؤ اور نشیب وفراز سے واقف ہو کر مستقبل کی راہیں متعین کرسکیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے اس جذبہ خلوص کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور ہر خاص وعام میں اس کی پذیرائی ہوگی۔ آخر پر ہم ان تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے کتاب کی اشاعت میں اپنا تعاون دیا۔

شیخ ولی محمد

کشمیر اسٹیڈیز فاؤنڈیشن

۱۰ رمئی ۲۰۰۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعارف

''کشمکش'' قائدِ کشمیر چودھری غلام محمد عباس کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ چودھری غلام عباس سرزمین جموں وکشمیر میں بسنے والے مسلمانوں کے جذبات کے نقیب اوران کی اُمنگوں کے ترجمان تھے۔ وہ ایسے عظیم بطلِ حریت تھے جن کی زندگی کا ہر لمحہ جدوجہد آزادی سے عبارت ہے۔ آپ نے ریاست جموں وکشمیر میں جدوجہد آزادی کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں کی رہنمائی اور رہبری کا عظیم کام سرانجام دیا۔ آپ نے اپنی زندگی کے آخری سانسوں تک اس عہد کی پاسداری کی، جو آپ نے اس کام کا بیڑا اٹھاتے وقت کیا تھا۔ اسی لئے بقول اے آر ساغر صاحب ''کشمکش'' ایک طرف تو چودھری صاحب کی سوانح حیات ہے تو دوسری طرف تاریخ آزادی کی ایک اولوالعزم تاریخ ہے۔ کیونکہ آزادی کشمیر کی منزل کے راہروؤں کے قافلہ سالار چودھری غلام عباس ہی تھے۔

''کشمکش'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اب یہ کتاب مارکیٹ میں دستیاب نہیں بلکہ گوشۂ گمنامی میں کھو گئی ہے۔ اس کتاب میں چودھری صاحب نے تحریک آزادی کشمیر کے ان نشیب وفراز کو آشکار

کیا ہے جو ہماری قومی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ میری رائے میں ہمارے پاس کم ازکم اس عرصے کیلئے کہ جس پر یہ کتاب محیط ہے تحریک آزادی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس لئے **تحریک آزادی کشمیر سیل** نے اس کتاب کو دوبارہ شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس کتاب میں درج چند ایک واقعات سے متعلق تاریخوں کے بارے میں ابہام تھا۔ کیونکہ چودھری صاحب نے یہ خودنوشت جیل میں لکھی تھی۔ آزاد جموں وکشمیر کے یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر محمد سرور عباسی صاحب نے ہماری مدد کی اور ان تاریخوں کو درست کر دیا جس کیلئے ہم ان کے ممنون ہیں۔

ہماری کوشش ہے کہ تحریک آزادی کشمیر کو علمی اور فکری سطح پر اجاگر کیا جائے تا کہ آنے والی نسلیں اپنے ماضی کا مطالعہ کر کے مستقبل کی راہیں متعین کر سکیں۔ یوں ایک طرف ہماری ملی تاریخ مرتب ہوتی چلی جائے گی تو دوسری طرف ہمیں فکر تدبر کا موقعہ بھی میسر آسکے گا۔ ہمیں امید ہے ہماری اس کوشش کو پذیرائی حاصل ہوگی۔

والسلام

عبدالرشید ملک

(سیکرٹری)

سنہ ۱۹۷۴ء

پیش لفظ

یہ کتاب بلاشبہ چودھری غلام عباس کی خودنوشت سوانح حیات عمری ہے۔ لیکن حقیقت میں تحریکِ حریت کشمیر کی مستند ترین تاریخ ہے اور اس شخص کے قلم سے ہے، جس کی ساری زندگی اسی مقصد مقدس کیلئے جدوجہد کرتے گزری ہے۔ اور جس نے گزشتہ پچیس سال کی مدت میں اپنے ذاتی مفاد، اپنی ذاتی آسائش اور اپنے متعلقین کی خوشحالی کو بالائے طاق رکھ کر آزادی کیلئے درویشانہ، قلندرانہ جہاد کیا۔ جیل خانوں کی سختیاں جھیلیں، ناداری کی کڑیاں سہیں، اپنے رفقاء کی غداریوں کے تلخ جام نوش کئے، لیکن اس خودغرض اور مطلب پرست دنیا میں اپنی عدیم المثال دیانت، اپنے بے نظیر ایثار اور اپنے شبانہ روز عمل کے جھنڈے گاڑ دئے۔ اگر پاکستان اور آزاد کشمیر نے چودھری غلام عباس کو حکومت آزاد کشمیر کا رئیس اعلیٰ مقرر کیا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کشمیر میں فی الحال کوئی اس سے بڑا عہدہ موجود نہیں جو رئیس الاحرار کشمیر کی خدمت میں پیش کیا جا سکے۔ میں اور "انقلاب" روز اول ہی سے تحریک حریت کشمیر کے خادموں کی حیثیت سے چودھری صاحب کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔ اسلئے مجھے چودھری صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ یہ شخص ہماری گزشتہ نصف صدی کی قیادت میں اپنی بہت کم مثالیں رکھتا ہے اور خوش قسمت ہے وہ ملک جس کو ایسا رہبر اور کارکن میسر ہو، جس کی دیانت اور قربانی کی شہادت اس کے اشد شدید مخالفین بھی دے رہے ہوں!

اگر ہمیں حریت کشمیر کی جدوجہد میں کامیابی حاصل ہوئی اور یقیناً ہوگی، تو یقین کیجئے کہ وہ چودھری غلام عباس جیسے مخلص، نیک نیت، ایثار پیشہ کارکنوں

کی برکت وسعادت ہی سے ہوگی۔

اس کتاب میں چودھری صاحب نے نہایت سادگی، خلوص اور سلاست سے اپنے ذاتی حالات بیان کئے ہیں۔ لیکن یہ حالات اس مقام پر پہنچ کر دفعتہً ختم ہو گئے ہیں جہاں سے چودھری صاحب کی قومی وسیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اسلئے کہ اس کے بعد چودھری صاحب کے ذاتی حالات بالکل وہی ہیں، جو کشمیر کے ہیں۔ چودھری صاحب تحریک میں اس قدر جذب ہو چکے ہیں کہ "من تن شدم تو جان شدی" کا نقشہ پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن ادبی پہلو سے میرے لئے بھی یہ امر انکشاف کی حیثیت رکھتا ہے کہ چودھری صاحب تقریر کے علاوہ تحریر کے بھی دھنی ہیں۔ وہ نہ صرف واقعات وحالات کو تسلسل اور دلچسپی سے بیان کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں بلکہ بعض مقامات پر احساسات وواردات کی کیفیت بھی ایسے سنجیدہ اور فلسفیانہ انداز سے ظاہر فرماتے ہیں کہ ان کی انشاپردازی کی داد دینی پڑتی ہے۔

ان چند تعارفی سطور میں کتاب کے مطالب کا اعادہ کرنا یا ان کا خلاصہ لکھ دینا نہ ضروری ہے اور نہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ۱۹۳۱ء سے لے کر آج تک ریاست جموں وکشمیر میں مسلمانوں نے ڈوگرہ راج کے ظلم واستبداد سے نجات حاصل کرنے کیلئے جتنی آئینی وغیر آئینی کوششیں کیں، جتنی قربانیاں دیں، جتنی مصیبتیں اٹھائیں ان کا حال چودھری صاحب نے بلاکم وکاست بیان کر دیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر مسلمان اس کتاب کو پڑھے اور نہ صرف اپنے ایک مایہ ناز مجاہدِ حریت کی زندگی سے واقف ہو، بلکہ کشمیر کی تحریک کے پسِ منظر اور اس کی تاریخ کا علم بھی حاصل کرے۔

عبدالمجید سالک

لاہور۔ ۸ر جنوری ۱۹۵۰ء

کتاب کا بیشتر حصہ جموں جیل میں قیام پاکستان سے کچھ عرصے قبل افراتفری میں لکھا گیا تھا اور اس وقت یہ بات ذہن میں تھی کہ میری یہ کاوش ریاست تک ہی محدود رہے گی۔ اسی لئے آج تک اس کی اشاعت میں مجھے تامل رہا۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک چیز باعث اطمینان ہے کہ میری "کشمکش" سے تحریک حریت کشمیر کے پچیس سالہ نمایاں خدوخال اور اہم سیاسی واقعات بہت حد تک ترتیب اور صحت کے ساتھ منظر عام پر آجائیں گے۔

مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا ہے کہ آٹو بائیو گرافی واقعی مشکل چیز ہے، غالباً اس لئے کہ اس میں غیر جانبداری ورواداری اور جرأت اظہار و بے باکی و نگارش کا پلڑا متوازن رہنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اظہارِ حقائق میں پوری کوشش کی گئی ہے، اسکے علاوہ ایک چھوٹی سی قرارداد کے سوا شروع سے لے کر آخر تک کتاب خالصتاً میرے حافظ اور یادداشت کی مرہون منت ہے۔ اسلئے توقع ہے کہ ذاتی اور واقعاتی فروگزاشتیں محل نظر نہیں ہوں گی۔

"کشمکش" وسط اکتوبر ۱۹۴۶ء میں میرے آخری بار جیل میں جانے کے حالات تک محدود ہے۔ بعد کی روداد، جس میں قیام پاکستان کے بعد ریاست کے خونیں واقعات جہادِ کشمیر اور پاکستان میں ہماری چار سالہ سیاسی زندگی بھی شامل ہے، ضبطِ تحریر میں لانے کے لئے ہمت، ماحول اور قلم کی ضرورت ہے۔

غلام عباس

اِبتدائی عمر

میں وکیل بھی ہوں اور سیاسی کارکن بھی، عوام مجھے اپنا لیڈر سمجھتے ہیں اور آپ جانتے ہیں وکالت اور سیاست معزز پیشے مانے جاتے ہیں۔ ان کا عموماً ایک دوسرے سے چولی دامن کا تعلق ہوتا ہے۔ اس کی وجہ شائد یہ ہے کہ وکالت کا پیشہ شہرت کا محتاج ہے اور سیاسی زندگی اس کیلئے ایک وسیع میدان مہیا کردیتی ہے۔ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے اُسے قابلیت، ذہانت اور آئینی موشگافیوں کی بے حد ضرورت ہے۔ اور یہ چیزیں پہلے ہی کامیاب وکلاء کی خصوصیت ہوتی ہیں۔ جو قانون پیشہ اشخاص سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتے ہیں ان کی اس شرکت کے محرکات واسباب مختلف ہوتے ہیں۔ بعض تو صرف اسی غرض سے سیاسی زندگی میں قدم رکھتے ہیں کہ ان کے کاروبار کو چار چاند لگ جائیں لیکن قدرت بجا طور پر انکو اُبھرنے اور پنپنے کی مہلت نہیں دیتی اور بعض ایسے ہیں جو نیک جذبات اور صحیح عزائم کی بنا پر قومی تحریکوں میں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس راہ کی مسافت کٹھن ہوتی ہے، ایک ایک قدم پر ہمت کے پاؤں میں آبلے پیدا ہوتے ہیں۔ آزمائشوں کے کانٹے ان کے آبلوں کو پھوڑ دیتے ہیں، اور اس پر بھی نشانِ منزل ڈھونڈے سے نظر نہیں آتا اس لئے یہ گروہ اپنے حالات کی مجبوریوں سے محض گرد راہ بنکر رہ جاتا ہے لیکن ان میں چند ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے دل میں خدمت خلق کے ولولے اور قوم کو غلامی اور استبداد سے نجات دلانے کی امنگیں موجود ہوتی ہیں۔ بات کے پکّے، عقیدہ کے لحاظ سے فولاد کی طرح مضبوط، عزم واستقلال کے مجسمے، قوموں کے قائد

کہلانے کے حقدار یہی وہ چند نفوس ہیں جو شدائد و محن، دوری منزل اور مجبوری حالات سے گھبرانے اور قافلۂ یاس و قنوط کے گردوغبار میں گم ہو جانے کے بجائے تند و تیز طوفانوں اور بلاخیز آندھیوں کے باوجود منزل کی سمت بے خوف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ حضرت قائداعظم اور گاندھی جی جیسی ہستیوں کا شمار اسی گروہ میں ہوتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ پیشہ قانون کا اعزاز ایسے ہی نفوس کے دم قدم سے وابستہ ہے۔

طبیعت اور مشیّت:۔

میں کہہ رہا تھا میں وکیل بھی ہوں اور قومی کارکن بھی۔ لیکن یہ عجب اِتفاق ہے کہ ابتداً ان دونوں پیشوں کیلئے نہ میری طبیعت موزوں تھی اور نہ میری عادات اور افتادِ طبع ان کیلئے سازگار۔ بات یہ ہے کہ ان دونوں پیشوں کے لئے محنت سکون دماغ اور مغربی کردار ازبس ضروری ہیں جنکے فقدان کا قدرتی نتیجہ ناکامی اور بدنامی ہوتا ہے۔ مجھ میں ان چیزوں کی کمی تھی لیکن بہ این ہمہ قدرت کو یہی منظور تھا کہ میں وکالت اور سیاست دونوں کو اپناؤں۔ عملی سیاسی دنیا میں جہاں قید و بند، دشت نوردی، آبلہ پائی، افکار و حوادث اور گوناگوں جھمیلوں کا ایک ہجوم بے پناہ اور مشاغل کا ایک سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے وہاں اس زندگی کے دوش بدوش وکالت کے آخری زینہ پر پہنچنا ممکن نہیں، اسکا سبب یہ ہے کہ وکالت کیلئے محنت اور مطالعہ ناگزیر ہیں۔ اور سیاسی زندگی اس کی اجازت نہیں دیتی۔ کبھی جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں کو اپنا مسکن بنانا ہوتا ہے اور کبھی جب اسیری سے فراغت نصیب ہو تو ایک بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح کوہ و بیاباں کی مسافت اور بادیہ پیمائی کی صعوبتیں جھیلنی ہوتی ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ باوجود معاملہ فہمی اچھی پریکٹس اور شہرت کے میں وکالت میں پوری دلچسپی نہ لے سکا۔

فکرِ سیاست وفکرِ معاش:-

تحریکِ حریت کشمیر کے آغاز ہی میں چونکہ سیاسی کشمکش اور جدوجہد سے دوچار ہونا پڑا، اسلئے میر اتانِ جویں کا یہ سہارا بھی آہستہ آہستہ ٹوٹتا گیا اوراب یہ حالت ہے کہ کسبِ معاش کا یہ واحد ذریعہ میرے لئے محض ثانوی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔اس کے باعث فکرِ قوم وسیاست سے کہیں زیادہ فکرِ معاش وبال بن گئی ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میری موجودہ حالت بعینہ اس شخص کی سی ہے جو ایک گڑھے کو دو چھلانگوں میں عبور کرنا چاہتا ہے۔ بسااوقات مجھے خیال آتا ہے کہ ان دوزندگیوں میں سے ایک کو ترک کر دوں ۔ترکِ سیاست کے تصور سے بزعم خود یقین کر لیتا ہوں کہ "موسیٰ بے وطن ہو جائے گا" اور انقطاعِ وکالت کے خیال سے معاش کا فکر دامن گیر ہو جاتا ہے۔ بہر حال نتیجہ یہ ہے کہ بیس سال کی عملی سیاسی زندگی کے باوجود یہ کشمکش اب بھی جاری ہے، شائد اسی طرح آئندہ بھی جاری رہے گی اور بہار وخزاں کی طرح میں بھی وکالت وسیاست کے دوراہے پر بحالات مجبوری پڑا رہوں گا۔

لیکن ۱۹۴۶ء میں جب جیل میں ان سطور کا آغاز ہوا دل میں یہ کشمکش موجود تھی کہ سیاست کو اپناؤں یا وکالت کو، آخر زندان کی تنہائی اور یکسوئی میں جانچ تول کر یہ فیصلہ کیا کہ اب پانی سر سے اتنا گزر چکا ہے اور سیاست کی دلدل میں جس میں ایک دفعہ گر کر پھر نکلنا انسان کے بس کی بات نہیں، اس قدر دھنس چکا ہوں کہ وکالت کو خیر باد کہنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔اپنی طرف سے تو یہ فیصلہ غیر متزلزل ہے وقت کا فیصلہ خدا جانے۔

میرا بچپن

آزاد اور مصروف زندگی میں اتنی فرصت کہاں کہ میں اپنے متعلق لکھ سکوں۔ پس اس بار جیل کی تنہائی کو غنیمت سمجھتا ہوں جس نے عمرِ رفتہ کو میرے سامنے لا کھڑا کیا۔

سوچ رہا ہوں کہ زندگی کے واقعات کہاں سے شروع کروں، سیاسی زندگی کی ابتدا کو اس کی بنیاد قرار دوں یا اس سے بھی پہلے کے حالات سے۔

یہ سوچ کر کہ ایسی فرصت پھر نصیب ہو کہ نہ ہو اپنے بچپن کی بھولی بسری کہانیوں سے اپنی کتاب زندگی شروع کرتا ہوں۔

میں ۴ر فروری ۱۹۰۴ء کو جموں میں پیدا ہوا تھا میں بچپن میں تیز و تُند اور گستاخ تھا۔ سوتیلوں اور بہانوں سے ہم عمروں سے جھگڑا اور لڑائی مول لیتا۔ واقف اور ناواقف لڑکوں سے دست بگریباں ہوتا۔ ہٹ کا مضبوط ضِد کا پکا، زود رنج، جذباتی اور ذکی الحس تھا۔ یہاں تک کہ اپنی بات کی تردید بڑوں کی طرف سے بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ دوسروں کی لگائی ہوئی آگ میں بلا تامل کود پڑنا میرا معمول تھا۔ ہم جماعتوں اور محلے کے لڑکوں کی شرارتوں میں اکثر میں ہی آگے آگے ہوتا تھا، اور اس میں مجھے ایک گونہ راحت اور خوشی محسوس ہوتی تھی۔

گھر کی چار دیواری کے اندر بھی سکون، اطمینان اور بڑوں کی موجودگی کا لحاظ میرے بس کی بات نہ تھی۔ یہاں تک کہ بڑوں کی ڈانٹ ڈپٹ اور نقطہ چینی کو بھی برداشت نہ کر سکتا تھا اور اسی وجہ سے کئی بار پٹ بھی جاتا تھا لیکن اپنی ہٹ کو کبھی نہ

چھوڑتا تھا۔ میں متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں لیکن اپنے والدین کا سب سے بڑا اور بچپن کے ابتدائی زمانے میں واحد لڑکا تھا اس لئے میری ناز برداری طبعی تھی ۔اس کے علاوہ میرے ماموں مرحوم نے جو جموں میں ایک ممتاز ایڈوکیٹ تھے اور خاص عزت اور شہرت کے مالک تھے مگر اس وقت تک اولادِ نرینہ سے محروم تھے، مجھے میرے والدین سے مانگ لیا تھا، وہ صاحبِ ثروت تھے اور مجھ سے انہیں گہری محبت تھی ۔ بالخصوص اپنا لینے کے بعد جذبات محبت کے علاوہ وہ میرے متعلق زیادہ ذمہ داری محسوس کرنے لگے تھے ۔ دوسری نزدیکی رشتہ دار بھی میری دلداری اور دلجوئی میں پیچھے نہ تھے ۔ ان تمام رشتہ داروں کی طرف سے محبت و شفقت کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں شوخ و گستاخ اور ایک بگڑا ہوا لڑکا بن گیا۔ اگر والدین نے کسی بات پر گھور کر دیکھا تو میں ماموں کے گھر چلا گیا اور اگر وہاں ایسی صورت پیش آئی تو روٹھ کر والدین کے گھر لوٹ آیا۔ خورد سالی کے باوجود میں غیر ارادی طور پر یہ محسوس کرتا تھا کہ میرا یہ طرزِ عمل ہر حال میں مفید ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تھوڑے عرصے کے بعد دونوں جانب سے یہ کوشش شروع ہوگئی کہ مجھے ناراض نہ کیا جائے ۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ میرا مزاج ساتویں آسمان تک پہنچ گیا۔ اور اسکا اثر گھر سے باہر میری طفولیت کی زندگی پر بھی پڑا۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ تکلیف دینے والے اور شریر لڑکوں کی طرف زیادہ توجہ ہوتی ہے۔ کم زبان اور خاموش لڑکے عموماً نظر انداز کئے جاتے ہیں۔ گھر ہو یا باہر دونوں صورتوں میں یہی ہوتا ہے۔ اسلئے گھر والوں اور باہر والوں کی نظروں میں میری خاص قدر و منزلت ہوگئی۔

کھیل کود کا شوق:۔

بچپن میں مجھے کھیل کود کا بے حد شوق تھا۔ اس زمانے کا کوئی ایسا کھیل

نہ تھا جو میں نے نہ کھیلا ہو، کرکٹ، والی بال، اور کنکوے اڑانے سے مجھے خاص شغف تھا۔ کنکوے بازی کی وجہ سے تو کئی اور اُونچی اُونچی چھتوں سے گرا بھی۔ ایک دفعہ جب پانچویں جماعت کا طالب علم تھا، ایک دوست کے مکان پر کنکوے اڑاتے اڑاتے عالمِ محویت میں پیچھے ہٹتا گیا (اور کنکوے بازی میں عموماً ایسا ہوتا ہے) مکان کی چھت پر چار دیواری نہ تھی۔ اور اس کی اونچائی کم وبیش سولہ فٹ تھی۔ میں اچانک پیچھے کی جانب دھڑام سے زمین پر جا گرا۔ پانچ یوم کے بعد جب میں نے پہلی دفعہ آنکھیں کھولیں تو مجھے بتایا گیا کہ تم کو کنکوے اڑانے کی سزا ملی ہے۔ میں دو ماہ تک بستر میں پڑا رہا لیکن اس اِبتلا نے میرے حوصلے پست نہ کیے۔ کرکٹ سے مجھے بے حد دلچسپی تھی۔ اور سکول میں اس کھیل میں ممتاز تھا۔ پڑھائی سے بہت حد تک نفرت تھی۔ چھٹی جماعت تک یہی سلسلہ رہا لیکن بعد میں آہستہ آہستہ سنبھل گیا۔ شائد اسلئے کہ اس وقت میرے دل میں نفع ونقصان کا کچھ احساس پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کم از کم ایف اے تک کبھی پورے اِنہماک سے تعلیم کی طرف متوجہ نہ ہوا تھا۔ رشتہ دار اور اساتذہ دونوں مجھ سے مایوس تھے۔ سکول کی زندگی میں نہ میں خود کبھی آرام سے بیٹھا اور نہ طلبا اور مدرسین کو چین لینے دیا۔

زندگی کی پہلی جنگ:۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ کسی وجہ سے ہماری جماعت پنجم سے ٹھن گئی۔ شروع شروع میں تو اِکا دکا حملوں تک ہی معاملہ محدود رہا لیکن کچھ دنوں بعد دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو جنگ کا الٹی میٹم دیدیا اور آخر کار جنگ کیلئے چھٹی کا ایک دن مقرر ہو گیا۔ اپنی طرف سے اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا کہ اساتذہ کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ میدانِ جنگ بھی

متعین ہوگیا لیکن کون پارٹی کس جگہ پر مقیم ہوگی اس سلسلہ میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ پھر قرعہ اندازی سے یہ بات طے پاگئی لیکن بد قسمتی سے فنونِ حرب وضرت کے اعتبار سے ہمیں ایسی جگہ ملی جہاں سے صرف مدافعت ہی ہوسکتی تھی ۔میں اپنی فوج کا سپہ سالار تھا۔ وہ ایٹم بم، راکٹ اور ہوائی جہازوں کا زمانہ نہ تھا۔ لڑائی میں پرانے وقتوں کے ہتھیار اور پرانے وقتوں کے طور طریقے استعمال ہوتے تھے۔ ہماری استطاعت بھی کیا تھی، پھر بھی لاٹھیاں اور بلم فریقین نے فراہم کر لئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ دو دو چار چار خود ساختہ توپیں بھی اسلحہ خانہ میں موجود تھیں، بلاشبہ ان توپوں سے بہت بڑی جو تماشا گروں کے طوطی چلاتے ہیں اور ان توپوں میں صرف اسی قدر خوبی تھی کہ چلانے سے کافی آواز پیدا ہوجاتی تھی ۔آغاز جنگ انہیں توپوں سے ہوا۔ پہلے فریق مخالف نے ایک توپ داغی۔ اس کے جواب میں ہم نے، آخر لاٹھیاں، اور ہاتھا پائی پر نوبت آگئی۔ ہمارے حریف عمر اور طاقت میں ہم سے زیادہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بُری طرح سے پٹے اور میدان بلاشبہ مخالفوں کے ہاتھ رہا۔ دوسرے دن اسکول پہنچے تو ہیڈ ماسٹر صاحب کے تیور دیکھ کر ہمارے اوسان خطا ہوگئے اور ہم تاڑ گئے کہ کل کی رہی سہی کسر آج پوری ہو کر رہے گی ۔ چنانچہ یہی ہوا تمام طلبا کو سکول کے احاطہ میں جمع کیا گیا اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں پہلے تو اپنی فصاحت اور بلاغت کے جوہر دکھائے معلوم نہیں کہ واقعی ان کی تقریر فصیح اور بلیغ تھی یا نہیں لیکن چونکہ ابتدائی جماعتوں کے طلباء کی نظروں میں اساتذہ ہی قابل ترین انسان ہوتے ہیں اسلئے اس تقریر نے ہم پر کل کی توپوں سے بھی زیادہ اثر کیا۔ بعد میں جناب ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہمارے خلاف چارج شیٹ پڑھ کر سنایا۔ قصہ مختصر یہ کہ ہم چار "فوجی افسروں" کو بیس بیس بید پوری طاقت اور بے رحمی

سے رسید کئے گئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ سے نہ تو ہمیں صدمہ ہوا اور نہ پشیمانی بلکہ ہم فاتحانہ انداز میں سکول سے باہر نکلے، گھر والوں کا ڈر زیادہ تھا لیکن انہوں نے بھی نظروں نظروں میں دادِ شجاعت دے دی۔

مِشن اسکول سے اخراج :۔

پھر جب میں ساتویں جماعت میں تھا تو مدرسہ میں سرِ عام پیٹا گیا۔ واقعہ یوں ہے کہ ہمارے مشن سکون کا ایک انگریز مینجر تھا، بڑا شریف اور نیک مزاج، اسکا ایک لڑکا عموماً اس کے ہمراہ سکول آتا تھا اور قریباً میرا ہم عمر تھا۔ حاضری کے بعد ایک دن حسب معمول دُعا ہو رہی تھی، میں مینجر کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ "صاحبزادہ" بھی دعا میں منہمک تھا اور اس نے اپنی انگریزی ٹوپی اپنی آنکھوں کے سامنے جھکا رکھی تھی لیکن آخر تھا وہ بھی بچہ اور نوعمر۔ دُعا کے دوران میں وہ ایک ایک منٹ کے بعد ٹوپی کو ذرا سرکا کر اِدھر اُدھر جھانکتا، میری نظر ایسی حالت میں اس پر پڑی دو تین دفعہ تو میں نے بہ خیال خود اس کی اس مذموم حرکت کو نظر انداز کیا لیکن آخر میں نے اسکی ٹوپی زمین پر پٹک دی۔ مینجر صاحب آنکھیں بند کئے پوری رجوع قلب سے دعا میں مصروف تھے اور شائد یہ کہہ رہے تھے کہ "اے خدا آج کی روٹی ہمیں آج ہی دے اور ہمیں آزمائش میں نہ ڈال" کہ یک لخت انکی آنکھیں کھل گئیں اور انہوں نے اپنے آپ کو آزمائش میں پایا۔ ساتھ ہی طلبا نے زور سے قہقہہ لگایا۔ دعا اسکول کے وسیع میدان میں ہو رہی تھی، لڑکوں کو فوراً اپنی اپنی جگہ بیٹھ جانے کا حکم ہوا، مینجر صاحب اور ہیڈ ماسٹر کانفرنس کیلئے دفتر میں چلے گئے۔ واپس آئے تو مینجر صاحب کی شکل دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ کم از کم آج حضرت عیسیٰؑ کی اس تعلیم پر غالباً عمل نہ ہوگا کہ "اگر تمہارے ایک گال پر کوئی تھپڑ لگائے تو دوسرا بھی آگے

کردو" اور یہ عمل ہو بھی کس طرح سکتا تھا کیونکہ یہ اپنے گھر کا معاملہ تھا۔ میں تو گناہ گار تھا ہی لیکن میرے ساتھ ایک بے گناہ کو بھی مجرم قرار دیا گیا۔ منیجر صاحب نے بارہ بارہ بید پورے انتقام اور زور سے ہمیں لگائے اور ساتھ ہی اسکول سے اخراج کا حکم سنا دیا۔ اخراج کا معاملہ بعد میں ٹل گیا لیکن میں نے خود ہی یہ سکول چھوڑ دیا۔

طفلی کی گریز پائیاں :۔

بچے والدین کیلئے باعث راحت ہوتے ہیں۔ شائد اس لئے کہ وہ اُن کی خواہشوں، اُمنگوں اور دُعاؤں کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اور ان کے بڑھاپے کا سہارا، پھر نسلِ انسانی کا تسلسل بھی ان کی وجہ سے ہے، اسی لئے غالباً بچے کو "انسان کا باپ" کہا گیا ہے۔ اور مہرِ مادری اور شفقتِ پدری کے طبعی جذبات کے علاوہ قدرت نے والدین کو ان کی پرورش کا پورے طور پر کفیل اور ذمہ دار قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی ماں باپ کیلئے بچے اکثر وجہ تردد پریشانی اور موجبِ تکلیف بھی ہوتے ہیں۔ کم از کم میں اپنے معاملہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے حتی الوسیع گھر والوں کو کبھی اطمینان کا سانس نہیں لینے دیا۔ صبح ہوئی بستہ بغل میں دبائے بظاہر اسکول کا رُخ کرتا لیکن جونہی آنکھ بچی یہ جا وہ جا اور اسی عالم فرار میں ایک دو ساتھیوں کو لے کر کبھی دریا پر پہنچ گیا اور کبھی نہر پر جو شہر جموں سے دو میل کے فاصلہ پر ہے اور نہانے اور تیرنے کی مشق میں مصروف ہو گیا۔

کبھی خود غوطے کھاتا اور کبھی ساتھیوں کو غوطے دلاتا پھر جب بارہ بجے کے قریب جب سکول بند ہونے کا وقت ہوتا تو گھر میں آ دھمکتا اور اپنے طرز عمل اور رعب وداب سے گھر والوں پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا کہ پڑھائی سے ابھی ابھی فارغ ہو کر آیا ہوں لیکن چوری چھپائے کب چھپ سکتی ہے۔

یہ تو دن کا پروگرام ہوا کرتا تھا اور رات کو طے پاتا تھا لیکن رات کا پروگرام دوستوں کے ساتھ صبح ہی مقرر ہو جاتا تھا۔ گھر والے میرے راتوں کے مشاغل سے غافل نہ تھے اور اپنی طرف سے پوری نگرانی اور محاسبہ کرتے تھے۔ لیکن مجھے بھی کھانے سے فارغ ہو کر سرک جانے کی فکر دامن گیر ہو جاتی تھی اور کسی نہ کسی طریقے سے بیرونی دروازہ سے باہر پہنچ جاتا پھر رات کے دس گیارہ بجے تک ہم محلہ میں کھیل کود اور غوغا آرائی میں مصروف ہو جاتے اور اتنا شور مچاتے کہ اکثر محلے والے ہم سے تنگ آجاتے کیونکہ ہمارے ہنگاموں سے ان کی نیند حرام ہو جاتی تھی۔ بعض دیدہ دلیر محلّہ دار غصہ سے لال پیلے ہو کر اپنے گھروں سے نکلتے اور ہمارا تعاقب کرتے۔ لیکن عقل کے کچے یہ لوگ اتنا نہ سمجھتے کہ بھلا اندھیری رات میں اور پھر بچوں کے تعاقب میں کون کامیاب ہو سکتا ہے۔ بہر حال وہ ہمارا پیچھا کرتے اور آخر جی چھوڑ کر زور زور سے چلّاتا اور کوسنا شروع کر دیتے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ اعلان کر جاتے کہ صبح تم سے نپٹ لیا جائے گا لیکن وہ بچپن ہی کیا جو ایسی ہنگامی اور معمولی باتوں سے اپنے سلسلہ حیات میں تبدیلی کا تصور بھی ذہن میں لائے۔ اِدھر تو محلّہ داروں کے ناروا اور ہمارے نزدیک غیر معقول طرزِ عمل کا یہ حال تھا اُدھر گھر والوں کی طرف سے جو خبر لی جاتی تھی وہ بھی سوہانِ روح ہو جاتی تھی۔ محلّہ داروں کو تو بھلا ہم جل دے کر اِدھر اُدھر بھاگ جاتے تھے لیکن گھر والوں سے نہ فرار اور نہ اصرار و تکرار ہی ممکن ہو سکتا تھا۔ عام طور پر کھیل اور مسرت کے عینِ شباب اور عالمِ وارفتگی اور بے فکری میں کوئی چپکے سے کان پکڑ لیتا اور میں گردن موڑتا اور گھر کے کسی آدمی پر نظر پڑتی تو جان ہی نکل جاتی تھی۔

دو قسم کی فطرتیں :۔

انسان مقررہ کردہ نظام قدرت اور عطا کردہ فطرت کے تابع ہے۔

فطرت انسانی ایک تو وہ ہے جو قدرت کی جانب سے انسان کے حصہ میں آتی ہے، یہ فطرت صحیہ ہے، ایک اور فطرت ہے جو پیدائش کے بعد انسان کے ماحول، امتدادِ زمانہ، گردوپیش کے حالات اور خاص تاثرات ومحرکات کی پیداوار ہوتی ہے۔ یہ فطرتِ ثانیہ ہے۔ بچے بھی دونوں قسم کی فطرت کے حامل ہوتے ہیں ۔ بعض بچے ابتداً شوخ وشنگ اور تیز وتند ہوتے ہیں اور بعض خاموش اور شرمیلے۔ ایک اور گروہ ان لڑکوں کا ہے جن میں غالباً ابتداً تمام صفاتِ شریفہ اور عاداتِ پسندیدہ موجود ہوتی ہیں ۔ لیکن یا تو وہ حوادث زمانہ کی وجہ سے غیروں کے محتاج ہوکر اپنا اصلی جوہر زندگی اور فطرتِ صحیہ کھو بیٹھتے ہیں یا پھر حالات کے دباؤ، پرورش کرنے والوں کی ڈانٹ ڈپٹ اور امتیازی سلوک سے بچپن ہی میں فطرتِ ثانیہ کو قبول کر لیتے ہیں ۔ یا والدین اور رشتہ داروں کے ناروا برتاؤ، عیب جوئی، نکتہ چینی اور مار پیٹ کی وجہ سے ان کی خواہشوں اور امنگوں کا خون ہو جاتا ہے۔ ہر معمولی بات بھی ان کی مرضی کے خلاف ان پر ٹھونسی جاتی ہے ۔ جسمانی ، ذہنی وروحانی طور پر ابھارنے کے بجائے انکو دبایا جاتا ہے۔ شروع شروع میں ایسے لڑکے اپنی حیثیت اور بساط کے مطابق ان تمام پابندیوں اور ناروا سلوک کا مقابلہ کرتے ہیں لیکن آخر کار وہ مجبوری، جس کا نام صبر رکھا گیا ہے، کا تلخ اور کڑوا کسیلا پیالہ پینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بس یہیں سے ان کی فطرتِ ثانیہ کا حسرت انگیز اور افسوسناک آغاز ہو جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ ان کے دل کے اندر اپنے سرپرستوں اور نگرانوں کے خلاف نفرت وحقارت ، بغض وکینہ اور انتقام وفساد کے جذبات نشوونما پانا شروع کر دیتے ہیں۔ عمر کی رفتار کے ساتھ انکے ان جذبات میں اور بھی تلخی آجاتی ہے اور انکی فطرت میں ایک ناخوشگوار انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ انقلاب فطرت

ان کی طبائع میں بالکل ان لوگوں کی طرح پیدا ہوتا ہے جن میں جسمانی نقائص اور خامیاں ہوں، مثلاً لولے، لنگڑے، ایسے اشخاص میں نقائص جسمانی کے احساس سے احساسِ کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ قدرتی طور پر وہ اپنے عیوب کے خلاف مدافعانہ تدابیر سوچتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے کہ جب وہ تمام دنیا کو بخیال خود اپنا عیب جو اور نکتہ چیں سمجھنے لگتے ہیں۔ تمام دنیا کے مقابلہ پر مدافعت تو بے معنی ہوتی ہے۔ اسلئے وہ تمام لوگوں کو اپنا دشمن تصور کر لیتے ہیں اور اس لئے ہر شخص کیلئے ان کے دل میں جذبات انتقام وعداوت پیدا ہو جاتے ہیں۔ جس کا طبعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر کار ان کی فطرتِ ثانیہ بُری بن جاتی ہے۔ اور بدی، شر اور بد طینتی انکا شعار زندگی ہو جاتا ہے۔

اعتدال وتوازن کا طبعی طریق:-

وہ بچے جن کے جذبات اوائل عمر میں دبائے جاتے ہیں اور جن کو اُبھرنے اور پنپنے کی مہلت نہیں دی جاتی وہ جسمانی طور پر ناقص اور کمزور لوگوں کی طرح طبعاً اور فطرتاً خراب ہو جاتے ہیں اور بچپن کے دور کو عبور کرنے کے بعد بڑھاپے تک وہ پھر بد طینت، گمراہ اور منتقم مزاج رہتے ہیں۔ اسی طرح جو لڑکے شروع میں تیز طبیعت اور شوخ وشنگ اور بے پرواہ ہوں وہ عموماً بڑی عمر میں سنجیدہ، بردبار اور متحمل مزاج ہو جاتے ہیں۔ اس کی شائد یہ وجہ ہے کہ قدرت نے انسان کے خمیر میں تمام قسم کی خصلتیں ودیعت کی ہیں، مثلاً نرمی وسختی، تیزی طبع اور متانت، جلد بازی وبردباری، شرارت وسنجیدگی وغیرہ، یہ جواہر زندگی اور خصائل انسانی روز اول ہی سے بروئے کار آجاتے ہیں جو خصلت ابتدا میں زیادہ استعمال ہوئی وہ بعد میں کم استعمال ہوگی اور جو ابتدا میں کم صرف ہوئی وہ بڑے ہو کر زیادہ صرف ہوگی۔ قدرت ہر بات میں اعتدال اور توازن

کے حق میں ہے۔ اسلئے ان متضاد خصائل میں استعمال کی کمی یا زیادتی سے آخر کار انسان کی طبیعت میں اعتدال اور توازن قائم ہو جاتا ہے۔ یہاں میرا اشارہ ان خصائل کی طرف ہے جو کسب انسانی کی مرہون ہیں اور جن کو فطرتِ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ فطرتِ صحیحہ نا قابل تغیر ہے اور شروع سے لیکر آخر تک ایک ہی حالت میں رہے گی۔

میں چونکہ لڑکپن میں بلکہ ابتدائے شباب تک طبعاً تیز، لڑاکا اور آتش کا پرکالہ تھا اسلئے میرا شمار قدرتاً اس گروہ میں ہونا چاہئے جو بعد میں ان خصائل کی متضاد خاصیتوں کے حامل ہو جاتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ میرے بچپن اور میرے موجودہ مزاج میں زمین اور آسمان کا فرق ہے البتہ ضدی اب بھی ہوں۔

فطری جذبات اور گھر کا ماحول :۔

میں نے اپنے بچپن کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ شائد تصویر کا تاریک رُخ ہو۔ اگرچہ میں اسے تاریک کہنے کے لئے تیار نہیں۔ ہاں جو اسے ایسا سمجھے اسے ایسا سمجھنے کا حق ہے لیکن یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ میری تصویر کا روشن پہلو بچپن میں، عنفوان شباب میں اور اب بخیال خود نہیں بلکہ بہ یقین خود اگر قابل رشک نہیں تو کم از کم نا قابلِ رشک بھی نہیں رہا۔ اسی ضمن میں میرے بچپن کے دوست میرے ہمسائے اور میرے خویش واقارب اس دعوے کے جواز میں اب بھی میرے موید ہو سکتے ہیں۔

میں خود امیر نہ تھا لیکن ہر غریب اور مظلوم کو دیکھکر مجھے دلی صدمہ ہوتا تھا۔ کسی یتیم، ننگے بھوکے اور حاجت مند کی حالت کو میں برداشت نہ کر سکتا تھا۔ بغض وکینہ، بدلہ وانتقام، ہجو وغیبت کے جذبات سے میں بالکل مبرا تھا۔ ابتدائی عمر میں میری نشست وبرخاست محلہ کے ایسے لڑکوں سے تھی جن میں

سے پانچ فی صدی بھی لوئر پرائمری تک تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جن کی تربیت وعادات کا رجحان قابلِ تقلید اور باعثِ فخر نہ ہوسکتا تھا لیکن خدا نے مجھے عاداتِ قبیحہ سے محفوظ رکھا۔ "کھیل کود" دوسروں سے چھیڑ چھاڑ اور عام شرارتوں کے سوا جو مخرب اخلاق نہ ہوں، میں نے ہم جولیوں کی کوئی بری عادت اختیار نہیں کی۔ ہزلیات، بے ہودہ گوئی، جُوا شراب ودیگر منشیات، ان تمام عیوب سے مجھے ہمیشہ نفرت ہی اور آج تک ہے۔ البتہ دسویں جماعت میں سگریٹ نوشی کی عادت پڑگئی تھی لیکن زندگی کا کافی حصہ جیل میں گزرنے کے باعث اس عادت پر بھی پورا کنٹرول ہو گیا کیونکہ خداوندانِ جیل قیدیوں کی اس کمزوری سے ایک تو سیاسی فوائد حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور دوسرے اس کمزوری کی وجہ سے عام طور پر اکثر قیدیوں کو وقار اور تمکنت کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا پڑتا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ گھر کا ماحول اور میری تربیت بہت اچھی تھی۔ گھر کے تمام بالغ افراد شدت سے عبادت وریاضت، صوم وصلوٰۃ اور تہجد وتلاوت قرآن کریم کے پابند تھے۔ عابد والدین بچوں کو سختی سے ان فریضوں کا پابند کرتے ہیں۔ یہی حال میرا تھا، بچپن میں ہی مجھے نماز کی عادت پڑھ چکی تھی اور اسطرح آٹھ دس سال کی عمر میں روزہ کا بھی شدت سے پابند ہو گیا تھا۔

گورنمنٹ ھائی سکول اور کالج کا زمانہ:۔

مشن سکول سے بے آبرو ہو کر میں گورنمنٹ ہائی سکول جموں میں آٹھویں جماعت میں داخل ہو گیا۔ یہاں بھی مجھے پڑھائی سے جی چرانے والے اور اساتذہ سے دو دو ہاتھ کرنے والے شریر طالب علم مل گئے۔ لیکن پڑھائی میں عدمِ توجہ کے باوجود میں نے پہلے آٹھویں کا امتحان جو اس زمانہ میں

ریاستی یونیورسٹی کے زیر اہتمام ہوتا تھا اور پھر انٹرنس کا امتحان پاس کرلیا غالباً میرے تمام ساتھی ایک ایک کر کے فیل ہو گئے۔

کالج کے ابتدائی زمانہ ہی میں مجھے شطرنج کھیلنے کی عادت پڑ گئی۔ ادھر ایف۔اے میں ہمارے کالج میں حساب لازمی مضمون تھا۔ طبیعت پہلے ہی پڑھائی کی طرف مائل نہ تھی۔ ادھر رہی سہی کسر شطرنج نے پوری کردی۔ فسٹ ایئر کا امتحان تو جوں توں کر کے پاس کرلیا لیکن یونیورسٹی کے امتحان میں ریاضی سے بالکل نابلد ہونے کی وجہ سے صرف اسی پرچہ میں ناکام ہوا لیکن کرکٹ کی کشش سے پھر کالج میں داخل ہوگیا اور اب جو طبیعت کو سنبھالنے کی کوشش کی تو ایف۔ اے اور بی اے کے امتحانات وقت کے اندر اچھے نمبرات سے پاس کر لئے۔

میرا ارادہ پھر مزید تعلیم حاصل کرنے کے خلاف تھا لیکن گھر والے اور چند دوست اس بارے میں شدت سے مصر تھے، چنانچہ میں نے لاء کالج لاہور میں داخل ہونے کا ارادہ کرلیا ور داخلہ وغیرہ کے ابتدائی معاملات بھی طے پا گئے۔ لیکن داخلہ سے چند یوم قبل فٹ بال کھیلتے کھیلتے میرے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی اسلئے مجبوراً میں کالج میں داخل نہ ہو سکا۔

تیسرا باب

یَنگ مینز مسلم ایسوسی ایشن

۱۹۳۲ء کا ذکر ہے، میں ایف۔ اے میں پڑھتا تھا کہ ایک دن دو تین دوست میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم معطل شدہ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کو زندہ کرنا چاہتے ہیں لیکن تمہاری شمولیت ہم نے ضروری سمجھی ہے۔ انہوں نے میری شرکت شائد اسلئے ناگزیر سمجھی کہ ایک تو ان دنوں مسلم طلبا کی تعداد بہت کم تھی اور کالج میں گنتی کے جو چند مسلم طلباء تھے ان کا نصب العین بجا طور پر تحصیلِ علم تھا اور میری طبیعت بہت حد تک اسکے برعکس تھی۔ علاوہ ازیں رشتہ داروں کی وجہ سے میرا اثر ورسوخ بھی انکی نگاہ میں تھا۔ بہرحال میں نے بلا تامل اور بے سوچے سمجھے اُن سے شرکت کا وعدہ کرلیا۔ اسی سلسلہ میں دوسرے دن ہی ایک دوست قیس شروانی کے ہاں سات آٹھ احباب کا ایک خفیہ اجلاس ہوا۔ ایسوسی ایشن میرے ہوش سنبھالے سے پہلے کسی زمانے میں قائم ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں کسی وجہ سے عضوِ معطل ہو چکی تھی۔ جس زمانے میں یہ جماعت قائم ہوئی پریس اور پلیٹ فارم کی آزادی بالکل مفقود تھی۔ معلوم نہیں کہ حکومت نے کیوں اور کن حالات میں اسے اجرا کی اجازت دے دی تھی۔ ہمارے خفیہ اجلاس میں احباب نے جماعت میں عمل کا رنگ بھرنے اور تادم زندگی اس کے استحکام اور دوام کیلئے مصروف کار رہنے کی غرض سے حلف اٹھائے۔ میں نے بھی قرآن کریم پر حلف اٹھایا۔ مجھے اس وقت معلوم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ لیکن حقیقتاً اسی ساعت سے میری آئندہ سیاسی زندگی کا غیر

ارادی طور پر آغاز ہوگیا۔ میں ایسوسی ایشن کے کارکنوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اٹھتی جوانی، جذباتی طبیعت، تعلیم سے بے پرواہی، جو قومی کام کیلئے مزید معقول بہانہ یا کشش کا موجب تھی اور گھر والوں کی طرف سے عدمِ پرسش۔ مل ملا کر ان سب چیزوں نے مجھے ایسوسی ایشن کے کام پر مستعد کر دیا۔ چند دنوں میں ہم نے اس کے سابقہ "بے ضرر" اغراض و مقاصد پر نظرِ ثانی کی۔ حالات کے مطابق اور مسلمانوں کو ایسوسی ایشن کی طرف کھینچنے کیلئے چند ایسے مقاصد سامنے رکھے جو عوام کیلئے جاذبِ نگاہ تھے۔ مثلاً مسلمان ریاست کے تعلیمی، سماجی اور سیاسی حقوق کا تحفظ، انکی قومی اور مذہبی شیرازہ بندی۔ لیکن اس وقت کے حالات کے پیش نظر مسلمانوں کی قومی شیرازہ بندی ہر ضروری اور اہم کام کیلئے سب سے مقدم تھی کیونکہ اس کے بعد حکومت کے خلاف عوام کو ابھارنا کوئی بڑی بات نہ تھی اس لئے کہ کسی جگہ بھی حکومت کے حق میں معقول باتوں سے عوام کو متوجہ کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن اس کے خلاف اکسانا اور آمادہ فساد کر لینا بالکل آسان۔

ایسوسی ایشن کے وجود میں آنے سے قبل خاص کر جموں میں فرقہ بندی کی لعنت نے شدت سے جڑیں پکڑی ہوئی تھیں۔ شیعہ، سنی، اہل حدیث وغیرہ اکثر آپس میں مناظروں اور مجادلوں کی صورت میں گتھم گتھا رہتے تھے اور ایک دوسرے کو کافر کہہ کر ان میں سے غالباً کوئی بھی مسلمان نہیں رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے سوچا کہ اگر مسلمانوں کے یہی لیل و نہار رہے تھے تو یہ سارا آوے کا آوا صرف بگڑ ہی نہیں جائے گا بلکہ مسلمانوں کا سیاسی اور قومی مستقبل، جو ہماری نگاہ میں تھا، کبھی پروان نہ چڑھ سکے گا۔ اس زمانے میں مسلمان کو انگریز کی یہ خاص دین تھی کہ اس کی وحدت فکر و عمل صوبائی عصبیت، برادری، سسٹم اور مذہبی فرقہ

بندی کی چکی میں پس پس کر ختم ہو رہی تھی اور ان تین حربوں میں سے کسی ایک کا بھی موثر اور کارگر نہ ہونا از قبیل محالات تھا اور مسلمان کی مذہبی توہین! ریاستی مسلمان آخر ہندوستانی مسلمان کا بھائی اور ہمسایہ اور شائد دوہرا تہرا اغلام ہونے کی وجہ سے اس بات میں کب پیچھے رہنے والا تھا۔ مسلم ایسوسی ایشن کا مقصد اور سیاسی منصوبہ ایسے ماحول میں کسی طرح بھی پرورش نہیں پا سکتا تھا۔ اسلئے سب سے پہلے فتنہ و فساد کے اس قوی ہیکل بت کو پیوند خاک کرنے کیلئے ہم نے پختہ عہد کر لیا۔ لیکن اس مہم کا آغاز ہم نے ہنگامہ آرائی مقابلہ یا کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ سے نہیں کیا بلکہ اپنے خاموش اور مسلسل عمل سے، اس ضمن میں اپنی طرف سے میں آج بھی یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ماسوائے ایک دو دوستوں کے آج تک کوئی بھی نہیں جانتا کہ میری قومیت (جسے اسلامی لغت میں لعنت کہنا چاہئے) کیا ہے اور میں اپنے اکثر قریبی دوستوں اور سیاسی کارکنوں کے متعلق نہیں جانتا کہ وہ کس عقیدہ اور فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں، چنانچہ ہم نے سیاسی کام کی ابتدا کی مثال کے طور پر جموں کے مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ سنی علماء کا یہ فتویٰ تھا کہ اگر مسلمان عشرہ اور ذوالجناح کے جلوسوں اور محرم کے جلوسوں میں بھولے سے بھی شمولیت کریں گے تو ان کی عورتوں پر طلاق ہو جائیگی لیکن دو تین سال کی ہماری لگاتار کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ میں خود متذکرہ صدر جلوسوں اور جلسوں میں ہر سال التزام کے ساتھ تقریر کیا کرتا تھا اور اب سابقہ حالت کے برعکس حالت یہ تھی کہ اسلامی اتحاد اور سیاسی یگانگت کے مناظر سے جموں کے ہندوؤں کی آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں اور انکے دل بیٹھ بیٹھ رہے تھے۔

شدھی کے خطرات:۔

ان ایام میں ہندوستان میں شدھی کی تحریک زوروں پر تھی۔ اس سے

نپٹنے کیلئے جمیعت العلمائے ہند اور مولانا غلام بھیک نیرنگ کی انجمن تبلیغ الاسلام میدان میں اتر چکی تھیں۔ تحریک شدھی کے اثرات سے ریاست کشمیر بھی محفوظ نہ رہ سکی۔ مسلم ایسوسی ایشن نے اس تحریک کے نتائج وعواقب پر نگاہ ڈالی تو سب متفق ہوگئے کہ اگر مسلمان اس سیلاب کو روک نہ سکے تو ریاست کے ہزاروں مسلمانوں کا کفر شرک کی تاریکی میں گُم ہوجانا ممکن ہوجائے گا۔ یاد رہے کہ ریاست کے بعض پہاڑی علاقوں میں اس وقت ایک اجنبی کیلئے ہندو اور مسلمان میں تمیز کرنا بے حد مشکل بات تھی۔ ان مسلمانوں کی رسوم، وضع قطع اور لباس حتیٰ کہ عام عادات بھی ہندوانہ تھیں۔ گھر گھر میں مورتیاں تھیں جن کو یہ مسلمان پُوجتے اور ان سے مُرادیں مانگتے تھے۔ ان حالات میں ہماری تشویش حق بجانب تھی۔ ایسوسی ایشن کا دائرہ عمل ان ایام میں زیادہ سے زیادہ جموں کے دو تین اضلاع تک محدود تھا۔ لیکن موجبِ اطمینان یہ بات ہوئی کہ مسلمانانِ جموں نے کارکنان ایسوسی ایشن سے پورا تعاون کیا اور اس طرح ہمارے حوصلے بڑھ گئے۔ مولانا غلام بھیک نیرنگ اور مولانا احمد سعید نے ہمارے تقاضوں سے مجبور ہوکر اور معاملہ کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی طرف سے ایک ایک مبلغ ہمیں بھیج دیا۔ یہ مبلغ مناسب اور ضروری علاقوں میں تقریباً ڈیڑھ سال تک کام کرتے رہے۔ اس تبلیغی دوڑ دھوپ سے جس میں ہم نے بھی اپنی بساط کے مطابق کافی حصہ لیا، نتائج خاطر خواہ برآمد ہوئے، نہ صرف شدھی کا خدشہ رفع ہوگیا بلکہ نام کے اکثر مسلمانوں کی اصلاح ہوگئی۔ ایسوسی ایشن کا یہ اہم کارنامہ ہماری مقبولیت کا پہلا سنگ میل تھا۔

خدمتِ عام کے ابتدائی مرحلے :۔

ایسوسی ایشن نے تعمیرِ جنازہ گاہ کا کام بھی اپنے ذمہ لے لیا۔ اس سے

پہلے اس مقصد کیلئے کئی بار چندے ہوئے اور کئی بار چندہ فراہم کرنے والوں کا محاسبہ ہوا، لیکن جنازہ گاہ تعمیر نہ ہو سکی۔ آج دنیا بدل چکی ہے۔ آزادی اور روشنی کے زمانے میں تعمیر جنازہ گاہ جیسی حقیر اور بے حقیقت باتوں کا ذکر شائد موضوع مزاح ہو۔ لیکن ہمارے حالات ایسے تھے کہ اس وقت یہ جدو جہد بھی بساغنیمت تھی۔ ریاست کے لوگ بالخصوص مسلمان اقتصادی اور سماجی لحاظ سے خود ہندوستان کے لوگوں سے بھی بہت پیچھے تھے۔ نہ پریس اور پلیٹ فارم کی آزادی تھی اور نہ جنبشِ لب کی اجازت، لہٰذا ایسے زمانے میں کسی جماعت کا میدان عمل میں آجانا اور چھوٹے چھوٹے کام کا سرانجام دینا بھی بڑی بات تھی۔ الغرض میں نے صرف دو تین سرکاری ملازموں کی مدد سے چندہ فراہم کر کے ایک ہفتہ کے اندر جنازہ گاہ کی تعمیر مکمل کروادی۔ یہ بھی ایک مخلصانہ اور دیانت دارانہ کارکردگی سمجھی گئی۔ اسکے ساتھ ہی یہ خیال دامن گیر ہوا کہ مسلم لاوارث لاشوں کی تجہیز و تکفین حکومت کی طرف سے غیر تسلی بخش ہوتی ہے۔ چنانچہ کافی غور کے بعد اس معاملے کو بھی ایسوی ایشن نے اپنالیا۔ لیکن یہ کام بعد میں ہمارے لئے سوہانِ روح ثابت ہوا۔ شروع شروع میں تو رضا کاروں کی مدد سے یہ کام ہوتا رہا۔ لیکن بعد میں تمام کے تمام ایک ایک کر کے دامن چھڑا گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عام طور پر لاشیں ہسپتال سے ملتی تھیں اور ان میں نوے فی صد وہ ہوتی تھیں جن کا پوسٹ مارٹم ہوا کرتا تھا۔ چونکہ یہ کام ایسوی ایشن نے میرے اور دو چار سرکاری ملازم دوستوں کے اصرار پر اپنے ہاتھ میں لیا تھا، اس لئے بادل نخواستہ اس کی انجام دہی کا بار ہمارے کندھوں پر پڑ گیا۔ ویسے بھی یہ احساس غالب تھا کہ ایک کام کو ہاتھ میں لے کر یوں ہی چھوڑ دینا ٹھیک نہیں۔ چنانچہ دو چار مرتبہ مجھے بھی ایسی لاشوں کو شفا خانے سے اٹھانا پڑا۔

اس سلسلہ میں مجھے ایک واقعہ اس وقت تک اچھی طرح یاد ہے۔ جون کا مہینہ تھا۔ گرمی اپنے شباب پر تھی۔ درجہ حرارت ایک سو سولہ ہوگا۔ چار بجے شام کا وقت تھا کہ ایک پولیس کانسٹبل میرے پاس پروانہ لے کر آیا کہ ہسپتال سے ایک لاوارث نعش منگوالی جائے۔ میں ان دنوں بی اے پاس کر چکا تھا اور مسلم ایسوسی ایشن کا صدر تھا۔ میں نے آدمیوں کی تلاش کرائی لیکن سوائے ان دوستوں کے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے مجھے اور کوئی شخص نظر نہ آیا۔ قہر درویش برجان درویش۔ ہم خود ہسپتال گئے لیکن صحن میں داخل ہوتے ہی ہوا کے پہلے ہی بدبودار جھونکے نے ہمارا سر چکرادیا۔

نعش کے قریب جانا آسان نہ تھا۔ نعش عورت کی تھی اور چار دن قبل دریا سے برآمد ہوئی تھی۔ "نعش گھر" کے نگران نے نعش ہمارے سپرد کردی۔ ہم حیران و ششدر تھے لیکن پانچ دس منٹ کے تامل کے بعد ہم نے چارپائی کندھوں پر اٹھالی۔ یہ امر واقع ہے کہ راستہ میں جس طرف سے ہم گزرتے، لوگ ناک اور منہ بند کر لیتے۔ ادھر اپنی یہ کیفیت تھی کہ کچھ شرم محسوس ہو رہی تھی اور کچھ احساسِ ذلت و پستی۔ یہ خیال ہوتا تھا کہ کام اچھا اور ثواب کا ہے، اس میں شرم و حجاب کیوں اور کس لئے لیکن شرم اور پستی کے احساسات آخر الذکر خیال پر غالب معلوم ہوتے تھے۔ کافی رات گئے ہم قبرستان سے واپس ہوئے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم پاگل ہو گئے ہیں، میں اسی رات بدبو کی وجہ سے بیمار ہو گیا اور کئی روز تک بستر میں رہا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ عورت مسلمان نہ تھی بلکہ اچھوت، اس خبر نے ہمیں اور بھی مایوس کیا۔ اس لئے نہیں کہ ایک اچھوت کیلئے ہم نے تکلیف اٹھائی بلکہ اس لئے کہ تجہیز و تکفین کی زحمت بلاوجہ ہوئی۔

میری پرورش ایک مختلف ماحول میں ہوئی تھی۔ میں خوش پوش اور لطیف

مزاج تھا اور کبھی احساسِ برتری کی لعنت بھی دل ودماغ پر شاید بہ تقاضائے عمر مسلط ہوجاتی تھی۔ بعض اوقات سعیِ بسیار اور کوششِ پیہم کے باوجود انسان کے لئے اچھے نتائج کی توقع مشکل ہوجاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ عام اور معمولی واقعات سے خوشگوار اور خاطر خواہ تغیرات رونما ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح ایسوی ایشن کے عام کام اور لاوارث لاشوں کی ذمہ داری بالخصوص متذکرہ صدر ایک واقعہ نے میری سابقہ پست اور حقیر دنیا کو بہت حد تک تبدیل کردیا۔ میرے خیالات کی پرواز صحیح انسانی سطح پر آگئی۔ میری طبیعت، مزاج اور دماغی کیفیات میں نمایاں تغیر پیدا ہوگیا اور احساسِ برتری اور پندار کے تمام خم ایک ایک کرکے اوندھے ہوگئے۔ میرے اندر نامساعد، ناخوشگوار اور طبیعت کے مخالف حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا ہوگئی اور سچ تو یہ ہے کہ طبیعت کے اسی انقلاب نے آئندہ سیاسی زندگی میں بالخصوص عوام کے ساتھ برتاؤ اور اسیری کے سلسلہ میں مجھے بے حد مدد دی۔

ایسوسی ایشن کا پہلا سالانہ اجلاس

۱۹۲۴ء میں ایسوسی ایشن کے قیام کے قریباً ڈیڑھ سال بعد سالانہ اِجلاس کی تجویز قرار پائی اوراس کی تیاریاں فوراً شروع ہوگئیں لیکن جلسہ گاہ کیلئے باوجود انتہائی تگ ودو اور جدوجہد کے کوئی موزوں جگہ میسر نہ آسکی۔ مسلمانوں کی پست سیاسی اور قومی حالت کا اندازہ اسی ایک معمولی واقعہ سے ہوسکتا ہے اور ظاہر ہے کہ جس قوم کے سینہ میں امیدیں اور آرزوئیں ٹھنڈی پڑ گئی ہوں، اس کا نہ حال ہے نہ مستقبل، مسلمانان جموں کی قومی حرماں نصیبی اور درماندگی کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی تعلیمی سالانہ اجتماعوں کی ضرورت ہوتی تو جلسہ گاہ کے لئے حکومت کا دستِ نگر ہونا پڑتا۔ پنڈال کی آرائش اور زیبائش کا تمام سامان حکومت مہیا کرتی۔ نتیجہ ظاہر ہے ایسے جلسوں میں حکومت، کی قصیدہ خوانی اور خوشامد کی انتہا ہوجاتی اسی لئے واعظ اور مقرر ایسے تلاش کئے جاتے جن کا مبلغ علم ’’پکی روٹی‘‘ کے قصوں سے زیادہ نہ ہوتا۔

نوجوانوں کا عزم :۔

چنانچہ لوگوں کی ذہنی تربیت بھی اسی ماحول میں ہوچکی تھی۔ بہر کیف ایسوسی ایشن نے اِدھر سالانہ جلسہ کا اعلان کرکے ہندوستان کے چوٹی کے واعظوں اور مقرروں کا اعلان کردیا جس سے حکومت کے ایوانوں میں سنسنی اور مسلمانانِ جموں میں ایک دلچسپی پیدا ہوگئی لیکن اُدھر جلسہ میں چند یوم باقی تھے مگر پنڈال کا کوئی انتظام نہ تھا اور نہ اس کی توقع تھی۔ آخرکار ایک قطعہ زمین ذہن میں آیا لیکن یہ بے حد ناہموار تھا اور ملبے اور کوڑے کرکٹ کی بہتات سے ایک

اچھا خاصا ٹیلہ بن چکا تھا۔ زمانے بھر کی گندگی اس میں موجود تھی اور عام حالات میں اس کی صفائی اور درستی مہینوں کا کام تھا لیکن ہم نے تہیہ کرلیا کہ جلسہ یہیں ہوگا۔ عزم مضبوط ہو تو کوہ کنی بھی کوئی بڑی بات نہیں۔ ارادہ پکا ہو تو بڑے بڑے مشکل کام آسان ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم چند کارکن خود ہی مصروف کار ہو گئے۔ دوسرے دن ہماری اس مہم نے بے شمار بچوں کو موقع پر کھینچ لیا اور وہ بھی ازراہِ تفنن یا سکول سے غیر حاضری کا معقول عذر سمجھ کر ہمارے کام میں شامل ہو گئے اور اس طرح کام میں ہماہمی کی وجہ سے شہر کے اکثر مسلمان بھی دوسرے دن خود موقع پر مصروف کار ہو گئے۔ ان میں اسی اسی سال کے بوڑھے بھی تھے اور ایسے بھی جن کے پاؤں دولت اور غرور کے نشہ میں زمین پر نہ پڑتے تھے بلکہ ایسے سیادہ دل اور بے حس لوگ بھی جو اپنے خود غرضانہ روئے کی وجہ سے مسلمانوں کی نظروں میں کھٹکتے تھے۔ الغرض پانچ دن کی مدت میں جلسہ گاہ ٹھیک ٹھاک ہو گئی اور چھٹے دن آرائش و زیبائش کے علاوہ پنڈال بجلی کے قمقموں سے جگمگانے لگا۔ ساتویں دن جلسہ شروع ہوا۔ مولوی عبدالحق صاحب ودیارتھی کی مذہبی اور تبلیغی تقریر اور مولانا غلام بھیک نیرنگ کی ایک قومی نظم مولانا کے اپنے مخصوص انداز میں رات کے سکوت مکمل میں دونوں اپنی اپنی جگہ کام کر گئیں۔ مسلمانوں کے سینوں میں ایک غیر مرئی جوش و ہیجان پیدا ہو گیا۔ ان کی مدتوں سے بے حس رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ جلسہ کے اختتام پر ایسوسی ایشن کی پوزیشن کو چار چاند لگ گئے اور کارکنان ایسوسی ایشن عوام کی توجہ کا مرکز اور ان کے سیاسی مستقبل کی امید بن گئے۔

پانچوں باب

تعلیم، شادی، سیاسی کام

مسلمانانِ جموں کی بیداری :-

ایسوی ایشن نے اپنے سالانہ اجلاسوں کے ذریعہ مسلمانانِ جموں کے دِلوں میں تھوڑا بہت قومی اور سیاسی شعور پیدا کیا۔ وہ اب کم از کم اپنے سیاسی نفع ونقصان میں تمیز کرنے کے اہل ہو گئے اور حکومت کا بے جا اور ناجائز خوف اور رعب بھی قدرے کم ہو گیا۔ ہمارا علاج وقت پر کام آ گیا ورنہ ان کی حالت اب اس لاعلاج مریض کی سی ہو گئی تھی جس کی امید زیست کا سہارا وہ آخری انجکشن ہو، جس سے اس کے خون میں خفیف سی حرکت پیدا ہو جائے۔ قوموں کے امراض کا افراد کے امراض سے کیا مقابلہ۔ قوموں کے امراض تو حکیموں اور ڈاکٹروں کے بس کا روگ نہیں ہوتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسوی ایشن کے چند محتاط اور نرم نرم انجکشن کام کر گئے اور وہ انجکشن خون، دل اور خون جگر کے انجکشن تھے۔ جنہوں نے مریض کی حالت میں غیر محسوس اور نا معلوم طریقہ سے آہستہ آہستہ اپنا اثر کیا۔ عام مریض قوموں کی طرح ریاست کی مریض مسلم قوم کی حالت نہ تو بہتر ہو سکتی تھی اور نہ طبعی نقطہ نگاہ سے اس کی طبیعت میں فوری تغیر موجبِ اصلاح ہو سکتا تھا۔ بہر حال جموں کے مردہ دل مسلمانوں نے ایک کروٹ ضرور لی اور اس کروٹ کے ساتھ زندگی کا ایک لمبا سانس بھی۔ آگے چل کر ایسوی ایشن کی مخالفت رنگ لائی۔ جموں کے دم توڑتے ہوئے مسلمانوں نے نعرہ حق بلند کیا۔ شاید حق اور مظلومیت کی آواز حکومت کے

استبداد اور شورش پیہم میں دب کر رہ جاتی، لیکن کشمیر کے زندہ دل اور مجاہد مسلمان نے اس نعرہ حق پر لبیک کہا اور اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ کشمیر کے بتیس لاکھ مسلمان ایک خدا، ایک قرآن اور ایک ہادی برحق ﷺ کے پیرو ہونے کی وجہ سے ایک ہیں۔ چنانچہ حق و باطل کے درمیان جنگ کی ابتدا اِدھر بانہو کی پہاڑیوں سے ہوئی تو اُدھر ہری پربت کے دامن سے حمایت کا غلغلہ بلند ہوا۔

ایسوسی ایشن نے اپنا دائرہ عمل اور حلقہ کار وقت کے ساتھ ساتھ وسیع کرنا شروع کر دیا۔ میرے ابتدائی ساتھی ایک ایک کر کے سب جی چھوڑ چکے تھے۔ البتہ چند نئے نوجوان اور زندہ دل کارکن ایسے میسر آ گئے جنہوں نے ایسوسی ایشن میں عمل کا کافی تیز رنگ بھر دیا۔ چنانچہ تحریک حریت کی ابتدا سے قبل صوبہ جموں تقریباً تمام کا تمام ایسوسی ایشن کے جھنڈے تلے آ چکا تھا بالخصوص پونچھ کا بہادر، غیور اور بے باک مسلمان بھی ایسوسی ایشن سے الحاق کی وجہ سے اپنی عظمت رفتہ کی بحالی، اپنی مظلومیت کے مداوا اور حکومت کشمیر کی انسانیت سوز پالیسی کے تدارک کیلئے میدان عمل میں آ چکا تھا۔ صوبہ جموں میں تحریک کا پس منظر تیار تھا لیکن کشمیر کا مسلمان ابھی بالکل خاموش تھا۔ یہ خاموشی ایک سخت اور شدید طوفان کا پیش خیمہ تھی اور جب یہ طوفان شروع ہوا تو پھر اعدائے اسلام کے سامنے قیامت کے ہولناک اور عبرت ناک مناظر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ خدا جس قوم کو آمادہ عمل کر دے اس کو بڑے بڑے فرعون مزاج حاکموں کی طاقت اور ساز و سامان بھی مرعوب نہیں کر سکتے۔ قومی کاموں میں پورے اِنہماک اور تعلیم سے مکمل عدم توجہ کے باوجود میں نے ۱۹۲۵ء میں بی۔اے۔ کا امتحان پاس کر لیا۔ دسویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد جس طرح میرا ارادہ تعلیم حاصل نہ کرنے کا تھا اسی طرح اب بھی میں نے آئندہ تعلیم کے خلاف قطعی فیصلہ کر لیا۔

ابتدائی ملازمتیں :-

بی۔اے۔کے امتحان کے بعد میری شادی ہوگئی۔ چند دن گزرے تو میں عارضی طور پر لامبرکا کانفیڈینشل کلرک مقرر ہوکر سرینگر چلا گیا۔ مجھے ملازمت سے طبعاً نفرت تھی مگر چند دوستوں کے اِصرار سے مجبور ہوگیا لیکن کسی بات پر دفتر میں سیکرٹری اور بعد میں وزیر متعلقہ سے میری ان بن ہوگئی اور میں نے نوکری ترک کردی۔

بی۔اے۔کا نتیجہ میں نے سرینگر میں سنا تھا جموں واپس آ کر پھر ایسوسی ایشن کے کام میں مصروف ہوگیا، لیکن اب بیوی کا بوجھ بھی سر پر آ پڑا تھا۔ اس لئے میں اسلامیہ سکول میں ملازم ہوگیا۔ چھ سات ماہ کی ملازمت کے بعد اسکول کی انتظامیہ اور میرے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا۔ تحریری جواب طلبی اور جواب دہی پر نوبت یہ آئی کہ اراکین کے خلاف میں نے شدید الزام لگائے اور آخر مستعفی ہوگیا۔ گویہ ملازمت دفع الوقتی کیلئے تھی لیکن اس کے چھوٹ جانے کے بعد میں عالمِ بیکاری میں کچھ پریشان سا رہنے لگا۔ ایک دن میں بہت رنجیدہ خاطر اور ملول تھا۔ تمام دن یہی کیفیت رہی، شام کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد یونہی چارپائی پر ستانے کیلئے لیٹ گیا۔ اپنے خیالوں میں گم تھا میری آنکھ لگ گئی۔ عالمِ نیم خوابی میں مجھے ایسے محسوس ہوا کہ کسی بزرگ نے میرا سر پکڑ کر جھنجھوڑا ہے اور کہا کہ تم فوراً لاء کالج میں داخل ہوجاؤ۔ اس کے معاً بعد میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اس واقعہ کو مشیتِ ایزدی سمجھا اور اس کے مطابق اسی وقت مصمم ارادہ کرلیا۔ چنانچہ ایک ماہ کے بعد میں لاہور لاء کالج میں داخل ہوگیا اور ایسوسی ایشن کا کام ایک دوست کے سپرد کردیا۔

ریاستی مسلمانوں کے حق میں پہلی آواز:۔

چند دنوں کے بعد سرایلبین بینرجی جو ریاست میں وزیر خارجہ وسیاسیہ کی حیثیت سے آئے تھے اور جن کی شہرت کے بہت چرچے تھے نے ایک بیان کے ذریعہ مسلمانوں کے بارے میں حکومت کی اندرونی پالیسی کو بالکل بے نقاب کر دیا۔ اس بیان میں یہ بات صاف الفاظ میں واضح کردی کہ ریاست کے مسلمانوں کے ساتھ حکومت کی جانب سے لاٹھی سے ہانکے جانے والے جانوروں سے بدتر سلوک روا رکھا گیا ہے۔ یہ بیان سرایلبین نے مستعفی ہونے کے فوراً بعد دیا۔ حکومت کشمیر اس بیان سے سٹ پٹا اٹھی ۔ اس کا ضمیر مجرم تھا اور ساتھ ہی بینرجی کی اس حق گوئی کی وجہ سے دنیا میں ذِلت اور رسوائی کا بھی ڈر تھا۔ چنانچہ حکومت کشمیر کے عام حکومتوں کی طرح بہی خواہانِ سرکار کا ایک اجلاس ایک مسلمان ریاستی وزیر کے مکان پر بلوایا۔ اس اجلاس میں ایسوی ایشن کے ایک پر جوش اور درد دِل رکھنے والے معمر مسلمان شیخ یعقوب علی کو بھی مدعو کیا۔ ریاست کے "نمک حلال" وزیر اور ٹوڈی منش مسلمانوں نے ایک ریزولیوشن پاس کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ ریاست میں مسلمانوں کو کوئی قومی، مذہبی، سیاسی تکلیف یا شکایت نہیں، بینرجی نے محض ذاتی رنجشوں اور اختلاف کی وجہ سے گمراہ کن اور جھوٹا بیان شائع کیا ہے۔ جسکی اسلامیانِ ریاست مذمت کرتے ہیں ۔ ہمارے بوڑھے دوست نے اس ریزولیوشن کی پرزور مخالفت کی لیکن نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ چنانچہ یہ بزرگ وہاں سے بطورِ احتجاج لوٹ آئے اور شہر میں آکر اس واقعہ سے مسلمانوں کو انفرادی طور پر آگاہ کیا۔

مسلمان اب نیک و بد میں تمیز کرنے کے اہل ہو چکے تھے ۔ چند نوجوانوں نے جن میں وہی دو چار ملازم سرکار پیش پیش تھے ایک عام اجلاس

مسجد میں منعقد کیا۔ بینرجی کے بیان کی تائید کی اور حکومت کے پٹھوؤں کی مذمت کی۔ قد آدم اشتہارات کے ذریعے اس کاروائی کی نشر واشاعت کرائی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو سرکار پرست مسلمانوں کا وہ ریزولیوشن دن کی روشنی نہ دیکھ سکا اور دوسری طرف حکومت کشمیر بھی اپنی جگہ لرزہ براندام ہوگئی۔ حکومت کشمیر جب اپنی پوری طاقت اور بڑے رعب کے باوجود بینرجی کے بیان کی تردید کرانے میں ناکام رہی تو اس نے اشک شوئی کیلئے دو مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے لندن بھیج دیا۔ لیکن اب مسلمان ایک خرانٹ جوہری کی طرح کھوٹے اور کھرے میں تمیز کر سکتے تھے۔ حکومت کی اس "وسعتِ قلبی" سے وہ زیادہ چوکنے ہوگئے اور سمجھ گئے یہ حکمرانوں کی ساحری ہے۔ ادھر حکومت نے اپنی طرف سے بینرجی کے بیان کا یہ توڑ سوچا تھا۔ ادھر مسلمانوں نے یہ محسوس کرلیا کہ ذرا سی قومی سطح کی حرکت اور اجتماعی طاقت ان کے روشن مستقبل کی راہیں کھول سکتی ہے۔ ایسوسی ایشن نے نامساعد اور حوصلہ شکن حالات میں قومی سربلندی کا جو خاکہ تیار کیا تھا ایلبین بینرجی کے بیان نے اس کے نقش ونگار اور آرائش وزیبائش کے کافی سامان مہیا کردیئے۔

بایں ہمہ ریاست کا مسلمان بحیثیت مجموعی ابھی بیداری خودشناسی اور سیاسی ذمہ داری کے اس مقام بلند تک نہ پہنچا تھا جہاں کھڑے ہوکر وہ ایک نظر میں اپنے مستقبل کے متعلق سب کچھ دیکھ سکتا۔ غلامی قوائے ذہنی کو بے حس کردیتی ہے۔ اس کے خلاف آمادہ فساد وپیکر ہونا وقت چاہتا ہے لہٰذا سب کچھ ہونے کے باوجود سر ایلبین بینرجی کا یہ بیان مدتوں کی خوابیدہ قوم کیلئے صرف ایک چبھن سی ثابت ہوا جس نے ہنگامی طور پر اس کے دل میں کسک پیدا کردی اور اس کسک کی وجہ سے اس کی آنکھیں اچانک کھلیں لیکن پھر چند روز کی غوغہ

آرائی اور ہنگامہ خیزی کے بعد وہ بینرجی کے قصہ کو یک سر بھول کر خواب خرگوش میں کھو گئے۔ فالج کا دیرینہ بیمار اگر سوئی کے درد کو محسوس کرے تو طبیب فوراً فتویٰ صادر کر دیتا ہے کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔ ہم نے ان مسلمانوں کی اس ہنگامی کسک سے یہ قطعی اندازہ لگالیا کہ حالات امید افزا ہیں صرف مہمیز کی ضرورت ہے۔

عہدہ کا لالچ:۔

بینرجی کے ہنگامہ خیز بیان کے بعد میں جموں لوٹا تو اس وقت مسٹر واٹل مہاراجہ کشمیر کے وزیر خاص اور حکومت کے سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ میرے ماموں مرحوم کے ان سے مراسم تھے وہ مجھے اپنے ہمراہ مسٹر واٹل کے پاس لے گئے۔ رسمی سلام ومزاج پرسی کے بعد میرے ماموں نے اچانک مسٹر واٹل سے استدعا کی کہ مجھے جج کا عہدہ عطا کیا جائے۔ میں یہ بات سن کر ششدر رہ گیا۔ مسٹر واٹل نے بھی بلا تامل فوراً وعدہ کرلیا اور ساتھ ہی کہا کہ آج ہی میری تعیناتی کے احکام صادر ہو جائیں گے۔ میں دو تین منٹ تو خاموش رہا جج کے عہدہ کا لالچ تو تھا اور میں اپنے ماموں کا بے حد احترام بھی کرتا تھا لیکن میں نے مسٹر واٹل کو مخاطب کر کے کہا کہ میں آپ کی اس مہربانی کے لئے شکر گزار ہوں لیکن میں سات آٹھ ماہ کے بعد ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کرسکوں گا قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ہی مجھے یہ عہدہ مل سکے گا۔ اسلئے آپ یہی مشورہ دیں کہ میں پہلے یہ ڈگری حاصل کرلوں، اسے میں نے ایسے انداز اور لہجے میں مخاطب کیا کہ وہ مجھ سے متفق ہو گیا اور ہم جب گھر پہنچے تو میری وہ دُرگت بنی کہ آج تک یاد ہے۔

مئی ۱۹۳۰ء میں سالانہ امتحان شروع ہوا قیام لاہور کے دوران میں معمولاً داتا گنج بخشؒ کے مزار پر جمعرات کو فاتحہ خوانی کے لئے جایا کرتا تھا۔

امتحان کے دوران میں روزانہ جاتا رہا۔ ایل۔ ایل۔ بی کے آخری پرچہ کے دن میں داتا صاحب کے مزار پر حسب معمول پہنچا۔ مقبرہ کے ساتھ ہی کھڑے ہوکر فاتحہ پڑھی اور اس کے بعد دعا میں مصروف ہوگیا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ عالمِ خواب میں ہوں۔ اُس حالت میں محسوس ہوا کہ کسی غیر مرئی طاقت نے مجھے آہستگی سے یہ کہا کہ تمہارا اِس سال امتحان میں کامیاب ہونا ٹھیک نہیں۔ اس واقعہ کے معا بعد میری آنکھ کھل گئی۔ چند لمحات کے لئے متفکر اور مایوس تو ضرور ہوگیا۔ لیکن بعد میں یہ جان کر کہ شائد یہ میرے اپنے دماغ کی خیال آفرینی تھی میں واقعہ بھول گیا۔

قانون کا امتحان:۔

دو ماہ کے بعد نتیجہ کی خبریں آنی شروع ہوئیں۔ ایک دن میں ایک جنازہ کے ہمراہ قبرستان جا رہا تھا۔ پیچھے سے ایک دوست نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، نتیجہ نکل چکا ہے اور تم کامیاب ہو۔ میں نے اس سے پوچھا کہ میں کس درجہ میں پاس ہوا ہوں، اسکا جواب سن کر میں نے فوراً کہہ دیا کہ تم غلط کہتے ہو۔ نتیجہ ابھی یقیناً شائع نہیں ہوا۔ اس نے مجھ سے وجہ دریافت کی میں نے اسے بتایا کہ میں بہت اچھی پوزیشن کا متوقع ہوں۔ تم نے جو پوزیشن بتائی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتی۔ وہ دوست مسکرایا اور کہنے لگا کہ میں یونہی مذاق کر رہا ہوں واقعی نتیجہ ابھی نہیں نکلا لیکن دوسرے دن جب نتیجہ نکلا تو میری حیرت اور مایوسی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مجھے اخبار کے کئی بار ورق گردانی کے بعد یقین ہوگیا کہ میں امتحان میں فیل ہوں۔ ناکامی نے میرے حوصلے پست کردئے۔

اس سلسلہ میں سب سے حیرت انگیز اور تعجب خیز بات یہ تھی کہ میں قانونِ دیوانی کے پرچہ میں ناکام ہوا حالانکہ میں آزمائشی امتحان میں جو سالانہ

امتحان سے دو ماہ قبل ہوتا ہے اپنی جماعت کے تقریباً چھ صد طلبا میں سے اسی پرچہ میں اول رہا تھا اور انعام بھی پایا تھا۔ حسنِ اتفاق یہ ہے کہ میری تعلیمی مصروفیت کے دوران جماعتی اعتبار سے کوئی ہنگامہ خیز واقعہ رونما نہ ہوا تھا بلکہ ایسوسی ایشن کی تمام اہم سرگرمیاں مدھم پڑ چکی تھیں اور کارکنانِ جماعت جمود کی چادر تان کر بہت حد تک خاموش ہو گئے تھے۔ دوسرے سال میں امتحان سے فارغ ہو کر جموں واپس پہنچا ہی تھا کہ تحریکِ کشمیر کی ابتدا ہو گئی اور میں نے اپنا نتیجہ بی۔ اے کے نتیجہ کی طرح پھر سرینگر میں سنا۔ لیکن قلعہ ہری پربت میں بحالتِ نظر بندی۔

قدرت کی رہنمائی :-

میں نے ابتدا میں کہا ہے کہ میں وکالت کیلئے اپنے آپ کو موزوں سمجھتا ہوں اور نہ سیاست کیلئے ۔ یہ دونوں سلسلے میری مرضی کے خلاف واقع ہوئے تھے۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں میرا قطعاً مزید تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ نہ تھا۔ لیکن عالمِ خواب میں قدرت نے مجھے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کی طرف اشارہ کیا۔ جو حضرات اس بات کے قائل نہیں یا جو قائل تو ہیں لیکن میری اس کیفیت پر یقین نہیں کرنا چاہتے وہ یوں سمجھ لیں کہ یہ میرے اپنے خیالات کا پرتو تھا جس کا اِعادہ خواب کی صورت میں ہوا۔ گو میں کہہ چکا ہوں اور اس بات پر مُصر ہوں کہ میرے خیالات سلسلہ تعلیم جاری رکھنے کے خلاف تھے۔ بہر کیف میرا پختہ یقین ہے کہ بی اے پاس کرنے کے بعد اگر میں کچھ عرصہ اور بیکار رہنے پر مجبور ہو جاتا تو بادلِ ناخواستہ مجھے سو پچاس روپیہ کی ملازمت اختیار کرنا پڑتی اور ملازمت کی دَلدل میں پھنس کر آج تک کون باہر نکلا ہے۔ اسلئے قدرت نے میرے اقتصادی حالات کی

امتحان کے دوران میں روزانہ جاتا رہا۔ ایل۔ بی کے آخری پرچہ کے دن میں داتا صاحب کے مزار پر حسب معمول پہنچا۔ مقبرہ کے ساتھ ہی کھڑے ہوکر فاتحہ پڑھی اور اس کے بعد دعا میں مصروف ہو گیا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ عالمِ خواب میں ہوں۔ اُس حالت میں محسوس ہوا کہ کسی غیر مرئی طاقت نے مجھے آہستگی سے یہ کہا کہ تمہارا اِس سال امتحان میں کامیاب ہونا ٹھیک نہیں۔ اس واقعہ کے معاً بعد میری آنکھ کھل گئی۔ چند لمحات کے لئے متفکر اور مایوس تو ضرور ہو گیا۔ لیکن بعد میں یہ جان کر کہ شائد یہ میرے اپنے دماغ کی خیال آفرینی تھی میں واقعہ بھول گیا۔

قانون کا امتحان:۔

دو ماہ کے بعد نتیجہ کی خبریں آنی شروع ہوئیں۔ ایک دن میں ایک جنازہ کے ہمراہ قبرستان جا رہا تھا۔ پیچھے سے ایک دوست نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، نتیجہ نکل چکا ہے اور تم کامیاب ہو۔ میں نے اس سے پوچھا کہ میں کس درجہ میں پاس ہوا ہوں، اسکا جواب سن کر میں نے فوراً کہہ دیا کہ تم غلط کہتے ہو۔ نتیجہ ابھی یقیناً شائع نہیں ہوا۔ اس نے مجھ سے وجہ دریافت کی میں نے اسے بتایا کہ میں بہت اچھی پوزیشن کا متوقع ہوں۔ تم نے جو پوزیشن بتائی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتی۔ وہ دوست مسکرایا اور کہنے لگا کہ میں یونہی مذاق کر رہا ہوں واقعی نتیجہ ابھی نہیں نکلا لیکن دوسرے دن جب نتیجہ نکلا تو میری حیرت اور مایوسی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مجھے اخبار کے کئی بار ورق گردانی کے بعد یقین ہو گیا کہ میں امتحان میں فیل ہوں۔ ناکامی نے میرے حوصلے پست کر دیئے۔

اس سلسلہ میں سب سے حیرت انگیز اور تعجب خیز بات یہ تھی کہ میں قانونِ دیوانی کے پرچہ میں ناکام ہوا حالانکہ میں آزمائشی امتحان میں جو سالانہ

امتحان سے دو ماہ قبل ہوتا ہے اپنی جماعت کے تقریباً چھ صد طلبا میں سے اسی پرچہ میں اول رہا تھا اور انعام بھی پایا تھا۔ حسنِ اتفاق یہ ہے کہ میری تعلیمی مصروفیت کے دوران جماعتی اعتبار سے کوئی ہنگامہ خیز واقعہ رونما نہ ہوا تھا بلکہ ایسوسی ایشن کی تمام اہم سرگرمیاں مدھم پڑ چکی تھیں اور کارکنانِ جماعت جمود کی چادر تان کر بہت حد تک خاموش ہو گئے تھے۔ دوسرے سال میں امتحان سے فارغ ہو کر جموں واپس پہنچا ہی تھا کہ تحریکِ کشمیر کی ابتدا ہو گئی اور میں نے اپنا نتیجہ بی۔اے کے نتیجہ کی طرح پھر سرینگر میں سنا۔ لیکن قلعہ ہری پربت میں بحالتِ نظر بندی۔

قدرت کی رہنمائی :۔

میں نے ابتدا میں کہا ہے کہ میں وکالت کیلئے اپنے آپ کو موزوں سمجھتا ہوں اور نہ سیاست کیلئے۔ یہ دونوں سلسلے میری مرضی کے خلاف واقع ہوئے تھے۔ بی۔اے پاس کرنے کے بعد جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں میرا قطعاً مزید تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ نہ تھا۔ لیکن عالمِ خواب میں قدرت نے مجھے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کی طرف اشارہ کیا۔ جو حضرات اس بات کے قائل نہیں یا جو قائل تو ہیں لیکن میری اس کیفیت پر یقین نہیں کرنا چاہتے وہ یوں سمجھ لیں کہ یہ میرے اپنے خیالات کا پرتو تھا جس کا اِعادہ خواب کی صورت میں ہوا۔ گو میں کہہ چکا ہوں اور اس بات پر مُصر ہوں کہ میرے خیالات سلسلہ تعلیم جاری رکھنے کے خلاف تھے۔ بہرکیف میرا پختہ یقین ہے کہ بی اے پاس کرنے کے بعد اگر میں کچھ عرصہ اور بیکار رہنے پر مجبور ہو جاتا تو بادلِ ناخواستہ مجھے سو پچاس روپیہ کی ملازمت اختیار کرنا پڑتی اور ملازمت کی دَلدل میں پھنس کر آج تک کون باہر نکلا ہے۔ اسلئے قدرت نے میرے اقتصادی حالات کی

کمزوری کے باوجود مجھے لاء کالج داخل ہونے پر مجبور کردیا۔ داتا گنج بخشؒ کے مزار پر مجھے جو بشارت ہوئی اور جس کو میں نے امتحان میں ناکام ہونے پر برحق سمجھا وہ بھی فی الواقع خالی از علت نہ تھی جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا۔ اگر میں اس سال پاس ہو جاتا تو یقیناً میں اچھا عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔

ایسوسی ایشن کا کام جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اس وقت پھیکا پڑا ہوا تھا۔ اس کام میں بھی صدر ہونے کے باوجود میرے لئے حالات اور ماحول کے پیش نظر کوئی کشش اور جاذبیت نہ تھی لیکن قدرت کو یہی منظور تھا کہ میں اپنی حیثیت اور بساط کے مطابق قوم کا ادنیٰ سا خدمت گار بن جاؤں اور یہ واقعہ ہے کہ ایسوسی ایشن کی خود بنیاد رکھنے، اس کو کامیابی کے آخری زینہ تک پہنچانے اور قوم کا حتی المقدور کافی کام سرانجام دینے کے باوجود کبھی ایک لمحے کیلئے بھی میرے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہوا کہ قدت مجھے سیاسی زندگی کی غرض سے ہمیشہ کیلئے وقف کر رہی ہے۔ اور نہ ہی میں اس وقت یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ کارکنان قضاء وقدر ریاست کے مسلمانوں کیلئے کیا سوچ رہے ہیں۔ میرا اسی وقت امتحان میں سے آخری بار فارغ ہونا اور نتیجہ سننے سے پہلے جیل چلے جانا یہ ایسے واقعات ہیں جن سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سیاسی کام کے ساتھ ساتھ فکرِ معاش بھی لازمی ہے اور سیاسی زندگی کے دوش بدوش صرف وکالت کے ذریعہ ہی تھوڑا بہت کما سکتا تھا۔ اس لئے قدرت نے دونوں چیزیں میری مرضی کے خلاف مجھ پر ٹھونس دیں۔ بعد میں سیاسی اور معاشی کشمکش کے درمیان پھنس کر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ سیاست صرف ان کا کام ہے جو قائداعظم اور گاندھی جی کی طرح فارغ البال ہوں۔

دنیا میں بہت کم خوش قسمت انسان ایسے ہوں گے جو تونگری اور

فارغ البالی کے باوجود صالح اور نیک ہوں، یا پھر وہ عسرت اور تنگیٔ مال و املاک کے باوجود دنیا کی آزمائشوں اور امتحانوں سے کامیابی کیساتھ عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔
انسانی کی زندگی کا دارومدار معاش پر ہے۔ اگر یہ نہیں تو وہ کسی شعبہ زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکتا، بالخصوص سیاسی کارکنوں کیلئے اس کے بغیر سیاسی کام ناممکن ہے۔ جب تک کہ ان کی اقتصادی حالت مضبوط نہ ہو۔ وہ اپنے کاروبار کو چلانے کے قابل نہیں ہوتے اور جو کاروباری لوگ اس دلدل میں پھنس جاتے ہیں ان کا کاروبار بھی ختم ہو جاتا ہے اسکے بعد اگر ان کے پاس سرمایہ نہیں تو وہ بددیانت اور خائن ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ ذِلت اور رُسوائی کیساتھ سوسائٹی سے الگ کردئے جاتے ہیں۔ اگر وہ مخلص ہیں اور قوم کے مفاد اور خدمت کو ہر دنیاوی چیز پر ترجیح دیتے ہیں تو وہ ہمیشہ فکرِ قوم اور غمِ روزگار کے دوراہے پر پڑ کر اپنی اور اپنے متعلقین کی زندگی تلخ کردیتے ہیں۔
میں اور میرے اکثر سیاسی رفقاء نے آج تک اسی دوراہے پر زندگی کے بہترین ایام صرف کردئے۔ چنانچہ آج تک نہ تو قدرت نے مالی پریشانیوں سے مہلت دی نہ عملی سیاسی زندگی سے بے تعلقی کی راہ پیدا ہوئی۔
"شاید خدا نے مصلحتاً یہ کام سقیم الحال کارکنوں کے سُپرد کیا ہے"

کشمیر کا مسلمان :۔

آج سے رُبع صدی قبل ریاست کے مسلمانوں کی حالت ہر اعتبار سے ناگفتہ بہ تھی۔ وہ غلام ہو چکے تھے اور ستم تو یہ ہے کہ انہیں بھاری سے بھاری ضرب بھی خوابِ غفلت سے بیدار نہ کر سکی۔ ناداری و افلاس اور ذلت و ادبار ان کا مقدر تھا۔ عوام بھوکوں مرتے تھے۔ کوئی باعزت پیشہ ان کے ہاتھ میں نہ تھا۔ دودھ دہی کی دکانیں نانبائیوں اور حلوائیوں کا کام فراشی و حمالی یہ عام مسلمانوں

کا ذریعہ معاش تھا۔ کچھ معمار اور لوہار بھی تھے لیکن وہ بھی حالات زمانہ کی وجہ سے بمشکل روز کی روٹی کما سکتے تھے۔ کشمیر کا کاریگر اور فن کار دنیا بھر میں مشہور ہے۔ دنیا کا کوئی کونہ ایسا نہ ہوگا جہاں کشمیر کا فن اور گلکاری داد حاصل نہ کر چکی ہو۔ کشمیر کا شال دنیا کے بادشاہوں اور بیگمات کیلئے باعث زیبائش تھا۔ لیکن کشمیر کا یہ کاریگر جس کی وجہ سے کشمیر کو دنیا میں چار چاند لگے، اپنے کمالِ ہنر کے باوجود نانِ شبینہ تک سے محروم تھا۔ وہ جس کے کمالِ ہنر کی وجہ سے ریاست کشمیر دنیا میں مشہور تھی جو شالوں، قالینوں اور غالیچوں کا موجد تھا اس کی اور اسکے بیوی بچوں کی حالت یہ تھی کہ اس کے بدن کے کپڑے تار تار تھے۔ کشمیر ایسے برفانی علاقہ میں زمستان میں بھی وہ اور اسکے بچے عالمِ برہنگی میں زندگی بسر کرتے تھے۔ مسلمانوں میں گنتی کے چند تجار ٹھیکیدار اور اعلیٰ دوکاندار ہوں گے اور چونکہ ان لوگوں کا بالواسطہ یا بلاواسطہ خداوندانِ حکومت سے کاروباری تعلق ہوتا تھا اسلئے وہ اپنے مال ومتاع میں مست تھے۔ ان کے دلوں سے خدا کا خوف مٹ چکا تھا۔ وہ اپنے ان ہم قوم ومظلوم بھائیوں پر ترس نہیں کھاتے تھے جن کا خون چوس کر وہ یوں "بڑے" بنے ہوئے تھے ان میں قومی ہمدردی کا شائبہ تک موجود نہ تھا کہ وہ ہم وطن ہونے کے باعث غریبوں کی دست گیری اور حمایت کریں۔ وہ خدا سے نہیں بلکہ اپنے دنیاوی خداوندوں سے ڈرتے تھے وہ خائف تھے کہ اگر مسلمانوں سے ہمدردی کی تو ان کی شان وشوکت ان کا کاروباری اثر رسوخ اور ان کا وقار آن واحد میں مٹی میں ملا دیا جائے گا۔ سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کو کہاں تک رسائی ہو سکتی تھی۔ ایک تو وہ حکومت کی ستم ظریفی اور دانستہ تغافل کی وجہ سے تعلیم میں بہت پیچھے تھے، دوسرے وہ مسلمان تھے۔ سرکاری "مسند" اس "ملیچھ" کے وجود سے ناپاک

ہو جاتی تھی۔ اسلئے شائد چند حقیر حیثیت کے منشی سرکاری ملازم ہوں گے جو اپنے بچوں کا بمشکل پیٹ پال سکیں، اور محدودے چند "پڑھے لکھے" نوجوان جو نظر انداز کر دئے جاتے تھے۔

مُسلم عہدہ داروں کا رویہ :-

اعلیٰ ملازمت کیلئے شرطِ اول ضمیر کشی تھی اور قوم کی دشمنی! صرف چند مسلمان ایسے تھے جو بڑے بڑے عہدوں پر مامور تھے لیکن وہ بھی اپنی کاسہ لیسی اور ضمیر فروشی سے اس درجہ پر پہنچے تھے کہ ان سے مسلمانوں کو امید وفا تو درکنار اتنی بھی توقع نہ تھی کہ ایک دفعہ خندہ پیشانی سے عام مسلمانوں کو سلام کا جواب دیتے۔ غیر مسلم عہدیداروں سے بھی کبھار مسلمانوں کو مدد اور فائدہ کی توقع ہو سکتی تھی۔ لیکن اپنے مسلمان بھائی تک رسائی ہی ناممکن تھی گویا ایک طرف تو ریاست کے مسلمان کیلئے حکومت کی براہ راست غلامی تھی اور دوسری طرف متمول اور فارغ البال مسلمان طبقہ کی ستم شعاری جو مسلمانوں کو دبانے کیلئے حکومت کے آلہ کار بن چکے تھے۔

انسان دشمن کے وار تو سہہ سکتا ہے اور اس کی مدافعت بھی اپنی حیثیت کے مطابق کر سکتا ہے اور اگر وہ مقابلہ نہ کر سکے جب بھی وہ جانتا ہے کہ بیگانوں کے لگائے ہوئے زخموں کو ہر حال میں برداشت کرنا ہے لیکن اگر اپنے لوگ ہی دوستی کے لباس میں غیروں کے اشاروں پر رقص کرتے ہوئے افراد اور قوم کی جڑیں کاٹنی شروع کر دیں تو اسکا کیا علاج! چنانچہ مسلمانوں کے اس خود غرض اور قوم فروش گروہ نے بھی مسلمانوں کو نکبت وادبار کے عمیق گڑھے میں دھکیلنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

مسلمانوں سے حکومت کا سلوک:۔

ادھر حکومت نے مسلمانوں کو ظلم و تعدی کے مختلف حربوں سے دبایا اور جب اسے یقینِ محکم ہوگیا کہ اب یہ قوم لاکھ ہاتھ پاؤں مارے ابھرنے کی نہیں تو پھر زمانہ امن اور حالتِ اطمینان میں اس نے مسلمانوں سے کھلے بندوں شدید بے انصافیاں شروع کر دیں۔ سابقہ شدائد کا نقشہ ان کے سامنے تھا سلئے وہ بے انصافیوں کے خلاف آواز اٹھانے کی جرات بھی کیونکر کر سکتے تھے۔ انہوں نے جسمانی اذیت کے دور کے بعد بے انصافی کا زمانہ بھی جوں توں کر کے کاٹا لیکن جسمانی اور ذہنی پستی کے بعد تیسرا دور آزادی ضمیر کی پامالی کا شروع ہوا۔ جبکہ بعض علاقوں میں خانہ خدا کی تعمیر ان کیلئے ناممکن ہوگئی۔ فلاح کی طرف بلانے والی اذانیں بھی ان کیلئے ممنوع قرار دی گئیں۔ آزادی تقریر تو کبھی ریاست میں نام کو بھی نہ تھی۔ لیکن اب مسلمانوں کے مذہبی جلسے اور جلوس بھی حکومت کی طبعِ نازک پر گراں گزرنے لگے اور ان کا اِنعقاد قطعاً حکومت کے رحم پر منحصر ہوگیا۔ اس سلسلہ میں مسلمان اول اول تو طائرِ زیرِ دام کی طرح پھڑ پھڑائے لیکن صیاد کا دام کچے دھاگے کا نہ تھا کہ وہ اس سے آزادی حاصل کر سکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس قوم کے خدا اور رسولؐ نے مشرکوں کو نجس کہہ کر مخاطب کیا تھا وہی مشرک مسلمانوں کو نجس اور ملیچھ سمجھنے لگے اور وہ وقت بھی آگیا کہ ریاست کے برادرانِ وطن نے چھوت چھات کے معاملہ میں مسلمانوں کو اچھوتوں سے بھی زیادہ قابلِ نفرت سمجھا۔ حتیٰ کہ بعض حکمران اپنی مخصوص مجلسوں اور مذہبی محفلوں میں مسلمانوں کی شکل تک دیکھنا گوارا نہ کرتے تھے، اور اس حالت میں اگر کوئی مسلمان اتفاقاً ان کے نزدیک سے گزر جاتا، تو ان کے معبودوں کی عبادت ہی درہم برہم نہ ہو جاتی بلکہ اس محفل کا فرش اور تمام اشیاء ناپاک ہو جاتیں۔

غلامی کی تین منزلیں:۔

غلامی کی بھی تین منزلیں ہیں۔اول کسی قسم کو جسمانی طور پر عاجز و مجبور کر دیا جائے پھر اس کی ذہنی حالت کو آہستہ آہستہ مسخ کر دیا جائے اور اس کے بعد مذہبی اور قومی آزادی کی خداداد نعمت سے اسے محروم کر دیا جائے۔ اگر کوئی محکوم قوم اس آخری حالت کے وار سے سلامتی اور رضا مندی سے گذر گئی تو پھر سمجھو کہ حکومت کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم ہو گئیں۔اس کے بعد کہنے کو محکوم قوم سانس لینے کی حد تک زندہ ہوتی ہے لیکن حقیقتاً زندہ درگور۔آج سے پچیس سال قبل ریاست کشمیر کے مسلمان اسی حالت پر پہنچ چکے تھے۔وادی کشمیر کا مظلوم، معتوب اور مجبور مسلمان بالخصوص قعر مذلت میں پڑا ہوا تھا۔شائد اسلئے کہ حکومت اسے اپنا زر خرید غلام سمجھتی تھی اور اسکے ساتھ وہ سلوک مناسب و جائز سمجھتی تھی جو مسیح کی ولادت سے بہت پہلے رومی دیوتاؤں کے ہاں غلاموں سے کیا جاتا تھا۔کشمیری مسلمان کے یہ خود ساختہ آقا، آج بدلے ہوئے زمانہ میں بیسویں صدی کی نئی تہذیب و تمدن کے ایام میں بھی اسے ہدفِ ظلم و ستم بنانے میں شرم محسوس نہ کرتے تھے۔

کشمیری مسلمان کی عظمت:۔

یہ وہی کشمیری مسلمان تھا جس کی صناعی اور فن کاری چار دانگِ عالم میں مشہور تھی۔جس کی جدتِ طبع، ذہانت اور قابلیت نے بیرون ریاست میں ایک ہنگامہ بپا کر دیا تھا۔یہ حقیقت ہے اور ہندوستان کی تاریخ اسکی شاہد ہے کہ جو کشمیری ریاست سے باہر گیا، اپنی جواں مردی یا قابلیت کے باعث اس نے ہر شعبہ زندگی میں اس قدر عروج پایا کہ ہندوستان والے اسکو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ اقبال مرحوم اسی سرزمین کے فرزند تھے اور ان کو بجا طور پر اپنے آبائی

وطن پر فخر تھا۔ کشمیری کو آج بُزدل سمجھا جاتا ہے لیکن ہندوستان کے تمام نامور اور چوٹی کے پہلوان کشمیری تھے۔ امر تسر، گوجرانوالہ اور سیالکوٹ وغیرہ میں تمام سیاسی تحریکیں بڑی حد تک کشمیریوں کی مرہونِ احسان رہی ہیں اور کشمیریوں کا نام اعدائے اسلام کیلئے ان شہروں میں پیامِ موت کا درجہ رکھتا تھا لیکن چرخِ ناہنجار کی چیرہ دستیاں ملاحظہ ہوں کہ اپنے گھر میں اور اپنے وطن میں یہ بزدل بھی تھا حقیر و بے مایہ بھی۔ نااہل اور نا قابل بھی۔ چنانچہ ملازمت تک کا دروازہ اس پر بند تھا۔ یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ وہ محکوم اور غلام بن چکا تھا۔ اس کی آزادی اس سے بنوکِ شمشیر چھینی جاچکی تھی۔ اس کا دل و دماغ اس کی جواں مردی اور شجاعت کے جوہر بزور اس سے سلب کر لئے گئے تھے۔

صد حیف کہ دنیا میں کشمیری مسلمان کا وطن "فردوس بر روئے زمین" دوزخ سے بھی زیادہ بھیانک ہو۔ کشمیر کے پھل پھول مناظرِ قدرت سبزہ زار جھیلیں اور آبشاریں دنیا بھر میں سب سے زیادہ خوبصورت اور بہتر ہوں۔ صحت افزا مقامات سے سیاح اور حاکمان وقت متمتع ہوں، لیکن کشمیری مسلمان کا چہرہ فاقہ کی وجہ سے زرد ہو۔ اس کی اور اسکے وطن کی بہار اس کے لئے خزاں کے برابر ہو۔ صد افسوس کہ محلوں اور فلک بوس عمارتوں میں بیٹھنے والے لوگ جن کی امارت اور شان و شوکت آسودگی اور فارغ البالی کشمیری دہقان اور مزدور کے خون کی مرہونِ منت ہو۔ غرور کے نشے سے اور طاقت کے بل بوتے پر ان ہی غریبوں کو کچلنے روندنے اور ٹھکرانے کو زندگی کا ایک مقصد سمجھ لیں۔ تو کیا دنیا ایسے انسانوں کا کبھی مواخذہ نہ کرے گی؟ اور کیا ان کے جرائم و معاصی خدا کی نظروں سے اوجھل رہ سکیں گے؟

آلڈوس ھکسلے کا بیان :۔

آلڈوس ہکسلے ایک بین الاقوامی شہرت رکھنے والا مصنف ہے۔ وہ کچھ عُرصہ ہوا کشمیر آیا۔ اس نے اپنی سیاحت کے جو تاثرات زیبِ قرطاس کیئے ان میں کشمیر کے متعلق دو اہم باتیں مذکور ہیں وہ کہتا ہے کہ "میں دورانِ سیاحت کشمیر میں موٹر کار سے جس جگہ گیا وہاں میں نے راستہ میں قدم قدم پر گائیں بیٹھی ہوئی پائیں۔ کار کے اپنے شور، ہارن پر ہارن بجانے اور شور وغوغا کرنے کے باوجود یہ گائیں اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کرتی تھیں شائد ان کو اپنے مذہبی تقدس اور اپنی مامونیت کا احساس تھا۔ دوسرے یہ کہ میں نے کشمیر میں جو ایک اور افسوس ناک بات دیکھی وہ یہ تھی کہ وہاں بار برداری کیلئے حیوانوں کی بجائے انسانوں سے کام لیا جاتا ہے۔ میں نے خود دیکھا کہ انسان چھکڑوں کو حیوانوں کی طرح کھینچے جا رہے ہیں۔ جن پر سینکڑوں من بوجھ لدا ہے۔ اور پھر غلامی کی وجہ سے اتنے قانع ہیں کہ چھکڑوں کو کھینچتے وقت گیت گاتے چلے جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ریاست کا مسلمان اخلاقی ، ذہنی ، معاشرتی ، مذہبی اور اقتصادی طور پر قریباً ناکارہ اور عضوِ معطل بن چکا تھا۔ صداقت، شرافت، جرات ودلیری ، مقابلہ ، مقاتلہ حق گوئی وبیباکی ، باہمی اخوت، ہمدردی ، اتفاق و اشتراکت کے تمام خصائص انسانی ایک ایک کر کے قدرت نے اس سے چھین لئے کیونکہ وہ مجبوری اور ناکامی پر خود قانع ہو چکا تھا اور بجائے اسکے کہ وہ تعہد وغلامی کی زنگ آلود اور کڑی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کرتا اس نے اپنے اہل وعیال اور آئندہ نسلوں کیلئے ناقابل فخر غلامانہ زندگی پر قناعت کر لی اور وہ اسلامی روایات اور آزاد قوموں کے حالات کو یکسر بھول گیا۔

قصہ کوتاہ ریاست کا مسلمان غلامی کی آخری سرحد بھی پھاند چکا تھا۔ جس

کے بعد اب اسکی غلامی کا گھاؤ تازہ نہیں رہا تھا۔ تازہ ہوتا تو مسلمان کو اس کی تکلیف محسوس ہوتی اور شائد آسانی سے اس کا کچھ مداوا ہو سکتا۔ لیکن یہ گھاؤ بہت پرانا ہو چکا تھا اس لئے اس زخم کا علاج اب کسی غیر معمولی طریقہ ہی سے ہو سکتا تھا۔

تاریخ شاہد ہے کہ ایسی کئی مجبور و محکوم قوموں نے اپنی سابقہ ناکامی و نامرادی کی تاریخ کے اوراق سیاہ آناً فاناً پلٹ دیئے اور وہ پھر سے دنیا میں زندہ قومیں شمار ہونے لگیں اور اگر بدقسمتی سے دشمن کی طاقت اور برتری کی وجہ سے منزل مقصود تک نہ پہنچ سکیں تو کم از کم مردانہ وار لڑ کر اور مقابلہ کر کے ختم ہو گئیں اور اسی طرح دنیا پر ثابت کر گئیں کہ انہوں نے غلامی کی بیڑیاں کاٹ ڈالنے کیلئے مقدور بھر جدوجہد سے دریغ نہیں کیا۔

ردِّعمل :۔

یاس و قنوط و محکومی و مجبوری اور انحطاط قومی جب آخری حد تک پہنچ جاتے ہیں اور عوام میں شکستِ خوردگی اور یاس پرستی کی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے اس وقت دو قسم کے ردِعمل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسی قوموں پر بدحالی مستقلاً مسلط ہو جاتی ہے۔ ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے۔ انکے کان بہرے ان کی زبانیں گنگ اور انکے قویٰ شل ہو جاتے ہیں اور آخر کار وہ غلامی اور محکومی پر قانع ہو جاتے ہیں۔ ایسی قوموں کا مرنا اور جینا ان کے اختیار کی بات نہیں رہتی۔ وہ مرنا چاہیں تو مر نہیں سکتیں، جینا چاہیں تو جی نہیں سکتیں۔ ان کیلئے جینا بھی ذلت اور مرنا بھی حرام ہوتا ہے۔ لیکن بسا اوقات ایسا بھی ردِعمل ہو جاتا ہے کہ قومیں اپنی حالت زوال و انحطاط اور کیفیت بے چارگی و عاجزی کے طلسم کو توڑنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ اور جب ان کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے تو وہ زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کرتی ہیں یا اسی جدوجہد میں فنا ہو جاتی ہیں۔

ریاست کشمیر کا مسلمان مجبوری و بیچارگی کی آخری منزل پر پہنچ چکا تھا۔ اب وہ امید و بیم اور زیست و موت کے دوراہے پر تھا اس کیلئے فیصلہ طلب چیز یہ تھی کہ وہ ابدی زندگی کیلئے سینہ سپر ہوگا یا ذلت و نامرادی کی موت پر قناعت کرے گا۔

بیڑیاں کٹنے لگیں :۔

اگرچہ تنازع للبقا کے لئے خضرؑ......اور نوحؑ......کی عمر اور سکندر کا بخت درکار تھا لیکن قسام ازل کو یہی منظور تھا کہ وہ جلد ہی غلامی کی بیڑیوں کو جو مسلمانوں کے پاؤں میں ڈالی گئیں تھیں کاٹ ڈالنے کیلئے آمادہ عمل ہو جائے اور ظلم و استبداد کے فولادی طوق کو پرے پھینک دے۔ چنانچہ ریاست کے نیم زندہ اور نیم مردہ مسلمان نے آزادی کی ایک ہلکی سی انگڑائی لی اور تحریک حریت کشمیر سے چند سال پیشتر ریشم خانہ سرینگر کے حادثہ فاجعہ میں جہاں بے گناہ مسلمانوں کو ڈوگرہ فوج نے اپنے گھوڑوں کے سموں تلے روند ڈالا تھا ان کے ہونٹوں پر بھی آزادی کی ہلکی سی مسکراہٹ کھیلی، گو مسلمان اس واقعہ کو جلد ہی بھول گئے لیکن اس کی کسک لازوال تھی۔

تحریک کے آغاز سے قبل مسلمانوں پر مظالم اور بے انصافیوں کا لگاتار سلسلہ ان کی رگ حمیت اور غیرت قومی پر نشتر زنی کر چکا تھا، ان کے دلوں میں ان کا ضمیر چٹکیاں لے رہا تھا اور ظلم و ستم کے پرانے زخم ایک ایک کر کے پھر سے تازہ ہو گئے تھے۔ نعرہ حق بلند کرنے کیلئے مسلمانوں کے سینوں کے اندر ایک آگ سلگ چکی تھی۔ گو اسکے شعلے نمودار نہ ہوئے تھے لیکن اس آگ کا جل بجھ کر راکھ ہو جانا اب ناممکن تھا۔ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کی دہ سالہ کوشش پیہم سے مسلمان مرض الموت کی زد سے نکل چکے تھے اور اب بسترِ علالت چھوڑ کر مصروفِ عمل ہونے کیلئے بے تاب تھے۔ قدرت نے ایک قابل طبیب کی طرح ان کی نبض پر انگلی رکھی ہوئی تھی۔ انتظار صرف اس بات کا تھا کہ کب

قدرت مریض کی تندرستی کا فتویٰ صادر کرتی ہے۔۔جب یہ فتویٰ آخرکار ۱۹۳۶ء میں بندشِ خطبہ اور توہین قرآن کی صورت میں صادر ہو گیا۔تو جہاد آزادی کا طبل آناً فاناً بجھ گیا اور ایسا معلوم ہوا گویا اس طبل کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے آسمانوں سے فرشتے اتر آئے ہیں۔کفر و شرک اور ظلم و تعدی کے تمام کل پرزے حرکت میں آگئے۔لیکن قومی آزادی کے سیلِ رواں کو نہ آج تک کوئی روک سکا ہے اور نہ وہ یہاں رک سکتا ہے۔

چھٹا باب

مسلمانانِ ریاست کی بیداری!

بندشِ خطبہ:-

۱۹۳۱ء میں ابھی میں امتحان سے فارغ ہوا ہی تھا کہ چند یوم کے بعد عید آ گئی۔ عیدگاہ ان دنوں مسلمانوں کی اپنی مملوکہ نہ تھی، بلکہ میونسپل کمیٹی کے ایک باغ میں نمازِ عید پڑھی جاتی تھی۔ عیدین کے موقعوں پر معمولاً باوردی پولیس متعین ہوتی تھی۔ ۱۹۳۱ء کی تاریخی عید کے موقعہ پر بھی جو مسلمانانِ ریاست کے قومی جشن کا دن تھا پولیس وہاں موجود تھی۔ ایک کوتاہ اندیش سب انسپکٹر پولیس امام عیدین کے خطبہ کے نوٹ لے رہا تھا۔ امام نہ تو نئی روشنی کا تھا نہ حکومت کا بدخواہ اور انجمن اسلامیہ بھی جس کے زیرِ اہتمام نمازِ عید کا انتظام ہوا کرتا تھا، گورنمنٹ کی باغی جماعت نہ تھی بلکہ اس کے اراکین درباری کرسی حاصل کرنے کیلئے جان کی بازی لگا دینے والے بزرگ تھے اور اسی ایک کشش کی وجہ سے انجمن کی اعلیٰ رکنیت کیلئے باہمی کھینچا تانی اور سر پھٹول میں مصروف رہتے تھے۔ امامِ عیدین بغیر کسی خاص ارادے یا غرض کے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ بیان کر رہا تھا۔ اس واقعہ سے کسی کی طرف روئے سخن نہ تھا اور نہ کسی کی طرف روئے سخن کی اسے جرأت ہو سکتی تھی لیکن خداوند تعالیٰ نے آزادی کا علم بلند کرنے اور محکومی وغلامی کے خلاف جہاد کرنے کا یہی پاک دن پہلے سے مقرر کر رکھا تھا۔ جب کسی قوم کے اچھے دن آتے ہیں تو قدرت اس کی قسمت کو بدلنے کیلئے آپ ہی اسباب بہم پہنچا دیتی ہے اور یہی اسباب ومواقع مخالف ومعاند طاقت کے خلاف اس قوم کے حق میں نتیجہ خیز ثابت ہوتے ہیں۔

الغرض جونہی امام صاحب نے فرعون کو ظالم بادشاہ کے نام سے یاد کیا تو سب انسپکٹر نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ نہ اپنی عقل سے کام لیا شائد اسکی عقل پر پردے ڈال دیئے گئے تھے اور تحکمانہ انداز میں پُکار اٹھا کہ امام صاحب خطبہ بند کیجئے۔ آپ قانون کی حدود کو پھاند رہے ہیں اور جرمِ بغاوت کے مُرتکب ہو رہے ہیں۔

مُداخلت فِی الدّین :۔

بے چارہ امام ہکا بکا رہ گیا ور بغاوت کے نام سے کچھ خوف زدہ بھی ہو گیا۔ اراکینِ انجمن پریشان ہیں۔ اِدھر تو وہ سمجھے کہ حکومت کی نظروں میں معتوب ہو جائیں گے اور اُدھر خطبہ کی بندش کوئی ایسی میٹھی گولی نہ تھی کہ آسانی سے نگلی جاتی۔ شائد وہ اسے حلق سے نیچے طوعاً و کرہاً اتار ہی لیتے لیکن نمازیوں کے جذبات و احساسات کے پیشِ نظر وہ ایسا نہ کر سکے۔ چہرے ان کے ہلدی کی طرح زرد تھے اور ان کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' کے مصداق انہوں نے چُپ سادھ لی، آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیں۔ ادھر عوام پر کچھ وقت کیلئے سکوتِ مرگ طاری تھا۔ بس یہی ایک نازک لمحہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ عوام کیا رویہ اختیار کریں گے۔ دائمی زندگی کیلئے ہنگامہ محشر بپا کر دیں گے یا اراکینِ انجمن اور امام کی طرح برگِ حشیش کے نشہ میں سسکیاں لے لے کر دم توڑ دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دن مسلمانوں کیلئے ''یومِ نجات'' کا حکم رکھتا تھا۔ ایسوسی ایشن کے چند زندہ دل بے باک اور حق گو، نوجوان خاموش نہ رہ سکے اور انہوں نے اس مداخلت پر شور مچا دیا۔ جس پر ہر طرف سے ''مداخلت فی الدین'' ''مداخلت فی الدین'' کی آوازیں اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے بلند ہونے شروع ہو گئے۔

ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کا احتجاج :۔

مسلمانوں کا ایک گروہ کثیر جس کے دل میں جذبہ ایمانی اور حمیتِ قومی

کے احساسات موجود تھے یا اس واقعہ کی وجہ سے اسی وقت ان کے دلوں میں پیدا ہو گئے تھے۔ عیدگاہ سے اُٹھا۔ پولیس میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے فِرار ہوگئی، یہ گروہ جلوس کی شکل میں شہر کی تاریخی مسجد پہنچا اور وہاں: حکومت کے اس فعل کی مذمت میں دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ رات کیلئے جلسے کا وہیں اعلان کر دیا گیا۔ اس جلسہ میں اجتماع اس قدر زیادہ ہوا کہ اس سے پیشتر مسلمانوں کے جلسوں میں اس کی نظیر موجود نہ تھی۔ صدیوں کے دبے ہوئے جذبات سمندر کے طوفان کی طرح مسلمانوں کے دلوں میں موجزن ہو گئے۔ ان کی دیوانگی و وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ دیکھنے والے یہ سمجھتے تھے کہ آج مسلمانوں کو "آسیب" ہو گیا ہے۔ اور قومی آسیب تو یقیناً تھا۔ اسی آسیب کی بدولت دنیا میں قومیں اُبھرتی اور سرفراز و فرومن ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کے نعروں میں اتنا جوش تھا کہ محسوس ہوجاتا تھا شائد آج کی رات ہر چھوٹے بڑے مسلمان کا سینہ پھٹ جائیگا۔

میری پہلی تقریر:-

میرے لئے پبلک میں تقریر کرنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دورانِ تقریر میرا جسم کانپ رہا تھا۔ میرا دل پھول پھول جاتا تھا۔ میں موزوں الفاظ کی تلاش میں رُک رُک جاتا تھا۔ لیکن۔

"دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے"

ساتھ ہی ایسے مواقع پر عوام مقرر کے ظاہری عیوب و محاسن کو نگاہ میں نہیں لاتے، بلکہ وہ اسکے جذبات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ غرض یہ ایک ایسا زبردست اجتماع تھا کہ ایوانِ حکومت میں تہلکہ مچ گیا۔ حکومت سراسیمہ اور پریشان ہوگئی جیسے کوئی کسی عزیز کی اچانک موت سے گُم سُم ہو جاتا ہے۔

حکومت کو اس سے قبل ایسی صورتحال سے دوچار نہ ہونا پڑا تھا اس لئے وہ ہم کو گرفتار کرنے کی جرّات نہ کر سکی اور نہ مسلمانوں کے سیاسی سیلابِ بے پناہ کو روکنے کا کوئی چارہ کر سکی۔ جلسوں کا سلسلہ روز کا معمول ہوگیا۔ چند یوم کے بعد جموں سنٹرل جیل میں توہینِ قرآن کریم کا واقعہ رونما ہوا۔ مسلمانوں میں اشتعال اور شوقِ قربانی پہلے ہی موجزن ہو چکا تھا، اس واقعہ نے رہی سہی کسر پوری کردی اور گویا جلتی آگ پر تیل اور ہوا کا کام کیا۔ جب کسی کے بُرے دن آتے ہیں تو اس سے حرکات بھی ایسی ہی سرزد ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کے اعتدال پسند طبقہ نے سب انسپکٹر متعلقہ پر توہینِ مذہب کا مقدمہ دائر کیا۔ ہندو عدالت نے تنگ نظری اور شرعِ اسلامی سے عدمِ واقفیت کا ثبوت دیا اور اپنے فیصلہ میں خطبۂ عید کو نماز کا جزو نہیں قرار دیا۔

خطبہ کی بندش پر عدالت کا فیصلہ:۔

اس فیصلہ نے ایسوسی ایشن کو اس غلط اقدام سے فائدہ اٹھانے کا موقع دے دیا اور ہم نے یہ فیصلہ حکومت کی سازش پر محمول کیا۔ چنانچہ اس سے جوش وخروش اور اشتعال کے علاوہ اب مسلمانوں کے دلوں میں حکومت کے خلاف جذباتِ انتقام ونفرت بھی پیدا ہو گئے اور حکومت اور بھی زیادہ حواس باختہ ہوگئی۔ اس نے جلد اپنے طور پر ہائی کورٹ میں اس فیصلہ کیخلاف نگرانی دائر کردی جس کا فیصلہ ہائی کورٹ نے دو چار دنوں میں صادر کردیا کہ خطبہ مسلمہ طور پر نماز کا جزو ہوتا ہے اور سب انسپکٹر کو حق نہ تھا کہ وہ مداخلت کرتا۔ چنانچہ وہ معطل کردیا گیا۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب ایسی برات اور اشک شوئی سے مسلمان مطمئن نہیں ہو سکتے تھے عام قاعدہ ہے کہ پے درپے جلسوں ، جلوسوں اور مظاہروں سے عوام ایک وقت بالکل سیر ہوجاتے ہیں اور پھر وہ جوش وخروش

مفقود ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں صورتحال بالکل مختلف تھی۔ جلسوں کے ساتھ ساتھ ہم نے اشتہاروں اور پوسٹروں کے ذریعہ سے ریاست کے باقی مسلمانوں کو بھی حقیقتِ حال سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت مسلمانوں کا نہ اپنا پریس تھا اور نہ کوئی اپنا اخبار۔ چنانچہ اشتہارات سیالکوٹ سے طبع کرائے جاتے۔ اسکے علاوہ اس سلسلہ میں ''انقلاب'' لاہور نے مسلمانوں کی نمایاں خدمت کی جسے دیکھ کر حکومت نے چند یوم کے بعد ہی ''انقلاب'' کا داخلہ ریاست میں ممنوع قرار دے دیا۔ لیکن مہر اور سالک نے ثابت قدمی دکھائی اور ہم نوجوانوں کے حوصلے پست نہ ہونے دیئے چنانچہ انقلاب والوں نے ایک ہی دن میں چار پانچ اخبارات کے ڈیکلریشن حاصل کر لئے۔ ایک اخبار ریاست میں بند ہوتا تو دوسرا شروع ہو جاتا۔ اس طرح حکومت عاجز اور بے بس ہو گئی۔

میں ان ایام میں ایسوسی ایشن کا صدر تھا۔ اور اس حیثیت میں میں نے سری نگر کے چند دوستوں سے سلسلہ نامہ و پیام شروع کر دیا۔ ادھر ساغر صاحب نئے نئے اٹھے تھے۔ ہماری نظریں ان پر پڑیں، پبلسٹی کا کام بشمول دوسرے دوستوں کے ان کے سپرد کیا گیا۔ انہوں نے باوجود کم عمر ہونے کے اپنی قابلیت، جدت و ذہانت اور زورِ قلم اور زورِ زبان کے وہ جوہر دکھائے کہ چند ہفتوں کی سعیِ پیہم سے صوبہ جموں کے مسلمانوں کو (بشمول پونچھ) سیاسی اعتبار سے بیدار و ہوشیار کر دیا!

سرینگر میں ایسوسی ایشن کی شاخ:۔

پونچھ میر پور میں مسلم ایسوسی ایشن کا اجرا ہو گیا اور سری نگر سے شیخ محمد عبداللہ جموں آئے۔ وہ ان دنوں گورنمنٹ ہائی سکول میں سائنس کے استاد تھے۔ انہوں نے مجھ سے ملاقات کرنے کے بعد سرینگر میں ایسوسی ایشن کی

برانچ قائم کرنے کی درخواست کی۔ جسے ہم نے باقاعدہ طور پر منظور کرلیا۔ یہ ہم نے اس لئے کیا کہ حکومت سرینگر میں ایسوسی ایشن کے کام میں قانونی لحاظ سے روڑے نہ اٹکائے۔ حالانکہ ہم تو خیر بڑے بڑے سیاست دانوں کو یہ بات اس وقت نہ سوجھ سکی کہ حالات قانونی کاروائیوں سے کوسوں دور آگے نکل چکے ہیں۔ بہرحال شیخ محمد عبداللہ نے سرینگر پہنچتے ہی ایسوسی ایشن کی طرح ڈالی اور ملازم ہونے کے باوجود انہوں نے جلسوں اور تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ جس پر چند دنوں کے اندر ہی حکومت نے ان کو ملازمت سے برطرف کردیا۔ اب وہ آزاد ہوگئے۔ انکی برطرفی نے مسلمانان کشمیر کے جذبات کو اُبھار دیا اور ساتھ ہی شیخ صاحب کیلئے ان کے دلوں میں جگہ بھی پیدا ہوگئی۔

میر واعظ:۔

اس زمانے میں میر واعظ کو کشمیر کا مسلمان بعد از پیغمبر سب سے زیادہ مقدس انسان تصور کرتا تھا۔ موجودہ میر واعظ مولانا محمد یوسف اس وقت نئے نئے میر واعظ بنے تھے۔ انکے دل میں حرارتِ ایمانی نے جوش مارا۔ ان کے اثر ورسوخ کے بغیر کسی تحریک کا کشمیر میں پروان چڑھنا تو درکنار ابتدائی منزلیں طے کرنا بھی مشکل تھا۔ میر واعظ کی آواز کشمیر کے مسلمانوں کے لئے جادو کا حکم رکھتی تھی اور اس کے احکام کی خلاف ورزی گناہ سمجھی جاتی تھی۔

خوش قسمتی سے شیخ محمد عبداللہ کی معاونت میر واعظ کے خاندان نے قبول کرلی۔ دو چار نوجوانوں نے شیخ عبداللہ سے سیاسی رفاقت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند دنوں کے اندر اندر بندشِ خطبہ اور توہینِ قرآن کے واقعات نے کشمیری مسلمان کی رُوح کو تڑپا دیا اور اسکے خون کو گرما دیا۔ یوں اس بے حس زندگی نے ایک نئی کروٹ لی اور اس کے سینے کے اندر قومی امنگوں، خواہشوں اور عزائم

کے سمندر متلاطم ہو گئے۔

ریاست کا مسلمان اب بیدار تھا۔ وہ میدانِ کارزار میں کودنے، مستبد طاقت سے متصادم ہونے اور مستانہ وار نعرہ حق بلند کر کے موت کیساتھ کھیل جانے کیلئے آمادہ و تیار تھا۔ تمام کرہ ہوائی متاثر ہو چکا تھا۔ ریاست کے طول و عرض میں جا بجا آگ کی چنگاریاں بکھر چکی تھی اور یہ چنگاریاں شعلہ جوالہ بن جانے کی منتظر تھیں۔ شہر جموں میں جوش و خروش اور حکومت کے خلاف جذبہ حقارت و نفرت روز بروز بڑھ رہا تھا۔ ایک دن اچانک مسٹر ویکفیلڈ جو ان دنوں مہاراجہ ہری سنگھ کا مشیر خاص تھا اور تمام نظم و نسق حکومت پر چھایا ہوا تھا۔ سرینگر سے جموں پہنچ گیا۔ اس کی آمد کے دوسرے روز جمعہ تھا۔ ایسوسی ایشن نے قبل از وقت اعلان کر رکھا تھا کہ فریضہ جمعہ جموں کی شاہی مسجد میں ادا ہوگا لیکن حکومت نے صبح سویرے ہی پولیس کے ذریعہ مسجد کو باہر سے گھیر لیا۔ حکام پولیس اور مجسٹریٹ بھی موقعہ پر متعین کر دئے گئے۔ جب اس واقعہ کی اطلاع مجھے ملی تو میں نے مسٹر ویکفیلڈ کے نام ایک چٹھی ارسال کی جس کا مضمون سخت اور تہدید آمیز تھا۔ اس میں پولیس کو مسجد سے فوری طور پر ہٹانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس چٹھی کا اثر یہ ہوا کہ نماز سے قبل پولیس وغیرہ مسجد سے ہٹالی گئی۔

ویکفیلڈ سے وفد کی ملاقات:۔

اسی دن شام کو مجھے مسٹر ویکفیلڈ کی چٹھی موصول ہوئی کہ وہ ایسوسی ایشن کے وفد سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے روز دس بجے صبح مسلمانوں کا ایک وفد اس کو ملا۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ یہ تھا کہ ایک صندوقچی سے میری چٹھی نکال کر پڑھ کر مجھ کو سنائی اور پھر مجھ سے دریافت کیا کہ یہ چٹھی تمہاری ہے؟ میں نے کہا ہاں! اس پر وہ جھنجلا کر بولا کہ اس

چٹھی کا لب ولہجہ قابلِ اعتراض ہے۔ میں مسکرا دیا۔ اس کے بعد بحث وتمحیص کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مجھے اس ملاقات کے دو تین باتیں آج تک خاص طور پر یاد ہیں۔ ایک یہ کہ دوران گفتگو جب اس نے اپنے دلائل اور رعب وداب کے تمام حربے ختم کر ڈالے اور ہم ٹس سے مس نہ ہوئے تو اس نے اپنے ترکش سے آخری تیر نکال کر ہم پر اوچھا وار کرنا چاہا اور فوراً حیدر آباد دکن کا قصہ چھیڑ دیا۔ وہ ریاست کشمیر میں آنے سے قبل حیدر آباد میں ملازم رہ چکا تھا۔ حیدر آباد کے حالات بتا بتا کر اس نے ہمیں جتانا چاہا کہ اگر مسلمانان کشمیر حکومت کے ساتھ ٹکر لیں گے تو اس کا ردعمل براہ راست حیدر آباد میں ہوگا اور وہاں کا ہندو بھی نظام کیخلاف ستیہ گرہ شروع کردے گا۔ ہم نے اسکے جواب میں کہا کہ ہماری داستانِ مظلومیت کے مقابلہ پر دنیا کی کوئی داستانِ ستم پیش نہیں کی جاسکتی۔ ہم کو اپنی فکر ہے۔ اگر فی الواقع حیدر آباد کا ہندو مظلوم ہے تو اسکا پیدائشی حق ہے کہ وہ بھی جدوجہد کرے۔ اسکے بعد مسٹر ویکفیلڈ کی زبان قریباً قریباً گنگ ہوگئی۔

ساغر صاحب کا نعرۂ حق:۔

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ ساغر صاحب نے جو وفد کے ایک رکن تھے اردو میں سلسلہ کلام شروع کرتے ہوئے اقبال کا یہ شعر۔

بریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیبِ تنش جامۂ تار تارے

پڑھ دیا جسے سن کر ویکفیلڈ ہکا بکا رہ گیا۔ ساغر صاحب اس وقت نوعمر تھے اور ہم سب سے زیادہ جوشیلے تھے لیکن گفتگو میں محتاط اور مدلل۔ حاصلِ کلام یہ کہ ملاقات کے آخری لمحات میں مسٹر ویکفیلڈ نے ہمیں مشورہ دیا کہ ہنگامہ آرائی اور غیر آئینی شوروغل کے بجائے اگر مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد مہاراجہ

کو ملے اور اپنے مطالبات ضبطِ تحریر میں لا کر ان کے سامنے پیش کرے تو یہ طریقہ کار موزوں ہوگا۔ ہم نے فوراً اندازہ لگالیا کہ اس مشورہ کے اظہار کیلئے زبان تو مسٹر ویکفیلڈ کی ہے لیکن چلمن کے پیچھے کوئی اور بول رہا ہے۔ ہم نے اسے جواباً کہا کہ ہم باہمی مشورہ کے بعد اسکا جواب دیں گے۔ اس وقت نہیں۔

یہاں یہ بات ضمناً درج کرنا دوراز کار نہ ہوگی کہ بعد میں ویکفیلڈ کو اس کے مخالفوں کے معاندانہ پروپیگنڈا کی وجہ سے اس الزام کے تحت کہ مسلم ایسوسی ایشن کے ساتھ اس کی اندرونی سازباز ہے۔ نہایت توہین آمیز طریقہ سے ریاست کی ملازمت سے سُبکدوش کیا گیا۔ اس کو مرے اب مدت ہو چکی ہے۔ اس لئے اگر آج یہ کہا جائے کہ مسٹر ویکفیلڈ مہاراجہ کا اول نمبر کا بہی خواہ اور نمک حلال وزیر تھا تو اس میں قطعاً مبالغہ نہ ہوگا۔ مگر وہ ایک سازش کا شکار ہو کر بے آبرو کر دیا گیا۔ قربِ سلطانی بجا طور پر بُرا سمجھا جاتا ہے اور جب سلطانی بھی ایسی ہو جس کی بنیادیں خونِ ناحق سے اٹھائی گئی ہوں، جہاں نہ انصاف ہو نہ حکمتِ عملی اور نہ دور اندیشی تو پھر ایسی فضا اور ماحول میں بھلائی کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ جو ایسی توقع کرے وہ بے وقوف ہے، اور خود فریبی میں مبتلا۔

عملی سرگرمیوں کے ارادے :۔

ویکفیلڈ سے ملاقات کے بعد ایسوسی ایشن کے سربرآوردہ اور سرگرم کارکنوں کا ایک اجلاس بلایا گیا جس میں اس کی پیش کردہ تجویز کو زیرِ غور لایا گیا۔ ویکفیلڈ کے جموں پہنچنے سے چند یوم قبل مسلمانوں میں قدرے سیاسی اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ حکومت کا کاسہ لیس اور ہوا خواہ طبقہ حکومت کے اشاروں پر ناچ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ قومی تحریک کو کسی حال میں غیر آئینی رنگ نہ دیا جائے۔ اسکی ہاں میں ہاں ملانے والے اور بھی بہت سے عمر رسیدہ لوگ

موجود تھے جن مین بعض تو کمزوری دل کی بِنا پر سیاسی اقدام کے مخالف تھے اور بعض اپنی سنہری مصلحتوں کے تقاضے سے مجبور تھے لیکن نوجوان طبقہ تمام کا تمام ایسے لوگوں کے مخالف تھا۔ اس میں شک نہیں کہ عمر رسیدہ لوگوں کی اکثریت بھی ہمارے ساتھ تھی لیکن اس عافیت کوش اور حکومت پرست گروہ کے پاس وہی پرانی اور پائمال دلیل تھی کہ تحریک جاری کرنے سے کشت وخون ہوگا۔ حکومت مسلمانوں کی دشمن اور جان کی لاگو ہو جائیگی۔ گولیاں چلیں گے، بے گناہ لوگ مارے جائیں گے۔ پکڑ دھکڑ سے قوم کی وحدت درہم برہم ہو جائیگی اور اسکے نتیجے میں قوم کو ملے گا کیا؟ بظاہر ان کے دلائل وزن دار تھے۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جنہوں نے ایک زمانہ دیکھا ہوا تھا۔ اس وجہ سے تجربہ کار اور موقع شناس تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جن کی شخصیت بڑی اہم اور معتبر سمجھی جاتی تھی اور بعض ایسے بھی تھے جو نیک نیت اور تحریک کے حامی تو ضرور تھے مگر بزدل تھے اور ساتھ ہی چرب زبان بھی۔ جن کی جادو بیانی کا سکہ ایامِ طفلی سے ہمارے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ہر دیگ کے چمچے ہوتے ہیں۔ یہ طبقہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ بہر حال اسوقت عقل یہ حیلے تراش رہی تھی کہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں قافلہ امید کی ...... بے سروسامانی میں بادیہ پیمائی محال ہے۔ اور یہی کوتاہ اندیش، بزدل اور عافیت کوش جماعت نوجوان طبقہ کو ہر طریقہ سے دبا دینا چاہتی تھی لیکن اس کے برعکس عشق زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ قومی بیداری اور جنگِ آزادی کا معاملہ کسی مصلحت کے تابع نہیں۔ اس لئے تم عقل کی جس قدر زیادہ پیروی کروگے، تمہاری منزل اسی قدر دور ہوتی جائیگی۔ عقل و عشق کی باہمی آویزش کے دوران جب فضاؤں میں ہر طرف انقلاب رچا ہو دل و دماغ نشۂ حریت سے سرشار ہو

اور ناموسِ ملت کے تحفظ اور بقاء کیلئے بے قرار ہوں اور انسان کی رگوں میں نوعمرے اور جوانی کا تازہ تازہ اور گرم گرم خون تیزی سے دوڑ رہا ہو، اس حالت میں بے چاری عقل کو کون پوچھتا ہے اور اسکی سنتا کون ہے؟

بہر کیف نوجوان طبقہ اور مصلحت کوش بزرگانِ قوم کے درمیان آئینی یا غیر آئینی طریق جنگ کا جھگڑا ابھی چل رہا تھا اور ایسوسی ایشن حکومت کے ساتھ نبرد آزمائی کے لئے تیار ہو رہی تھی کہ مسٹر ویکفیلڈ کے پیغام نے حالات کو کسی حد تک تبدیل کر دیا۔ نوجوان طبقہ اب بھی اپنی ہٹ پر قائم تھا لیکن اس اثنا میں سرینگر سے ٹیلیفون کے ذریعہ مسلمانوں کا پیغام اور حکومت کی جانب سے مجھے تار موصول ہو گیا کہ جموں سے چار مسلم نمائندوں کا انتخاب عمل میں لایا جائے۔ اور یہ نمائندے جلد از جلد سرینگر پہنچ جائیں تا کہ مطالبات کا میمورنڈم تیار کر کے مہاراجہ کو اصالتاً دیا جائے۔

ساتواں باب

وادی کشمیر میں حق وباطل کی ٹکر!

نمائندہ وفد کی سرینگر کو روانگی :-

کشمیر میں ایسوسی ایشن کے پیغام کی وجہ سے حالات یکا یک تبدیل ہو گئے اور ہم نمائندوں کے انتخاب کے لئے مجبور ہو گئے۔ چنانچہ نمائندوں کا انتخاب تقریباً جمہوری اصولوں پر کیا گیا۔ میں بھی نمائندوں میں سے ایک تھا۔ جولائی ۱۹۳۱ء کے آغاز میں ہم سرینگر پہنچ گئے جہاں چوکی بٹوارہ پر ہمارا پرشکوہ استقبال کیا گیا۔ استقبال کرنے والوں میں مولانا محمد یوسف شاہ میر واعظ، شیخ عبداللہ، شہر کا تمام باوقار طبقہ اور ہزاروں مسلمان شامل تھے۔

میں ان دنوں سُوٹ پہنتا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے سرینگر کے اکابر کے سادہ وصوفیانہ لباس اور اکثر باریش چہروں کو دیکھا اور اسکے ساتھ ہی میں نے اپنے ہیئت اور چمک دمک والی ٹائی اور سُوٹ بوٹ کو دیکھا تو باوجود نوعمری کے میں اپنے دل ہی دل میں بے حد پشیمان ہوا۔ عوام مجھے لیڈری کا احساس تو کبھی کا دلا چکے تھے۔ لیکن اس احساس نے میرے دماغی توازن کو کبھی خراب نہ کیا تھا۔ استقبال کے موقع پر جب میں نے اپنا تقابل بزرگانِ کشمیر سے کیا تو علاوہ پشیمانی کے میرے ضمیر نے بھی مجھے ملامت شروع کر دی حالانکہ شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کی وضع قطع بھی کچھ مجھ جیسی ہی تھی۔ علاوہ بریں گیارہ منتخب نمائندوں میں سب سے کم عمر تھا اسلئے احساسِ کمتری کے باوجود اس بات نے مجھے سہارا دیا۔

بہر حال جلوس کی شکل میں ہمیں قیام گاہ تک پہنچایا گیا اور دوسرے روز صبح ہی ہم میمورنڈم کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ سارا دن مُطالبات کے تعین اور ترتیب پر بحث و تمحیص ہوتی رہی اور شام کے وقت بالعموم جلسوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ ہماری یہ مصروفیت جاری تھی کہ اسی دوران ۱۳ رجولائی کا یومِ سعید اور تاریخ کشمیر میں سب سے اہم اور مقدس دن آ پہنچا۔ ایسا دن کہ اگر یہ کیلنڈر میں موجود نہ ہوتا، تو یقیناً ریاست کشمیر کی سیاسی تاریخ جو ۱۹۳۱ء سے لے کر آج تک مرتب ہو رہی ہے اور آئندہ بھی مرتب ہوتی رہے گی بالکل مختلف ہوتی۔

۱۳ رجولائی ۱۹۳۱ء:۔

۱۳ رجولائی ۱۹۳۱ء دن کے دو بجے کے قریب میں ایک دوست کے ساتھ امیرا کدل کے بازار میں کھڑا تھا۔ ہم یوں ہی اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھے۔ مجھ پر کچھ پژمردگی اور اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں کے اندر اندر ساری فضا غُبار آلود ہو گئی اور اندھیرا سا چھا گیا۔ پہلے تو فضا کا یہ رنگ دیکھ کر گمان ہوا کہ موسلا دھار بارش ہونے والی ہے۔ میں قیام گاہ کی طرف جانے ہی والا تھا کہ اچانک آندھیاں گرگرا آگئیں۔ ساری فضا زمین سے لے کر آسمان تک گرد و غبار کا ایک تودہ مجسم بن گئی۔ کیفیت یہ ہو گئی کہ میں اپنے ساتھی کو بھی جو مجھ سے ڈیڑھ دو فٹ کے فاصلے پر تھا دیکھ نہ سکتا تھا۔ قہرِ خداوندی کا یہ سلسلہ تقریباً پاؤ گھنٹہ تک جاری رہا۔ اسکے بعد فضا بالکل ساکن ہو گئی۔ آسمان کی سیاہی اور زردی تانبے کی سی لالی میں تبدیل ہو گئی۔ وادی کشمیر اپنے محلِ وقوع اور رہائشی طرزِ تعمیر کی ایسی خصوصیات رکھتی ہے کہ ہوا کی تندی اور بارش کی تیزی اس کیلئے بیحد خطرناک ہوتی ہے۔ ہوا کے تیز جھکڑوں سے مکانات جو عموماً لکڑی کے بنے ہوتے ہیں اور ثمر دار درختوں کو نقصان عظیم پہنچتا

ہے۔ تیز بارش کی وجہ سے دریائے جہلم میں فوراً طغیانی آجاتی ہے۔ چونکہ قدرت کو اس جنتِ ارضی کی بقاء منظور ہے، اسلئے اس کے جغرافیائی حالات بھی ایسے ہیں کہ نہ کبھی وہاں تند و تیز آندھیاں چلتی ہیں اور نہ موسلا دھار بارشیں ہوتی ہیں۔ لیکن اس دن کی طوفانی آندھی کے متعلق تمام معمر لوگوں کی یہ رائے تھی کہ ایسا قیامت خیز منظر ساکنانِ کشمیر نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آندھی تھم جانے کے بعد جب آسمان عنابی ہوگیا تو آسمان کی طرف ہر دیکھنے والے کا دل کانپتا اور لرزتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ خوف اور مایوسی کی گرانباریوں کے نیچے معصوم دل دبے جارہے ہیں۔ میرا دل بھی بیٹھا جارہا تھا اور میں غیر ارادی طور پر محسوس کر رہا تھا کہ کوئی خوفناک مصیبت آنے والی ہے۔ میں شروع ہی میں جہاں کھڑا تھا آخر تک وہیں کھڑا رہا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ نقل و حرکت کی تمام طاقتیں سلب ہوگئی ہیں۔ میں اب اس ادھیڑ بن میں تھا کہ کہاں کا رُخ کروں، یکا یک میری نگاہ سامنے کے منظر پر جا پڑی۔ جگہ جگہ عوام کی ٹولیاں باہم سرگوشیاں کرتی نظر آئیں۔ میرے کان کھڑے ہوگئے۔ انکے چہروں پر خوف و ہراس اور مایوسی کے اثرات نمایاں تھے۔

سنٹرل جیل سرینگر میں مسلمانوں پر فائرنگ:۔

قدرے توقف کے بعد میں نے ایک شخص سے لوگوں کے اس اضطراب و سراسیمگی کی وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ حکومت نے سنٹرل جیل میں نہتے اور ناکردہ گناہ مسلمانوں پر گولی چلادی ہے۔ یہ خبر سنتے ہی میں تیر کی طرح جامع مسجد میں پہنچا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ سترہ بے گناہ مسلمان داعی اجل کو لبیک کہہ چکے ہیں اور بیسیوں گولی کے نشانہ سے زخمی ہوکر حالت نزع میں ہیں۔

اَلحمدُ لِلّٰہ کہ تحریکِ حریت کشمیر کی ابتدا شہیدوں کے خُون سے ہوئی اور یہ پہلا خُون تھا جس نے تحریکِ حریت کی داستان کو رنگین بنایا۔ جس نے حکومت اور شخصی حکمرانی کے دامن کو ہمیشہ کیلئے داغ دار کر دیا۔ جامع مسجد کا اندرونی حصہ مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آہ وفغاں، گریہ وبقا کا نالہ وشیون کی صدائیں زمیں اور آسمان کا سینہ فگار کر رہی تھیں، بے کس عورتیں اور ستم رسیدہ بوڑھے اپنی جھولیاں پھیلائے آسمان کی طرف منہ اٹھائے چشم تصور میں خداوند حقیقی کے دربار میں دادرسی کیلئے آنسو بہا رہے تھے۔ ان کا گریہ وشیون اور آہوں کا مسلسل اور لا متناہی سلسلہ فضا میں بھاگتے ہوئے بادلوں اور آسمان کی بلندیوں کو چیرتا ہوا عرشِ معلیٰ تک پہنچ رہا تھا۔ ظالم ڈوگرے کی جلادانہ اور سفاکانہ حرکات کے خلاف دادخواہی کیلئے خدائے قہار وجبار کو پورے عجز ونیاز سے پُکارا جا رہا تھا۔ میں بچپن سے ہی نرم دل اور رقیق القلب واقع ہوا ہوں اور تحریک کے آغاز سے یہ حسیات اور بھی تیز ہو گئی تھیں۔ شائد ہر جذباتی انسان ایسا ہی ہوتا ہو۔ کچھ عرصہ خاموشی سے یہ ایک اندوہناک منظر دیکھتا رہا مگر تھوڑی دیر بعد شدت اندوہ وغم سے میرے ہاتھ پاؤں شل ہونے لگے۔ حالانکہ امیرا کدل سے جامع مسجد کے دروازے تک مجھ پر ایک طمانیت سی طاری رہی اور میں یہ خیال کر کے کہ یہ حادثہ عظیم ہماری جس تحریک حریت کی ابتدا ہوگا، اس کی انتہاء یقیناً بے حد شاندار ہوگی۔ مطمئن ہی رہنا چاہتا تھا۔ لیکن جامع مسجد میں پہنچ کر میں نے محسوس کیا کہ کوئی سنگ دل سے سنگ دل انسان بھی اس اندوہناک منظر کو دیکھ کر متاثر اور اشکبار ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

کشمیر کے مسلمان جب صبح کی نماز کے بعد مسجدوں میں درود وصلوٰۃ اور تسبیح وتہلیل پڑھتے ہیں تو کافر سے کافر انسان کا دل بھی پسیج جاتا ہے۔ پھر یہ تو

موت کا منظر تھا اور کشمیری مسلمانوں کو سو سال کے بعد پہلی مرتبہ ایسے بھیانک منظر سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اس لئے میں چند دوستوں کے ساتھ ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میر واعظ نے لوگوں سے خطاب کیا اور دعائے مغفرت اور تلاوت قرآن کریم کی تلقین کی۔ اس پر تمام مجمع خاموش ہوگیا۔ سارے ماحول پر موت کا سا سکوت چھا گیا۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس سکوت میں زندگی کم اور فنا کا عنصر زیادہ ہے۔ دن ڈھل رہا تھا۔ ایک طرف شہیدوں کی نعشیں اور دوسری طرف اُفق کے اداس اور مضمحل کندھوں پر سورج کا ڈوبنا دیکھ کر کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ ہر طرف کرب والم کے بسیط بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوائیں نہ تھیں، بیواؤں کی آہیں اور یتیموں کی دلدوز کراہیں تھیں۔ بچوں اور بوڑھوں کی متواتر چیخ وپکار سے عرش بریں تک لرزہ براندام نظر آرہا تھا۔ جوان اداس اور سرنگوں بیٹھے تھے۔ عورتیں اور بوڑھے خصوصاً شہیدوں کے اعزہ واقارب آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں مانگ رہے تھے۔ ان کی دعاؤں کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا رو رو کر، سسک سسک کر، بلک بلک کر پروردگار عالم کی بارگاہ اقدس میں دعائیں ہو رہی تھیں کہ

"بارالٰہا قاتلوں اور قاتلوں کے سرغنہ سے انتقام لے"

عبدالقدیر:۔

خطبہ عید کی بندش اور توہینِ قرآن مجید کے واقعات کے بعد سرینگر میں جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ جلسوں کا لگاتار سلسلہ جاری ہو چکا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ایک سیاح کے ساتھ اسکا خانساماں عبدالقدیر بھی سرینگر آیا ہوا تھا۔ وہ صوم وصلوٰۃ کی پابندی کے علاوہ کچھ سیاسی سُوجھ بُوجھ بھی رکھتا تھا۔ نماز جمعہ کے دوسرے مقامی مقررین کے بعد اس نے بھی جلسے میں ایک تقریر کی۔ اس کا طرزِ

تخاطب ہیجان خیز تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے بھی زیر دفعہ ۱۲۴ الف گرفتار کر لیا گیا اور سنٹرل جیل میں محبوس کر دیا گیا۔ اس کے مقدمہ کی سماعت جیل کے احاطہ ہی میں ہوا کرتی تھی۔ آج ۱۳ ر جولائی کو پھر اس کے مقدمہ کی سماعت ہو رہی تھی۔ مسلمانانِ کشمیر کو ایک غریب الدیار کے یوں پابند سلاسل ہو جانے کی وجہ سے اس کے ساتھ گوناں ہمدردی ہو گئی تھی۔ آج فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔ مسلمان ہزاروں کی تعداد میں جیل کے باہر جمع ہو گئے۔ سماعت کنندہ مجسٹریٹ جب جیل میں داخل ہوا تو اس نے جیل کے دروازہ کو اندر سے بند کر دینے کا حکم دیا۔ مسلمانوں نے تقاضا کیا کہ وہ بھی مقدمہ کی کاروائی سننا چاہتے ہیں۔ حکومت کے اہلکاروں اور مسلمانوں کے مابین تقاضا جاری رہا تو پولیس نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بھی واقعات کی اطلاع دی۔ وہ بھی فوراً موقع پر پہنچ گیا۔ لوگوں کو منتشر ہونے کیلئے کہا گیا۔ جب عوام نے اس کا کہا بھی نہ مانا تو ضابطہ فائرنگ کو ملحوظ رکھے بغیر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پولیس کو لوگوں پر گولی چلانے کا حکم دیدیا۔ آغازِ تحریک سے لے کر اب تک کی عوامی سرگرمیوں نے پولیس کا دماغی توازن برقرار نہیں رہنے دیا ہوا تھا۔ جانبداری کے جذبات پولیس میں بشدت پرورش پا رہے تھے۔ اس نے مجسٹریٹ کا اشارہ پاتے ہی اندھا دھند گولیاں مسلمانوں پر برسا دیں۔ مسلمان تیتر اور بیٹر کی طرح لوٹ پوٹ ہو کر گرے۔ قتل و خونریزی کا یہ نظارہ کچھ ایسا حوصلہ فرسا اور ہوش ربا صورت اختیار کر گیا کہ ہر ناظر لرزہ براندام ہو گیا۔ یوں معلوم ہونے لگا کہ خود ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی حواس باختہ ہو گیا ہے۔ وہ بوکھلاہٹ میں امتناعی حکم نہ دے سکا یا ممکن ہے اس نے عمداً ایسا کیا ہو۔ پولیس نے گولی اس وقت چلانا بند کی جب ان کی میگزینیں خالی ہو گئیں۔

حکومت نے بعد میں یوں اندھا دھند گولی چلانے کا جواز اس طرح

پیش کیا کہ "جب سماعت کنندہ مجسٹریٹ جیل کی ڈیوڑھی سے اندر داخل ہوا تو ہجوم بھی غیر آئینی طور پر جیل کے احاطہ میں داخل ہوگیا نقص امن کا احتمال تھا۔ اس لئے حکومت کو بحالت مجبوری یہ اقدام کرنا پڑا"

مگر یہ کہانی بعد میں تیار کی گئی تھی کیونکہ اگر ہجوم ہزاروں کی تعداد میں اور بقول حکومت "غیر آئینی" طور پر جیل کے اندر داخل ہو جاتا اور غیر آئینی حرکات شروع کر دیتا۔ تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پہنچنے سے پہلے جو جائے وقوع سے تین چار میل سے بھی زیادہ فاصلہ پر تھا جیل کا سارا اندرونی نظام درہم برہم ہو جاتا۔ علاوہ ازیں اگر بر سبیل بحث یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ہجوم جیل کے اندر داخل ہو چکا تھا تو پھر کئی مقتول اور مجروح احاطہ جیل کے اندر سے دستیاب ہونے چاہئے تھے۔ مگر بر عکس اسکے حکومت نے خود کئی بار یہ تسلیم کیا کہ گولی جیل کے احاطہ سے باہر چلائی گئی اور حقیقت یہ ہے کہ پولیس نے منتشر ہوتے ہوئے مسلمانوں پر اور پھر جیل کے بیرونی صحن سے باہر سڑک پر بھاگتے ہوئے لوگوں پر گولی چلائی۔

ہم تین دوست شام کے قریب جامع مسجد سے امیرا کدل کی طرف جا رہے تھے تاکہ دیگر نمائندوں کے ساتھ اس سانحہ کی روشنی میں مشورہ کر کے آئندہ لائحہ عمل مرتب کیا جائے جب ہم مہاراج گنج پہنچے جو سرینگر کی سب سے بڑی تجارتی منڈی ہے، تو یہ دیکھ کر ہمیں بہت دکھ ہوا کہ چند ہندوؤں کی دوکانیں جلائی جا چکی تھیں اور ان کا مال باہر سڑک پر پڑا ہوا تھا۔ جب ہم مہاراج گنج سے ذرا آگے بڑھے تو ہمیں معلوم ہوا کہ شہر فوج کے حوالے کر دیا گیا ہے اور عوام کی نقل و حرکت پر پابندی لگا دی گئی ہے۔

ڈوگرہ فوجیوں کا سلوک:۔

فوج تمام کی تمام ڈوگرہ ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ ایک مقام پر فوج کے کچھ سپاہیوں اور ادنیٰ عہدیداروں نے ہمیں روک لیا۔ کچھ دیر وہ ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورتے رہے۔ پھر تہذیب سوز گالیوں پر اتر آئے۔ ان میں سے شائد کوئی ہمیں پہنچانتا تھا۔ اس نے باقیوں کو بھی ہماری حیثیت سے آگاہ کردیا۔ پھر تو انہوں نے بہت پیچ وتاب کھائے۔ دشنام طرازی کے علاوہ انہیں یہ کہتے بھی سنا گیا کہ انہی غنڈوں اور بدمعاشوں کی وجہ سے ریاست کا امن تباہ ہوا اور ہندوؤں کو مالی نقصان پہنچا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ ان کا اسی جگہ خاتمہ کردیا جائے۔

تعصب کی بھی حد ہوتی ہے۔ ناکردہ گناہ شہیدوں اور مجروحین کے خونِ ناحق کا تو انہیں ذرا بھی افسوس نہ تھا۔ لیکن ہندوؤں کے معمولی نقصان کا وہ کیونکر ڈھنڈورہ پیٹ رہے تھے۔ ہم نے یہ باتیں سنیں، تو ہم نے محسوس کیا کہ ہماری جانوں کی خیر نہیں۔ اگر وحشی ڈوگرے جن کے منہ کو خون مسلم کی چاٹ لگ چکی تھی اپنے ارادوں کو اسی وقت عملی جامہ پہنادیتے تو ہم انکا کیا بگاڑ لیتے اور پھر وہاں تو کسی داد فریاد کا بھی کوئی محل نہ تھا۔ تاہم اس نازک موقعہ پر بھی ہم ذرا نہ گھبرائے اور خاموش کھڑے رہے۔ ان کے تیور لحہ بہ لحہ بدل رہے تھے۔ شائد ان میں سے ایک آدھ حملہ کی نیت بھی کرچکا تھا۔ کہ اسی وقت دو ہندو کپتان اور ایک میجر موقع پر آنکلے، ان میں سے ایک کے ساتھ میری معمولی صاحب سلامت تھی۔ ذمہ دار افسروں کو موقع پر پاکر ہم نے ذرا ترش لہجہ میں اپنی داستان انہیں سنائی۔ انہوں نے ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے ہمیں ٹوکنے والے پہرہ داروں کو کافی ڈانٹ ڈپٹ کی، چونکہ ہمیں اپنے مسکن پر پہنچنے تک تین چار میل کا سفر پیدل طے

کرنا تھا اس لئے ہماری خواہش پر انہوں نے دو سپاہی ہمارے ساتھ کر دئے۔ ہمارا ہاؤس بوٹ گاؤ کدل میں تھا، ہم تقریباً دس بجے رات کو وہاں پہنچے۔

میری پہلی گرفتاری:۔

اس ہاؤس بوٹ میں ہم تین نمائندے ٹھہرے ہوئے تھے۔ قاضی گوہر رحمان، ایم یعقوب علی کنٹریکٹر اور میں۔ چوتھے صاحب کہیں اور مہمان تھے۔ ہم رات کے بارہ بجے تک تبادلہ افکار میں مصروف رہے۔ صبح سویرے ہم نے جامع مسجد پہنچنے کا پروگرام بنایا اور پھر سو گئے۔ ابھی نیم خوابی کا عالم تھا کہ کمرے کے باہر پیروں کی آہٹ سنائی دی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پولیس ہماری گرفتاری کے لئے باہر کھڑی ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو مطلع کیا۔ ہم نے اپنے سامان کو جلد جلد سمیٹا اور سب سے پہلے میں نے باہر آ کر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

ہم تین آدمیوں کی گرفتاری کا منظر قابل دید تھا۔ انسپکٹر جنرل پولیس، ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس، ایک سپرانٹنڈنٹ، دو اسسٹنٹ سپریٹنڈنٹ، چار انسپکٹر، کئی ادنیٰ عہدیدار اور سب انسپکٹر اور بے شمار کانسٹبل بندوقیں تانے اور پستول لٹکائے ہوئے تھے۔ حالانکہ کرفیو نافذ تھا۔ سارا شہر فوج کے تسلط میں تھا۔ اندھیری رات کا سماں، انسان یا کسی جاندار کی آہٹ تو در کنار ہوا کی سرسراہٹ بھی سنائی نہ دیتی تھی لیکن حکومت کی غیر مآل اندیشی اور گھبراہٹ کا یہ عالم کہ ہم تین اور صرف تین آدمیوں کی گرفتاری کے لئے پولیس کے اعلیٰ و ادنیٰ افسروں اور سپاہیوں کا اتنا بڑا لاؤ لشکر آیا ہوا تھا۔

انسپکٹر جنرل پولیس نے اظہارِ معذرت کے ساتھ مجھ سے کہا کہ ہمیں حکم ہے کہ آپکو ہتھکڑی لگا کر لے جایا جائے۔ میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

میں حیران ہوں مجھ میں کسی خوف وہراس کی بجائے بیبا کی کہاں سے آ گئی تھی۔ مجھے ہتھکڑی پہنا دی گئی۔ چند ثانیے بعد میرے ساتھی بھی باہر آ گئے اور انہیں بھی میری طرح زنجیروں میں باندھ دیا گیا۔ مجھے گرفتار ہونے سے پیشتر جب یہ احساس ہوا کہ میرا امتحان لیا جا رہا ہے تو میرے احساسات اور جذبات میں ایک حیات انگیز ہیجان پیدا ہو گیا۔ میرے رگ وپے میں مسرت وشادمانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اطمینانِ قلب اور تسکینِ روح کی وہ کیفیت تھی کہ دل ہی دل میں بارگاہ رب العزت میں سر بسجود ہو رہا تھا کیونکہ اپنی گرفتاری کو میں قوم کیلئے عموماً اور اپنی ذات کیلئے خصوصاً باعثِ فخر و مباہات سمجھتا تھا۔ ابتدائے تحریک سے آج تک میری سیاسی زندگی میں بعض واقعات ایسے ہوئے ہیں، جن کی یاد اب بھی میرے دل محزوں اور پرُ افکار کو چند لمحوں کیلئے مطمئن اور مسرور کر دیتی ہے۔ ان ہی واقعات میں سے ایک میری پہلی گرفتاری واقعہ بھی ہے۔ اور میں بے ساختہ خدائے لایزال کا شکر بجالاتا ہوں کہ تحریک کشمیر کے آغاز سے ہی میدان ہموار کرنے اور فضا کو سازگار بنانے میں مجھے سب سے زیادہ اور سب سے پہلے حصہ بخشا گیا۔ مجھے فخر ہے کہ اقتصادی پریشانیوں کے ہجوم اور افراط وتفریط کے باوجود میرا دامن عزم وارادہ یاس و ناامید کے دھبوں سے داغ دار نہیں ہوا۔ نامساعد اور مایوس کن حالات کے تسلسل کے باوجود میں نے اپنے گنتی کے چند رفیقوں کے ساتھ ریاست کشمیر میں پاکستان کے علم کو بلند کیا، اور ریاست کے بتیس لاکھ مسلمانوں میں میں پہلا فرد حقیر تھا (جسے قدرت نے یہ قبولیت اور امتیاز بخشا) کہ تحریک حریت کشمیر کا پہلا اسیر بنایا گیا۔

جامہ تلاشی اور فوجی حراست:۔

ہمیں پولیس وین میں بٹھا کر بادامی باغ چھاونی میں پہنچایا گیا۔ وہاں

ہماری تلاشی ہوئی۔ میری باری آخر میں آئی۔ میں نے تلاشی میں کوئی مزاحمت نہ کی اور کر بھی نہ سکتا تھا۔ تلاشی کنندہ فوج کا ایک ہندو راجپوت کپتان تھا۔ میری تلاشی کے دوران اس نے مجھے ترش لہجے میں بوٹ کھولنے کیلئے کہا۔ اس پر میں اپنے جذبات کو دبا نہ سکا اور میں نے صاف کہدیا کہ میں کھولنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔ تلاشی تم لے رہے ہو۔ اگر ضرورت ہے تو بوٹ کے تسمے تم خود کھول سکتے ہو۔ یہ کہہ کر میں نے اپنا ایک پاؤں اس کے آگے کر دیا۔ وہ غُصّہ سے آگ بگولہ ہو گیا۔ لیکن خون کے یہ گھونٹ اسے اس لئے پینے پڑے کہ انسپکٹر جنرل پولیس نے میرے حق میں مداخلت کر دی۔

پولیس کی واپسی کے بعد ہمیں تھوڑے عرصہ کیلئے وہاں ہی صحن میں ٹھہرالیا گیا۔ وہ کپتان واپس آیا اور چند سپاہیوں کی حراست میں ہم تینوں کو کوارٹر گارڈ کے کمرہ میں بند کر دیا گیا۔ یہ کمرہ جنگی ملزموں کیلئے مختص ہوتا ہے۔ کمرہ چھوٹا سا تھا لیکن شائد میری گستاخی کا انتقام مقصود تھا کہ اس کمرہ میں ہمیں بستر وغیرہ مہیا نہ کیا گیا اور انتہا یہ کہ رفع حاجت کیلئے صرف ٹین کا ایک بڑا کنستر کمرہ کے درمیان رکھ دیا گیا۔ وہی کنستر جو خاکروب گندگی اٹھانے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی گندگی میں لت پت کر کے یہ کنستر وہاں رکھا گیا ہے۔ کپتان صاحب ہمیں کمرہ میں داخل کر کے فوراً ہی چلے گئے اور پہرہ دار نے بعد میں دروازہ کو قفل لگا دیا۔ ایک تو سردی کی شدت دوسرے تعفن اور بدبو سے کمرہ بھرا ہوا اور بیٹھنے کیلئے اینٹوں کا برف کی مانند ٹھنڈا فرش۔

آٹھواں باب

جیل خانہ اورعرضِ مطالبات

اسیری کے ابتدائی تجربات:۔

گھر سے میں نیا سُوٹ پہن کر اس زعم میں چلا تھا کہ آخر لیڈر ہوں۔ جیل بھی جانا پڑا تو کرسی، میز، چارپائیاں اور دیگر سامان آرائش وآسائش بہم پہنچایا جائے گا مگر یہاں تو صورت حال بالکل برعکس تھی۔ بدبُو نے چند لمحے کے اندر ہی ہمارے دماغوں کو چکرا دیا۔ ہم طائرِ قفس کی طرح بے دست و پا تھے۔ پہرہ دار کو بہت کچھ کہا لیکن اس نے سنی ان سنی کردی۔ ہم ابھی تک کمرے کے وسط میں کھڑے تھے، مجھے رہ رہ کر اپنی پتلون کی شکنوں کا خیال آتا تھا لیکن جب کوئی چارہ ہی نہ رہا تو طوعاً و کرہاً میں نے اپنے سُوٹ سے فرش خشت کو نوازا۔ میرے ساتھی بھی بیٹھ گئے، سر جوڑ کر سوچنے میں مصروف ہوئے۔ لیکن سوچتے کیا، جب امید کے تمام رِشتے ٹوٹ چکے تو میں نے محفل کو ذرا گرمانے کیلئے زور زور سے قہقہے لگانے شروع کردئے۔ اور پھر عالمِ وارفتگی میں اتنا ہنسا اتنا ہنسا کہ میرے دوست مجھے پاگل کہہ کر پکارنے لگے۔ لیکن ہنسی سب سے زیادہ متعدی مرض ہے۔ آخر کار وہ بھی اس مرض کا شکار ہو گئے۔ رات جوں توں کر کے بسر کی صبح رفع حاجت کیلئے دروازہ کھلا تو مجھے ہتھکڑی لگائی گئی اور باہر لے جایا گیا۔ ہتھکڑی کے سرے پر سپاہی نے قریباً پانچ گز لمبا

رسہ بھی باندھا ہوا تھا اور کوارٹر کے باہر کوئی دس قدم کے فاصلہ پر ایک درخت کے نیچے مجھے رفع حاجت کیلئے کہا گیا۔ رسے کو سپاہی نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ ایک اور سپاہی کو دوسری سمت میں نگرانی پر مقرر کر دیا گیا تھا اس حالت میں رفعِ حاجت تو درکنار میں پیشاب کی حاجت سے بھی فارغ نہ ہو سکا۔ جہاں کھڑا تھا وہیں کا وہیں رہ گیا۔ سپاہیوں کو تہذیب اور انسانیت کا واسطہ دیا لیکن ایک تو وہ سپاہی ڈوگرہ راجپوت تھے دوسرے کل کے حادثہ سے ان کے تیور اور بھی بگڑ چکے تھے۔ ایک کریلا اور پھر نیم چڑھا۔ وہ ایک نہ مانے۔ اس لئے میں بغیر رفع حاجت کے واپس آ گیا اور کمرہ میں آ کر اپنے ساتھیوں کو یہ واقعہ سنایا۔ ایک ہم میں زیادہ معمر تھے۔ انہیں رفع حاجت کی اتنی جلدی بھی نہ تھی اور دوسرے دوست کی عادتِ ثانیہ تھی کہ جائے ضرورت میں بھی حقہ ہمراہ لے جاتے اور گھنٹوں وہاں حقہ گڑگڑاتے جب کہیں رفع حاجت ہوتی۔ دونوں یہ صورت دیکھ کر اس معاملہ کو ٹال گئے۔ صبح کے دس بجے دربان نے دروازہ کھولا اور ایک زنگ خوردہ آہنی طشتری میں کھانا اور ایک میلے کچیلے بوسیدہ ڈبہ میں پانی لا کر کمرے کے اندر رکھ دیا اور خود دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ یہ کھانا ہم سیاسی قیدیوں کیلئے لایا گیا تھا۔ چونکہ پورے چوبیس گھنٹہ سے ہم نے کچھ کھایا پیا نہ تھا۔ بھوک تڑپا رہی تھی۔ لیکن ایک تو کھانے کے برتنوں اور خود کھانے کی حیثیت دوسرے بدبودار کنستر کی موجودگی۔ یہ سب کچھ ہمارے لئے سوہانِ روح بن رہا تھا۔ ہم نے اس وقت بھی کنستر اٹھانے کیلئے بہت کہا۔ مگر یہ سب کچھ تو بالا رادہ ہو رہا تھا۔ ہماری سنتا کون؟

قلعه هری پربت میں :-

ہماری گرفتاری کے پورے بارہ گھنٹے بعد دوپہر کے وقت شیخ محمد عبداللہ

کو بھی جامع مسجد میں جب کہ وہ میر واعظ کی معیت میں شہیدوں کی نعشوں کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے گرفتار کرلیا گیا، اسکے کچھ دیر بعد دو اور اشخاص بھی گرفتار کر کے چھاونی میں لائے گئے۔ لیکن انہیں ہم سے دور کسی اور کال کوٹھری میں رکھا گیا۔ تیسرے دن رات کے دس بجے ہم تینوں کو کوارٹر گارڑ کے کمرہ سے نکالا گیا ہمارے ہاتھ پشت پر ہتھکڑیوں میں جکڑ دئے گئے اور لاری میں سوار کرایا گیا۔ اسی دوران شیخ محمد عبداللہ بھی معہ پارٹی لاری میں سوا کرائے گئے اور لاری قلعہ ہری پربت کے نیچے جاکر رک گئی۔ رات انتہائی تاریک تھی۔ روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ قلعہ ہری پربت ایک خاصی اونچی پہاڑی پر واقع ہے اور وہاں تک پہنچنے کیلئے ایک تنگ و تار پگڈنڈی سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ بھی ان دنوں قلعہ کے عدمِ استعمال کے باعث نا قابل گذر ہو چکی تھی۔ رات کی تاریکی میں جب کہ ہمارے ہاتھ پشت کی جانب بندھے ہوئے تھے ہم کئی بار وہ پگڈنڈی طے کرتے ہوئے گرتے گرتے بچے۔ رات کے پورے بارہ بجے تھے جب ہم قلعہ میں پہنچے۔ وہاں ہم جموں کے تینوں نمائندوں کو ایک کمرہ میں اور سرینگر کے محبوسین کو دوسرے کمرہ میں بند کردیا گیا۔ کمرہ بالکل تیرہ و تار تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیتا تھا۔ چھت اتنی نیچی تھی کہ ذرا انگڑائی لی تو ہاتھ چھت سے جا ٹکرائے۔ یہاں بھی وہی کیفیت تھی جس سے ہمیں بادامی باغ میں سابقہ پڑا تھا۔ نہ بستر، نہ روشنی، ہم اسیران حریت کو یقین ہو گیا کہ صدیوں کے بعد یہ کمرے آج اس لئے کھولے گئے ہیں کہ ہم یہاں گل سڑ کر مر جائیں اور آزادی کی روح کچلی جاسکے۔

ان کمروں میں دریچہ یا روشندان تک نہ تھا۔ آمد و رفت کیلئے صرف ایک دروازہ تھا۔ صبح کے وقت جب دروازہ کھولا گیا تو ہم نے کمرے کا بغور

جائزہ لیا۔ کمرے کی اندرونی کیفیت سے کلیجہ منہ کو آنے لگا لیکن ان تمام تکالیف کے باوجود میرا اطمینانِ قلب اور روحانی مسرت بڑھتی جارہی تھی۔ آج پھر ہمیں رفع حاجت کیلئے کل والے طریقے پر ہی کمرے سے باہر لے جایا گیا۔ لیکن اتنا تھا کہ قلعہ کے ارد گرد جھاڑیوں اور تنہائی تھی عوام کشمیر مستبد حکومت کے خلاف سینہ سپر ہونے کے طور طریقوں سے ہنوز بیگانہ محض تھے۔ البتہ کسی قوم کی نشاۃ ثانیہ کے عمل میں جب بیداری پیدا ہو تو شہادت سب سے بڑی قربانی کا مقام حاصل کرتی ہے۔ سرینگر کا واقعہ شہادت ہماری اس بیداری کا پیش خیمہ تھا۔ قاعدہ ہے کہ اگر کوئی جابرانہ نظام کسی قوم کی معمولی قربانی کو معمولی سمجھ کر ٹس سے مس نہ ہو تو قوم اس سے بھی زیادہ قربانی دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ قوموں کے جذبات میں تحرک پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ طوفان سے ٹکرا جانے کا تہیہ کر لیتی ہے۔ وہ ہر جابر اور غیر ذمہ دار نظام حکومت کو اپنی بیداری کے سیلاب کے ساتھ خس و خاشاک کی طرح بہا لے جانے پر مستعد ہو جاتی ہے۔

سرینگر کے مسلمان اپنی آئندہ تعمیر اور نجات کیلئے شدید نوعیت کی قربانی دے چکے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ ایسا آناً فاناً ہوا کہ وہ یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ ان کا آئندہ پروگرام کیا ہونا چاہئے۔ جن لوگوں سے وہ رہنمائی کی توقع رکھ سکتے تھے یعنی ہم لوگ، حکومت نے گولی چلنے کے سانحہ کے فوراً بعد ہمیں نظر بند کر لیا تھا۔ تاہم عوام کا شعور و احساس بیداری کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ جب تک ہم نظر بند رہے عوام نے ہڑتال کر دی اور ہر قسم کا کاروبار بند کر دیا۔ عوام کی ہڑتال ہماری رہائی کے دن تک پوری کامیابی کے ساتھ جاری رہی۔ کشمیری عوام کا یہ اقدام اتنا مستقل اور قوی تھا کہ اس نے ہندوستان بھر کی سابقہ تمام ہڑتالوں کا ریکارڈ مات کر دیا۔

راجہ ہری کشن کول وزارت کی مسند پر:۔

ہماری گرفتاری کے بعد مسٹر ویکفیلڈ نہایت بے آبروئی کے ساتھ ریاست سے چلا گیا تھا۔اب ریاست کا وزیر اعظم راجہ ہری کشن کول مقرر ہوا۔اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ریاست کی اس تحریک کو تین ماہ کے اندر اندر کچل کر رکھ دے گا لیکن راجہ جی کے مسند وزارت سنبھالتے ہی ہڑتالوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔عوام کا جوش وخروش بڑھتا جا رہا تھا۔سرینگر میں ناکردہ گناہ مسلمانوں پر گولی چلنے اور ہماری گرفتاری کی وجہ سے عوام میں اِنتقامی جذبے پیدا ہونے لگے۔ادھر بیرونِ ریاست بھی مسلمانوں کا ہمدردانہ رویہ اور پروپیگنڈا ہماری پشت پر تھا۔ان تمام باتوں نے چند دنوں ہی میں راجہ جی کو لوہے کے چنے چبوا دیئے۔آخر تنگ آکر حکومت کے پاس ہماری رہائی کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا۔

رہائی کے فوراً بعد راجہ ہری کشن سے ہماری ملاقات ہوئی۔موضوع ملاقات حالات کو اعتدال پر لانا تھا۔اس سلسلہ میں اسکے ساتھ ہی ہماری کئی بار ملاقات ہوئی۔ہری کشن کول زمانہ ساز، متحمل مزاج، بردبار اور گہرے دل ودماغ کا تجربہ کار انسان تھا۔درحقیقت اُسے گُرگِ باراں دیدہ کہنا چاہیئے۔ جوانی کے ساتھ ساتھ میرے اندازِ گفتگو میں شوخی وطراری تھی۔اسلئے اس کے ساتھ مسلسل نوک جھونک رہی۔چنانچہ ایک مرتبہ نوک جھونک سے تنگ آکر اور غالباً پہلی بار ماتھے پر شکن ڈال کر اس نے مجھ سے کہا۔"چودھری ابھی آپ جوان ہیں۔اور آپ کی رگوں میں گرم گرم خون تیزی سے دوڑ رہا ہے۔جبکہ یہ خون ذرا سرد پڑ جائے گا تو پھر آپ صحیح قومی کارکن بنیں گے"۔

اگرچہ اس وقت راجہ جی کی یہ بات مجھے ناگوار معلوم ہوئی تھی لیکن تجربہ نے بتلایا کہ جو کچھ اس نے کہا سچ تھا۔

حکومت سے ہمارا عارضی سمجھوتہ :۔

ان ملاقاتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت اور مسلمانوں کے نمائندوں کے درمیان باقاعدہ دو فریقوں کی حیثیت سے ایک عارضی سمجھوتہ ہو گیا۔ سمجھوتے کی شرائط چھپوا کر ساری ریاست میں تقسیم کی گئی۔ ہمارے نزدیک حکومت کے خلاف یہ ہماری پہلی فتح تھی۔ کیونکہ اس سمجھوتہ کے ذریعہ مہاراجہ ہری سنگھ اور وزیراعظم ہری کشن نے اپنے مقابلہ پر ہماری حیثیت ایک باوقار فریق کے طور پر تسلیم کر لی تھی۔ ویسے بھی سمجھوتہ کی شرائط ہمارے لئے آبرومندانہ تھیں۔ سمجھوتہ کی شرائط عام لوگوں کو سمجھانے اور ان سے ان کی تصدیق کرانے کیلئے سرینگر میں ایک جلسہ کا انعقاد ہوا۔

رہائی کے بعد ہمارا یہ پہلا پبلک جلسہ تھا۔ جلسہ میں پہلے تو شہدائے کشمیر کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا پھر حکومت اور ہمارے درمیان سمجھوتہ کے اعلان کا وقت آیا۔ شہر میں سمجھوتہ کی خبر سے صبح ہی سے چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھی۔ خود غرض لوگ عوام کو گمراہ کر رہے تھے۔ بعض نوجوان نیک نیتی سے چاہتے تھے کہ مکمل فتح کے سوا کسی قسم کا سمجھوتہ یا کاروائی خارج از بحث ہے۔ بعض نوجوان حاسد تھے، جو سرینگر میں شیخ محمد عبداللہ اور اسکے ساتھیوں کی مقبولیت اور شہرت کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ان لوگوں نے عوام کو یقین دلایا کہ ہم نے قوم کو فروخت کر ڈالا ہے۔ ان لوگوں نے ہمارے لئے عجیب قسم کی صورتحال پیدا کر دی۔ چونکہ آغاز تحریک کے بعد ہماری مخالفت کا یہ پہلا موقعہ تھا اس لئے ہم بھی کچھ گھبرا گئے۔ عوام کو مخاطب کرنے کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لینے کیلئے کوئی نمائندہ تیار نہ ہوتا تھا۔ آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ میرواعظ محمد یوسف عوام سے خطاب کریں۔ جونہی وہ کھڑے ہوئے ایک کونہ سے سمجھوتے کے خلاف آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ اجتماع کم وبیش ایک لاکھ کے قریب تھا۔ لیکن نمائندوں کی

شخصیت اور ہر دلعزیزی نے عوام کو سمجھوتہ کے رموز و نکات ذہن نشین کرنے میں بڑی مدد دی اور عوام مطمئن ہو کر گھروں کو واپس ہوئے۔

جموں میں جلسہ:۔

جموں میں بھی اسی نوعیت کے جلسہ کی ضرورت تھی ۔ چنانچہ تمام نمائندوں کی جانب سے متفقہ طور پر یہ کام میرے سپرد کیا گیا۔ جب میں جموں پہنچا تو وہاں کی فضا بھی مسموم تھی اور سرینگر کے سے حالات کا سامنا تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ جب میں جلسہ میں تقریر کرنے اٹھا تو کوئی مخالف آواز بلند نہ ہوئی۔ میرا ضمیر صاف تھا۔ میں نے جرأت اور دیانتداری سے اپنا نقطۂ نگاہ عوام کے سامنے پیش کیا۔ لوگ بغیر کسی مخالفت کے مطمئن ہو گئے، اور میرے خلاف نعروں کی نوبت نہ آئی ۔ اس واقعہ کو تقریباً سترہ سال گذر چکے ہیں اور اس سے مجھے ایک بات یاد آرہی ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ آج تک میں نے سینکڑوں نہیں ہزاروں دفعہ چھوٹے بڑے موافق و مخالف مجموں سے خطاب کیا ہوگا۔ لیکن میں یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آج تک ایک مجمع میں بھی مجھے ٹوکا نہیں گیا اور نہ میرے خلاف کوئی معمولی سا مظاہرہ ہی ہوا۔

اس سے پیشتر میں ابھی اچھی طرح تقریر بھی نہ کر سکتا تھا۔ اور حق تو یہ ہے کہ میں مقرر تھا بھی نہیں۔ دوران تقریر مجھے ہمیشہ احساسِ کمتری رہا کرتا تھا۔ لیکن اس دن کی کامیابی سے میرے اندر جذبہ خود اعتمادی پیدا ہو گیا۔

میری وہ کامیاب تقریر حالانکہ ایک معمولی واقعہ تھی لیکن اس واقعہ نے میری آئندہ سیاسی زندگی پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ زیادہ سے زیادہ ہجوم کو مخاطب کرنے کا اشتیاق بڑھنے لگا چنانچہ میں نے بیرون جات میں سیاسی نوعیت کے

دوروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

میمورنڈم کی تیاری :-

جموں کے مسلمانوں کا فیصلہ لے کر میں سرینگر پہنچا۔ وہاں ہم مطالبات کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ جب یہ میمورنڈم تیار ہو گیا تو راجہ ہری کشن تک اصالتاً پہنچانے کیلئے میں مامور ہوا۔ رات کے دس بجے میمورنڈم کی ایک نقل باخذ رسید اس کے سُپرد کر کے میں اپنی قیام گاہ پر واپس لوٹا۔ چند یوم کے بعد مہاراجہ کو یہ میمورنڈم اصالتاً پیش کرنے کی تاریخ اور وقت سے ہم کو آگاہ کیا گیا۔ میمورنڈم پوری محنت، توجہ اور دلچسپی سے تیار کیا گیا تھا۔ ہم میں چند ایک تجربہ کار بزرگ بھی تھے جو مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب و علل سے پوری طرح واقف تھے۔ علاوہ ازیں معاملہ فہم اور سیاسی اتار چڑھاؤ کو سمجھنے والے بھی تھے۔ میں اور شیخ محمد عبداللہ سیاسی عمل کے لحاظ سے ناتجربہ کار اور ابھی خام تھے۔ کوئی بحث چھڑ جاتی تھی تو ہم برابر حصہ لیتے لیکن ہمارے لئے کسی سیاسی بحث کا آغاز از خود کر دینا ابھی دقت طلب تھا۔ الغرض میمورنڈم میں مسلمانوں کی اخلاقی، ذہنی، معاشرتی، تعلیمی اور اقتصادی پستی کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہرایا گیا اور جو مسلمانوں کی فوری شکایات تھیں ان کے جلد از جلد ازِالہ کا مطالبہ کیا گیا۔

مہاراجہ سے ملاقات:-

اگست ۱۹۳۱ء کا مہینہ تھا۔ وقت مقررہ پر ہم مہاراجہ کے محل پر پہنچے۔ فراخ صحن میں ایک بڑے چنار کے درخت کے نیچے گیارہ کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ ایک افسر نے ہمیں وہاں بیٹھ جانے کیلئے کہا۔ ہمارے سامنے ایک کرسی خالی پڑی تھی۔ کافی دیر کے بعد مہاراجہ آیا اور پُر تمکنت انداز کے ساتھ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے خیال تھا کہ بتیس لاکھ مسلمانوں کے نمائندوں

کے ساتھ ان کا حکمران بخندہ پیشانی گفتگو کرے گا اور بے گناہوں پر جو پچھلے دنوں گولی چلائی گئی تھی اس کیلئے ابتداہی میں اظہار معذرت کرے گا لیکن اُس کے اِس طرزِ عمل کو دیکھ کر میری تمام قیاس آرائیوں پر پانی پھر گیا۔ ہم لوگ جہاں کھڑے تھے وہاں کھڑے کے کھڑے رہ گئے مجھے یاد ہے کہ تقریباً سب نے جھک کر سلام کیا۔ ہم سب کی کرسیاں ایک ہی قطار میں تھیں اور اتفاق سے میری نشست سب سے آخر میں تھی۔ میرے قریب ہی شیخ محمد عبداللہ تھے۔ کورنش وتسلیمات کا سلسلہ ہمارے بزرگ رفقاء کی جانب سے شروع ہو اور بعض احباب تو فرش بوس ہوکر تعظیم بجالائے۔ لیکن یہ عالم دیکھ کر میرا دل اور زیادہ متنفر اور روح بغاوت پر آمادہ ہوگئی۔ میں نے نہایت عمدہ رومی ٹوپی زیبِ سر کررکھی تھی۔ جب میرے سلام کی باری آئی تو میں نے اسی انداز بے نیازی اور نیم خشمگیں چہرہ کے ساتھ اپنا داہنا ہاتھ اٹھا کر سلام کردیا۔

میرا خیال تھا کہ سلام وتسلیم کے بعد آسودگی سے سب لوگ بیٹھ کر میمورنڈم کے متعلق بات چیت کریں گے لیکن ہمارے اعتدال پسند بزرگوں نے حکمران کے کارندوں سے مل کر ملاقات کا جو پروگرام مرتب کررکھا تھا وہ بے حد ذلت آمیز اور باعثِ توہین تھا۔ ہم ابھی کھڑے ہی تھے کہ ہمارے محترم بزرگ خواجہ سعدالدین شال جنکی آجتک میرے دل میں عزت ہے نے اردو میں میمورنڈم پڑھنا شروع کردیا۔ جب میمورنڈم ختم ہوگیا تو مہاراجہ اُٹھ کے چپکے سے اپنے محل کی طرف چل دیا۔

مجھے یہ شبہ ہوا کہ وہ ضرور کسی وجہ سے روٹھ کر چلا گیا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت یہی تھی۔ شخصی حکمرانوں کی شان بھی تو یہی ہوا کرتی ہے۔ تعظیم و

آداب کے اصول کی خلاف ورزی اور ہمارا اس طرح اظہارِ مدعا گستاخانہ سمجھا گیا۔

ملاقات کا ردِعمل:۔

مہاراجہ سے ملاقات کا مقصد تو یہ تھا کہ ہماری شکایات کا ازالہ ہو۔ ہم سے انصاف کیا جائے لیکن محل کی بظاہر خوشگوار مگر بباطن مسموم فضا، سوگوار ماحول، اکڑی اور تنی ہوئی گردنیں، کھچی اور سکڑی ہوئی پیشانیاں! حکمران اور رعایا کے نمائندوں کے درمیان ابھی اس مصنوعی اور غیر فطری حفظِ مراتب سے یہ اندازہ لگ سکتا تھا کہ حکمران کو اپنی رعایا سے یہ جائز شکایات بھی سننا گوارا نہیں۔ اسی روز مجھے قطعی طور پر یقین ہوگیا کہ ہاتھوں میں کاسہ گدائی لے کر منت سماجت کر کے قوم کو منزلِ مقصود کی طرف بڑھایا نہیں جاسکتا۔ آزادی جیسی بیش قیمت نعمت دریوزہ گری سے نہیں لی جاتی۔ بزورِ بازو حاصل ہوگی۔

جب ہم ملاقات کر کے باہر آئے تو میں نے نمائندوں پر ملاقات کے ردِعمل کا جائزہ لیا۔ بوڑھے اور اعتدال پسند لیڈر بظاہر مطمئن تھے کہ قوم کا فرض بھی بجالایا گیا اور مہاراجہ کے درشن بھی ہوگئے۔ کچھ ایسے تھے جو سمجھے کہ شائد اس ملاقات کے بعد ان کے دن پھر آئیں اور حکومت کے شعبوں میں انہیں نمایاں حیثیت مل جائے۔ میں قطعاً مایوس تھا کہ حالات اُمید افزا نہیں ہیں۔ حکمران نخوت و پندار کے نشہ میں سرشار ہے۔ اور استبداد اپنے جبڑے کھولے ہوئے۔ تاہم میں نے تہیہ کرلیا کہ جب تک جان میں جان ہے نخوت و پندار اور استبداد کا مقابلہ کئے جاؤں گا۔

ہم گیارہ نمائندوں میں سے بعض آنے والے دور میں سرکار پرست ہوگئے اور کچھ مجبوریوں کی بِنا پر سیاست سے دست بردار۔ بعض داعی اجل کو لبیک کہہ کر ہمیں ہمیشہ کیلئے داغِ مفارقت دے گئے۔ صرف میں اور شیخ محمد عبداللہ اپنی عملی زندگی میں

مصرف تنگ و دور ہے۔ یا اپنے مخصوص انداز میں تھوڑا بہت میر واعظ کشمیر۔

اس رسمی ملاقات سے قبل بھی ایک بار ہم مہاراجہ سے مل چکے تھے۔ مگر اس ملاقات کا مقصد ظلم کی تحقیقات اور تلافی تھا۔ آہ! ہم کتنے سادہ مزاج اور خوش فہم تھے۔ مجرموں اور قاتلوں کے سامنے شکوہ بیداد، گلہ جور و ستم اور انصاف کیلئے دست سوال دراز کرنا! ایسے مجرم کو خواہی نخواہی منصف قرار دینا جس کی کتاب قانون میں انصاف کا نام تک موجود نہ ہو اور اس سے انصاف کی اُمید رکھنا انتہائے سادگی نہیں تو اور کیا ہے۔ ہم پھر بھی خیال کر رہے تھے کہ انصاف کے داعی مہاراجہ نے اپنی رعایا کا خون ناحق برداشت نہ کیا ہوگا۔ وہ غم والم کے جذبات میں ڈوبا ہوا ہوگا اور فی الحال زبانی ہمدردی سے ہی مسلمانوں کے تازہ زخموں پر تسکین کا پھاہا رکھے گا۔ مگر ہمارا خیال محض خیال ہی نکلا۔ انسانی خاصہ ہے کہ دوسروں کے متعلق بھی ایک انسان اپنے جذبات خوشی و غم کے ردِعمل کی روشنی میں فیصلہ صادر کرنے کا خوگر ہے۔ حالانکہ ایسے فیصلے اکثر غلط ہوا کرتے ہیں۔ مہاراجہ کے ساتھ ہماری اس ملاقات کے بعد بھی میرے تاثرات یہی تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شہدا اور مجروحین سے ہمدردی کے طور پر یہی تلافی کافی سمجھی گئی کہ ہمیں قصرِ شاہی میں آ کر میمورنڈم پیش کرنے کی اجازت دی گئی۔

ہماری تحریری فریاد سُن لینے کے بعد مکمل عالمِ سکوت میں دربار برخاست ہو گیا۔ اور ہم ایک دوسرے کو تکتے ہوئے اپنا سامنہ لے کر واپس آ گئے۔

نواں باب

تحریکِ کشمیر اور گلانسی کمیشن

جموں کا پہلا فرقہ وار فساد:۔

ان دو ملاقاتوں کے درمیانی عرصہ میں حکومت نے مسلمانان جموں کی سیاسی بیداری کو ختم کر دینے کیلئے ہندوؤں کو اُبھارنا شروع کر دیا۔ منافرت انگیزی اور فتنہ وفساد میں ہندوؤں کو حصہ گیر بنانے میں عمال حکومت کا زبردست ہاتھ رہا۔ چنانچہ ۱۷ کاتک ۸۸ بمطابق ۳ نومبر ۱۹۳۱ء جموں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پولیس کی موجودگی میں شدید تصادم رونما ہوا۔ اس فساد سے پہلے مسلمانوں کے وفود نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کو خطرہ سے آگاہ کر دیا تھا۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کے فہمیدہ طبقہ اور وکلاء کا وفد بھی ان افسروں سے قبل از فساد مل چکا تھا۔ لیکن حکام کی نیت میں خود ہی فتور آ چکا تھا۔ انہوں نے آئیں بائیں شائیں کر کے ہر دو اقوام کے وفود کو ٹال دیا۔ فساد ہوا۔ سات مسلمان شہید ہو گئے۔ مجروحین کی بھی بڑی تعداد تھی۔ ۔فساد کے بعد تحقیقات کیلئے مڈلٹن کی زیر سرکردگی ایک کمیشن کا تقرر عمل میں لایا گیا اور ساتھ ہمارے مطالبات کے میمورنڈم پر حکومت نے از خود ایک اور کمیشن مقرر کر دیا۔ جس کی قیادت سر دلال کو تفویض ہوئی۔ مسلمانوں نے اس کمیشن کا مقاطعہ کیا۔ دلال کمیشن کی رپورٹ نے اور بھی جلتی پر تیل کا کام کیا۔ جموں اور سرینگر میں کمیشن کا جنازہ نکالا گیا اور جلسے اور جلوسوں کے ذریعہ حکومت کی سخت مذمت کی گئی۔ حکومت کے ساتھ عارضی سمجھوتہ اور میمورنڈم کے بعد ہم

حکومت کی کارروائیوں کا وقتِ نظر سے جائزہ لے رہے تھے۔ میں سری نگر سے جموں پہنچ گیا۔ وہاں مسلم ایسوسی ایشن مڈلٹن کمیشن کے رُو برو اپنا کیس پیش کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ آل انڈیا کشمیر کمیٹی نے دو ایڈووکیٹ مقدمہ کی پیروی کیلئے جموں بھیجے۔ جنہوں نے پوری دلچسپی اور انہماک سے دو ماہ تک یہ کام سرانجام دیا۔ مڈلٹن کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی مگر وہ بھی مسلمانوں کیلئے ایک درسِ عبرت بن گئی۔

بیرون ریاست کے مسلمانوں میں ہیجان واضطراب:۔

خطبہ عید کی بندش، توہینِ کلام پاک، سرینگر میں ۱۳ رجولائی کو مسلمانوں پر فائرنگ، ہماری نظر بندی اور جموں میں فرقہ وارانہ فساد، یہ واقعات کچھ ایسے پیہم اور مسلسل ظہور میں آئے جن کی وجہ سے ریاست بھر کے مسلمانوں میں بیداری، انتقام، جوش اور قربانی کے جذبات ابھرنے لگے۔ ان واقعات کی وجہ سے دوسری طرف مسلمانانِ پنجاب کی قومی غیرت اور ملی حمیت جوش میں آ گئی۔ انہوں نے مظلوم مسلمانانِ جموں وکشمیر سے عملی ہمدردی کا ثبوت بھی دینا شروع کر دیا۔ قومی جرائد بھی اس ہمدردی میں بیش از بیش مصروف عمل نظر آنے لگے۔ روزنامہ "انقلاب" لاہور متواتر ہماری داستانِ مظلومیت کی تشہیر کر رہا تھا اور اپنے پُر از دلائل مقالات سے ہندوستان کی رائے عامہ کو ہمارے حق میں ہموار کر چکا تھا۔

حضرت علامہ اقبال مرحوم ومغفور اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی مظلومین کشمیر کی امداد کیلئے میدان عمل میں آ چکے تھے۔ مجلسِ احرار اسلام نے کئی ہزار کی تعداد میں پنجابی مسلمانوں کو جتھوں کی شکل میں مظلومینِ کشمیر کی امداد کیلئے ریاست کی حدود میں داخل کر دیا۔ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی معرفت ہماری شکایات سمندر پار کے ممالک میں بھی زبان زد ہر خاص وعام ہو گئیں۔ اس نزاکت حال کے پیشِ

نظر حکومت کشمیر کیلئے ہماری شکایات کو ٹالنا اور بزورِ طاقت عوامی محرّکات کو بلا فکر نتائج کچلتے چلے جانا مشکل ہوگیا۔ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے پیہم اِصرار کے باعث حکومتِ ہند کا معاملاتِ کشمیر میں دخل انداز ہونا ناگزیر ہوگیا۔ کشمیر کی سرحدات چین روس جیسے اشتراکی ممالک سے ملتی ہیں۔ لہٰذا اپنی فوجی اہمیت اور بین الاقوامی معاملات کے نقطہ نظر سے بھی یہ ضروری ہوگیا کہ انگریز ریاست کے معاملات میں ضروری دخل دے۔ نومبر ۳۱ء کے آخری دنوں میں حکومت کشمیر کو مجبوراً مسلمانانِ ریاست کی شکایات اور مطالبات کی تحقیقات کیلئے ایک آزاد کمیشن کا اعلان کرنا پڑا۔ یقین غالب ہے کہ اس کمیشن کے تقرر میں حکومت ہند کا بھی زبردست دخل تھا۔

گلانسی کمیشن کا تقرر:۔

اس آزاد کمیشن کا چیرمین سر برٹرینڈ گلانسی مقرر ہوا جو بعد میں پنجاب کا گورنر بھی رہا۔ ریاست سے چار نمائندے بطور رکن اس کمیشن کیلئے منتخب کئے گئے۔ جن میں سے دو ہندو تھے اور دو مسلمان۔ ان کا اِنتخاب سیاسی پارٹیوں کی آزاد رائے کے مطابق ہوا۔ مسلمانوں کی طرف سے ایک رُکن مجھے منتخب کیا گیا۔ حکومت نے کمیشن کے کام اور اس کے دائرہ کار کے متعلق اعلان کر دیا تھا۔ اس کے دائرہ عمل سے کوئی چیز بھی باہر نہ رکھی گئی تھی۔ یہ کمیشن اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہر طرح آزاد اور سرکاری وغیر سرکاری معاملات کی تحقیق وتصفیہ کا ہر طرح مجاز تھا۔ کونسل سے لے کر ادنیٰ درجہ کے افسروں تک کے نام احکام جاری کر دیئے گئے تھے کہ نہ صرف وہ کمیشن کے ساتھ تعاون کریں بلکہ اس کے ہر مطالبہ اور محاسبہ کی بھی فوری تعمیل کریں۔

عوام اور عوامی جماعتوں کو تقریباً دو تین ہفتہ کی مہلت دی گئی کہ وہ اپنا اپنا

زاویہ نگاہ اور شکایات کمیشن کے روبرو پیش کریں۔ نومبر ۱۹۳۱ء میں کمیشن نے سرینگر میں اپنا کام شروع کیا۔ ابھی دو ہفتے گزرے ہوں گے کہ صوبہ جموں کے ہندوؤں نے کمیشن سے مقاطعہ کا اعلان کردیا۔ کمیشن کا ہندو رکن بھی مجبوراً مستعفی ہوگیا۔ دسمبر کے آخر تک کام جاری رہا۔ عوام کی جانب سے مطالبات پیش ہوتے رہے۔

جمھور کی جانب سے کمیشن کی رکنیت:۔

جس روز مجھے کمیشن کا رکن منتخب کیا گیا۔ میں بے حد مسرور اور مطمئن تھا۔ اس وجہ سے نہیں کمیشن کی رکنیت سے میری ذاتی حیثیت بڑھ گئی تھی بلکہ اس لئے کہ بزعم خود میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اپنی قانون دانی کی بناء پر میں یہ فرض بخوبی انجام دے سکوں گا۔ چنانچہ کمیشن کے پہلے روز میں بڑے طمطراق سے کمیشن کے کمرہ میں داخل ہوا۔ مجھے یہ بھی گھمنڈ تھا کہ میں مسلمانوں کا لیڈر ہوں اسلئے کمیشن میری شخصیت کو بھی ملحوظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کے مطالبات کو انصاف کی عینک سے دیکھے گا۔ مجھے اپنی ذاتی قابلیت کا گھمنڈ اسلئے بھی تھا کہ مختلف ممالک کے دساتیر اساسی کی ضخیم کتابیں میری نظر سے گزر چکی تھیں۔ اسلئے یہ بات میرا حوصلہ بلند کئے ہوئے تھی۔ لیکن جونہی کمیشن کی کاروائی شروع ہوئی اور بحث و جرح کا انوکھا انداز دیکھنے میں آیا، میرا سارا کتابی علم کمیشن کے فرش پر پانی کی طرح بہہ گیا۔ ایک موقعہ پر میں نے لب کشائی کی تو کمیشن کے چیرمین نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ یہ غیر متعلقہ بات ہے۔ اس کے اس طنز نے مجھ میں اوراحساسِ کمتری پیدا کردیا۔ مجھے غصہ بھی آیا کہ قوم کے ایک مقتدر لیڈر سے یہ سلوک! مگر وہ عوامی اسٹیج نہ تھا۔ کہ جو منہ میں آیا کہہ دیا ورسامعین کی طرف سے نعرہ تکبیر کی صورت میں موقعہ پر ہی دادِ تحسین مل گئی۔

یہاں پارلیمنٹری بات چیت اور آئین وضابطہ سے آگاہی درکار تھی ۔ احساسِ شکست کی وجہ سے اس روز میں نے کمیشن کی کاروائی میں بہت کم حصہ لیا بالآخر غور وخوض کے بعد میں نے تین فیصلے کئے ۔

ا ۔ کمیشن کی رکنیت سے مستعفی ہوجاؤں ۔

۲ ۔ دورانِ تحقیقات جا و بے جا ردو کد کا سلسلہ چھیڑ کر اپنا وقار قائم کروں

۳ ۔ خاموشی کے ساتھ کمیشن کی کاروائی کا جائزہ لیتا رہوں ۔

بظاہر ان تینوں فیصلوں میں سے کسی ایک کو بھی میرے لئے اپنانا مشکل ہو گیا تھا ۔ میں چوبیس گھنٹے اس شش و پنج میں رہا حتیٰ کہ دوسرا دن آگیا ۔ آج کا اِجلاس کھُلا تھا ۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ پہلے دونوں فیصلے غلط ہیں اور صرف تیسرا طرزِ عمل ہی بہتر رہے گا ۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ خاموشی سے حالات کا جائزہ لینا اور زیادہ مگر بے سود سمجھنے سے کم مگر پر منفعت سمجھنا زیادہ اچھا رہے گا ۔

دورانِ تحقیقات میں ہماری پریشانیاں :۔

آج کمیشن کے رُوبرو سب سے پہلے گواہ شیخ محمد عبداللہ پیش ہوئے ۔ مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے انہوں نے شکایات حسب دلخواہ پیش کیں ۔ صوبہ جموں کے ہندو ممبر نے اپنی عادت کے مطابق بے ربط ، بے مطلب اور غیر متعلقہ جرح شروع کردی ۔ اکبر اور اورنگ زیب کے متعلق سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا ۔ ایک تو پیش کردہ شکایت میں ہم نے اکبر اور اورنگ زیب کا ذکر تک نہیں کیا تھا ۔ دوسرے اگر اس خیال سے یہ تذکرہ کیا بھی ہوتا کہ اکبر اور اورنگ زیب کا وارث ہونے کے لحاظ سے کشمیر ہم کو واپس ملنا چاہئے تو بھی شیخ محمد عبداللہ سائنس کے طالب علم تھے ان کیلئے پھر بھی مصیبت تھی ۔ آخر

گلانسی صاحب نے کہا کہ یہ سوالات غیر متعلقہ ہیں لیکن سوالات کا اثر شیخ محمد پر ہو چکا تھا۔ اور وہ مزید جرح کیلئے تیار نہ تھے۔ چنانچہ ان کو جلد ہی فارغ کیا گیا۔ قصہ کوتاہ ایک لیڈر بہ حیثیت رکن کمیشن پریشان تھا تو دوسرا بطور گواہ۔

ہماری سیاست کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ رہا تھا۔ دراصل ہم بھی بچے تھے۔ کسی سیاسی مُلّا سے کبھی سبق لینے کا موقع ہی نہ مِلا تھا۔ تحریک حریت آناً فاناً آندھی کی طرح اٹھی۔ بگولے کی طرح اڑی، برسات کی گھٹا کی طرح چھائی اور ریاست کی سرزمین پر اولوں کی طرح برس پڑی۔ اس لئے ہمیں سیاست کی باریک بینیوں سے واقف ہونے کا موقع ہی کب ملا تھا۔

اس روز کی کاروائی سے میرے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ لیکن ہفتہ عشرہ کے بعد میں نے بھی اپنے پر پرزے سنبھال لئے اور میرا تمام حجاب دور ہو گیا۔ اب میں اپنے گواہوں کو لقمہ دینے اور مخالف گواہوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے قابل ہو چکا تھا۔ میں نے شروع میں ذکر کیا ہے کہ میں بچپن میں بہت شریر تھا اور تجربہ شاہد ہے کہ بالعموم شریر لڑکا چالاک ذہین اور حاضر جواب ہوا کرتا ہے۔ مجھ میں یہ اوصاف موجود تھے لیکن احساسِ کمتری کی وجہ سے دب گئے تھے جواب اجاگر ہو گئے۔ چنانچہ حالت یہ ہو گئی کہ کمیشن کیلئے میرے مشوروں کے بغیر کوئی قدم اٹھانا کافی مشکل ہو گیا اور لیڈری کا جو رعب اور دبدبہ باہر قائم تھا ایوان کمیشن بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔

دسمبر ۱۹۳۱ء کے آخری دن تک میں نے سرینگر میں کام کیا تھا کہ فوراً جموں پہنچنے کیلئے ایک ضروری تار مِلا۔ میں کمیشن کے صدر کو اطلاع دئے بغیر دوسرے دن جموں پہنچ گیا، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ تحریک احرار شروع ہو چکی ہے۔

احرار کی تحریک کا آغاز:۔

چند نوجوان احرار کے حامی تھے۔ انہوں نے مسلم ایسوسی ایشن پر دباؤ ڈالا کہ ریاست کے مسلمان احرار کی رِفاقت سے کام کریں۔ جماعت احرار کے لیڈروں اور بزرگوں سے جموں اور کشمیر کے مسلمانوں کو شدید اِختلافات تھے۔ یہ تحریک انہوں نے ہماری شدید مخالفت کے باوجود ایسے حالات میں شروع کی جو اسلامیانِ ریاست کی اس وقت کی سیاسی فضا کے لئے سازگار نہ تھی۔ کمیشن کے فیصلے کی طرف ہندوستان اور ریاست کے مسلمانوں کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں اور ہر معقول آدمی اس وقت کسی غیر آئینی کاروائی کو مفاد ملت کے خلاف ایک تخریبی حرکت تصور کرتا تھا۔ میری غیر حاضری میں مسلم ایسوسی ایشن کا کام ساغر صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے جماعت احرار کی تحریک کے ردِعمل کیلئے انفرادی سول نافرمانی کی اور پچاس کے قریب نوجوانوں کے ہمراہ قید ہو گئے۔ انہی دنوں میر پور میں تحریک عدم ادائے مالیہ کسی طے شدہ پروگرام اور مسلم نمائندگان ریاست سے مشورہ کئے بغیر شروع کردی گئی۔ میرے جموں پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد شیخ محمد عبداللہ کو حکومت نے بلاوجہ گرفتار کرلیا۔ ان حالات میں میرے سامنے سوال یہ تھا کہ آیا میں بھی گرفتار ہو جاؤں یا کمیشن کے ساتھ باقاعدہ تعاون جاری رکھوں۔ کشمیر ایسوسی ایشن نے تعاون کا فیصلہ کرلیا جموں کے دو تین خود غرض آدمیوں کے سوا جمہور کا تقاضا یہی تھا کہ کمیشن کے ساتھ تعاون ازبس ضروری ہے۔ اس ذہنی کشمکش میں مجھے جموں میں تین ہفتے تک ٹھہرنا پڑا۔ اس اثناء میں کمیشن اپنا کام سرینگر میں ختم کر کے جموں پہنچ گیا اور میں کمیشن میں شامل ہو گیا۔

کمیشن میں شمولیت کے حق میں میرے نزدیک ایک وجہ یہ تھی اور اسے میں ہی جانتا تھا کہ کمیشن کا رجحان مسلمانوں کی طرف ہے۔ اس میں شک نہیں

کہ گلانسی صاحب کسی زمانہ میں بحیثیت وزیر مالیات مہاراجہ کشمیر کے نمک خوار رہ چکے تھے۔ اسلئے حکومت کشمیر کو اپنی جگہ یقین تھا کہ ریاست کے اعلیٰ مفاد کو علانیہ نقصان نہ پہنچ سکے گا لیکن کمیشن کا تقرر حکومت ہند کے ایماء پر عمل میں آیا تھا اور حکومتِ ہند معاملات کشمیر میں مداخلت کرنے پر مجبور تھی۔ اس لئے ہمیں اپنی جگہ یقین تھا کہ کمیشن کے فیصلے ہمارے لئے آبرومندانہ ہوں گے۔

گلانسی بڑا عیار اور چالاک تھا۔ مہاراجہ کے ساتھ بھی اسکے گہرے مراسم تھے۔ لیکن انگریز کی دشمنی اور دوستی کا اعتبار ہی کیا۔ اس میں شک نہیں کہ ذاتی اور انفرادی اعتبار سے انگریز اچھا انسان ہے۔ لیکن قومی لحاظ سے دنیا میں اس جیسا ناقابل اعتماد شخص کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے یقین غالب تھا کہ گلانسی اپنے آقاؤں کے حکم کی تعمیل میں ضرور حکومت کشمیر کو جُل دے جائیگا۔

میرپور اور راجوری میں فرقہ وارانہ فسادات:۔

اس اثنا میں میرپور اور راجوری میں فرقہ وار صورتحال روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی۔ عدم ادائے مالیہ کی مہم تو ایک دن بھی نہ چل سکی اور یہ قبل از وقت احتیاط اور پیش بندی کے بغیر چل بھی کیسے سکتی تھی۔ اس کے برعکس وہاں فرقہ وارانہ فسادات کا افسوسناک سلسلہ شروع ہوگیا۔ ساہوکار ان علاقوں میں ایک مدت سے مسلمانوں کا لہُو چوس رہے تھے۔ بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار بھی مع اپنی غیر منقولہ املاک کے ساہوکاروں کے پاس عملاً رہن اور بیع ہو چکے تھے اور ان کے پنجۂ حرص و آز اور دستِ تطاول سے نکلنا مسلمانوں کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ اس تمام علاقہ کی مسلم آبادی عملاً کنگال اور قلاش ہو چکی تھی اور نانِ شبینہ تک کیلئے محتاج تھی۔ الغرض ان کا کھانا پینا، ان کا چلنا پھرنا، ان کی تمام زندگی ان شائیلاکوں کی مرہونِ منت تھی۔ ان کے ناروا سلوک کی وجہ سے

نفرت اور انتقام کا پھوڑا مسلمانوں کے دلوں میں اندر ہی اندر پک کر پھٹنے کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ ضرورت صرف ذرا سی نشتر زنی کی تھی۔ عدم ادائے مالیہ کی تحریک نے ان کو مہاجنوں اور ساہوکاروں کے خلاف صف آرا کر دیا تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو بے راہ رو اور بلا قیادت فوج کا ہوتا ہے۔ مکانوں اور بہی کھاتوں کو جلا کر مسلمان کے دل کی بھڑاس تو نکل گئی لیکن ہندو حکومت کو ساہوکاروں کی جائیداد کا اتلاف کب گوارا تھا۔ فوراً قانون نافذ کر دیا گیا کہ ساہوکار اگر زبانی شہادت سے ثابت کر دیں کہ واقعی ان کے حساب کی کتابیں جلائی گئیں ہیں تو اس پر بھی انکوڈگریاں مل جائیں گی۔

مسلمانوں پر مَظالم کی اِنتہا:۔

یہ قانون ان کیلئے نہایت سودمند تھا۔ خیر یہ تو معمولی بات تھی۔ زندہ دلانِ میر پور اور راجوری پر اس آڑ میں جو ستم توڑے گئے، ان کی یاد سے بدن کا رواں رواں کانپ اٹھتا ہے۔ تمام علاقہ میں ڈوگرہ فوج ٹڈی دل کی طرح پھیل گئی۔ کسی شخص کا کلمہ گو ہونا ہی ڈوگرہ سپاہیوں کیلئے کافی تھا۔ سینکڑوں مسلمان جن میں اکثر بے گناہ تھے۔ حکومت کی مشین گنوں اور رائفلوں سے موت کے گھاٹ اتار دئے گئے۔ اور اس پر ضمیر، اخلاق اور جرات کی یہ پستی کہ سینکڑوں شہدا کی بے گور و کفن لاشوں کو جلا دیا گیا تاکہ بیرونی دنیا شہدا کی صحیح تعداد سے لاعلم رہے۔ لیکن نشہ طاقت کے یہ متوالے اور مسلمانوں کے خون کے پیاسے یہ محسوس نہ کر سکے کہ چشم انسان دیکھے نہ دیکھے، اس سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ خدائے قہار و جبار کی ذات یہ سب خونیں مناظر اپنی آنکھ سے دیکھ رہی تھی اور خونِ ناحق کا بدلہ لینے کا اٹل فیصلہ کر چکی تھی۔ قدرت نے یہ بدلہ قاتلوں کے سرغنہ کی موت سے نہیں چکایا۔ اسطرح چند منٹ کی عارضی جسمانی اذیت کے بعد دوامی طور پر

نجات پالیتے، قدرت نے اسکے برعکس یہ کیا کہ قاتلوں کو ان کی زندگی ہی میں ایک ایک لمحہ کے بعد روحانی تکلیف سے ہمکنار کر دیا۔ ان کی روحیں، بدامنی، بے اطمینانی، گھبراہٹ اور مایوسی کے چرکے کھا کھا کر ہر روز مجروح ہوتی رہی ہیں۔ مکافاتِ عمل کا قانون پورے غم و غصہ سے انکے خلاف مصروف عمل ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک تمام شہدائے کشمیر کے مقدس خون کی ایک ایک بُوند کا حساب بے باق نہیں ہو جاتا یا ان لوگوں کی ناپاک روحیں انکے غلیظ و ناپاک جسود چھوڑ کر نہیں جاتیں۔

الغرض مسلمانانِ میر پور اور راجوری کی داستانِ مظلومیت اتنی طویل اور اتنی دلدوز ہے کہ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو موقع پر موجود تھے یا جن پر یہ سب کچھ بیتی۔ اس تحریک کا نتیجہ اور تو کیا ہوتا یہ افسوسناک انجام ضرور ہوا کہ وہاں کا بہادر اور بے باک مسلمان آئندہ چند اور برسوں کیلئے ظلم وتشدد کے بوجھ تلے دب گیا۔

عدم ادائے مالیہ کی تحریک اور راجہ ہری کشن کول :۔

کوئی مانے یا نہ مانے مجھے پورا یقین ہے کہ عدم مالیہ کی تحریک ہری کشن کول کے ایماء سے شروع ہوئی اور اس کے اپنے رشتہ دار اور پرائیویٹ سیکرٹری جیون لال مٹو کا راجہ ہری کشن کول کے ایجنٹ کی حیثیت سے اس میں براہ راست دخل تھا۔

سرینگر میں امن تھا۔ شیخ محمد عبداللہ کو حکومت نے یہ یقین دلانے پر کہ ان کا تحریک میر پور سے قطعاً کوئی تعلق نہیں جیل سے قبل از وقت ہی رہا کر دیا گیا اور انہوں نے حکومت سے بذریعہ تار میر پور کی تحریک سے قطعی بے تعلقی کا اظہار بھی کر دیا۔ اس وجہ سے حکومت کا رویہ میر پور والوں کے خلاف

اور بھی سخت ہوگیا۔ میر پور میں ابھی آگ سلگ رہی تھی کہ ہم نے ہری کشن کے خلاف آئینی جہاد شروع کردیا۔ مہاراجہ سے اسکی برطرفی کا شدید مطالبہ کیا گیا اور ہر ہفتہ اس کیخلاف قدآدم اشتہارات شہروں اور دیہات میں تقسیم کئے گئے۔

مہاراجہ سے تیسری ملاقات:۔

کسی نہ کسی طرح اس پروپیگنڈا کا علم مسٹر گلانسی کو بھی ہوگیا۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ میں کمیشن کے دفتر میں اتفاقاً سب سے پہلے جا پہنچا۔ میرے بعد مسٹر گلانسی بھی آگئے۔ دورانِ گفتگو حیرت انگیز طور پر وہ مجھے کہنے لگے "کیا آپ مہاراجہ سے ملنا چاہتے ہیں"۔ میں ان کے اس سوال کے اسباب وعلل پر غور کر رہا تھا کہ کسی قدر تامل کے بعد میں نے جواب دیا "ہاں" بشرطیکہ راجہ ہری کشن وہاں موجود نہ ہو" تیر نشانے پر بیٹھا۔ مجھے جواب دیا گیا کہ اچھا کوشش کی جائیگی۔

دوسرے روز اس نے مجھے بتایا کہ ایسوسی ایشن کی ملاقات کیلئے اس نے مہاراجہ سے وقت مقرر کرلیا ہے اور ہری کشن کول ملاقات میں شامل نہیں ہوگا۔ یوم مقررہ پر مہاراجہ سے ملاقات ہوئی لیکن کمرہ میں داخل ہوتے ہی ہم نے دیکھا کہ راجہ ہری کشن کول وہاں پہلے ہی موجود تھے۔

اس سے قبل دو ملاقاتیں سرینگر میں ہو چکی تھیں۔ ایک وہ تھی جس میں خون شہدا کی تلافی اور باز پُرس کیلئے مطالبہ کیا گیا تھا۔ لیکن مہاراجہ نے چھوٹے منہ سے بھی اظہار ہمدردی کا ایک جملہ تک نہ کہا تھا حالانکہ ہم نے آغازِ ملاقات میں ہی وفاداری کا یقین دلایا تھا!

اس ملاقات میں میں نے ضمناً یہ کہہ دیا کہ مسلمان تو اس کے وفادار ہیں۔ ابھی جملہ پورا نہ ہونے پایا تھا کہ مہاراجہ نے قطع کلام کرتے ہوئے فوراً

کہہ دیا کہ وفاداری کا یقین ہی محض بکواس ہے۔ میر پور میں کیا ہو رہا ہے۔ میں نے جواب میں کہا یہ ہم سے نہ پوچھیئے۔ راجہ ہری کشن صاحب سے پوچھیئے کیونکہ وہاں کے حالات کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر ہے۔ پھر ہم نے ہری کشن کول کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔ راجہ ہری کشن کول کا چہرہ فق تھا اور مہاراجہ خاموش۔ گردن نیچی کئے اپنے پرائم منسٹر کے خلاف ہمارے الزامات کو ٹھنڈے دل سے سن رہا تھا۔ جب ہماری گفتگو کا سلسلہ ختم ہو گیا تو مہاراجہ یک لخت اٹھا ہمیں سلام کی بھی مہلت نہ دی اور جھٹ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ہم گھر واپس آ گئے۔

راجہ ہری کشن کی علیحدگی :-

اس ملاقات سے مجھے یقین ہو گیا کہ ہری کشن کول اب چند دنوں کا مہمان ہے۔ نیز اس ملاقات نے میرے دل پر اس تلخ حقیقت کے نقوش اور بھی گہرے کر دئے کہ مہاراجہ کا یہ پرانا دعویٰ کہ "میں اپنی رعایا کے تمام طبقات کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہوں اور دیکھتا رہوں گا" بالکل بے معنی بات ہے۔

چنانچہ میر پور کے ہندوؤں کیلئے تو مہاراجہ کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی حالانکہ وہاں انکا کوئی جانی نقصان نہ ہوا تھا لیکن اس علم کے باوجود کہ کم از کم ایک ہزار سے زیادہ مسلمان وہاں موت کی نیند سلادئے گئے تھے اسکے کان پر جوں تک نہ رینگی اور سرینگر کے شہدا کیلئے بھی ہمدردی کا ایک جملہ اس کی زبان سے نہ نکل سکا۔ اس افسوس ناک واقعہ سے میرے سابقہ خدشات اور بھی پختہ ہو گئے۔ دوسرے روز یہ بھی معلوم کر کے کہ ہری کشن دوران ملاقات موجود تھا گلانسی صاحب کا چہرہ چند لمحوں کیلئے اتر گیا۔ اسی حالت میں اس نے دریافت کیا کہ موضوع گفتگو کیا تھا؟ میں نے کہا "صرف ہری کشن" اس پر اس

کے چہرہ پر رونق پھر عود کر آئی ۔ تیسرے روز صبح مجھے بتایا کہ ہری کشن ختم ہوگیا ہے۔ چنانچہ گھر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ اس کو حدود ریاست چھوڑنے کیلئے صرف بارہ گھنٹے کی مہلت دی گئی ہے۔

ہری کشن کول نے ریاست میں پرائم منسٹر کا عہدہ سنبھالتے ہی مہاراجہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ دو تین ماہ میں مسلمانوں کی تحریک کو ختم کردے گا۔ اس کے جواب میں ہم نے اس کو چیلنج کیا تھا کہ ہم اس کو چھ ماہ کے اندر اندر ریاست چھوڑنے پر مجبور کردیں گے چنانچہ قدرت نے ایسا ہی کیا۔

دسواں باب

گلانسی رپورٹ

گلانسی رپورٹ:۔

کمیشن نے جب تمام شہادت ختم کرلی تو پھر اسکے سامنے صرف رپورٹ کی ترتیب کا کام تھا۔ مسٹر گلانسی نے ایک ہی دن میں تمام امور متعلقہ پر بحث سُن لی۔ اس سے اسکے عندیہ کا بھی پورا علم ہوگیا۔ دوسرے روز آتے ہی اس نے رپورٹ لکھوانی شروع کردی۔ گلانسی صاحب کی قابلیت اور ذہانت کا مجھے صرف اسی روز یقین ہوا۔ شکایات کا سلسلہ ہر شعبہ زندگی کے ہر اہم معاملہ سے تعلق رکھتا تھا۔ بالخصوص مذہبی اُمور بہت اہم تھے۔ جن کو سمجھنے اور بعجلت انکا خاطر خواہ فیصلہ کرنے سے کم از کم میں تو قاصر تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ گلانسی رپورٹ ایسی ضخیم اور جامع کتاب گلانسی صاحب نے صرف ایک ہی نشست میں لکھواڈالی۔

گاؤ کشی اور تبدیلِ مذہب پر اولاد اور جائداد کی ضبطی نہایت پیچیدہ معاملات تھے۔ ان دونوں کے خلاف اس نے رپورٹ لکھوائی لیکن ایسی روانی، بے تکلفی اور معاملہ فہمی سے کہ جب مجھے یہ واقعہ یاد آتا ہے تو میں عش عش کراٹھتا ہوں۔ دوسرے روز یہ رپورٹ ٹائپ ہوکر تیار ہوگئی۔ مندرجہ صدر دو امور کا جواب ہم دونوں مسلمان ممبروں کی مذہبی قابلیت سے بہت بالا تھا۔ میں نے گلانسی صاحب سے رپورٹ کی ایک نقل اس عذر پر حاصل کرلی کہ مجھے چند باتوں سے اختلاف ہے اور شائد مجھے علیحدہ اختلافی نوٹ لکھنا پڑے۔

اسے یقین تھا کہ کمیشن کا فیصلہ تمام امور پر متفقہ ہوگا۔ اسلئے پہلے تو وہ جھنجھلایا اور مجھے نقل دینے میں لیت ولعل شروع کر دی لیکن آخر مجبور ہو گیا۔

گلانسی سے رد و کد:۔

اگلے روز کمیشن میں جب اختلافی نوٹ پیش کئے گئے تو گلانسی صاحب کی حالت قابلِ دید تھی ۔ وہ غُصے سے لال پیلا ہو رہا تا۔ زیادہ تکلیف اس کو میرے مالیہ کے متعلق اختلافی نوٹ کی وجہ سے ہوئی۔ میں خاموش رہا اور وہ بولتا رہا۔ جب وہ تھک کر ذرا ٹھنڈا پڑا تو میں نے آہستہ سے اس کو کہہ دیا کہ مجھے اختلافی نوٹ لکھنے کا از روئے اصول حق حاصل ہے۔ ورنہ میں رپورٹ پر دستخط نہیں کروں گا۔ وہ مالیہ کے خلاف واقعات کو پس پشت ڈال کر رپورٹ لکھ چکا تھا جو یقیناً میرپور کی صورتحال کا ردعمل تھا۔ اس لئے اس نے مجھ سے مالیہ کا نوٹ واپس لینے کو کہا لیکن میں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ اب وقت تنگ ہو چکا تھا اس لئے کمیشن کا اجلاس دوسرے روز صبح اس کی کوٹھی پر قرار پایا۔ اسی روز چار بجے شام لیڈی گلانسی کی طرف سے ہم چائے پر مدعو تھے۔ دس بجے مذاکرات شروع ہوئے تھوڑی دیر کے بعد گلانسی صاحب نے اس حد تک رضامندی کا اظہار کر دیا کہ اگر میں صرف مالیہ کا اختلافی نوٹ واپس لے لوں تو میرے دوسرے تمام نوٹ وہ اپنی رپورٹ میں شامل کرلے گا۔ لیکن میرپور کے حالات کے پیش نظر مالیہ کا نوٹ میرے لئے ایک اہم اور اصولی معاملہ تھا اسے میں کسی صورت بھی نظر انداز کرنے کیلئے تیار نہ تھا۔ جتنے اس کے مخالفانہ دلائل زیادہ اور پرجوش ہوتے گئے میری رائے بھی اسی قدر مالیہ کے نوٹ کے حق میں مضبوط ہوتی گئی۔ قصہ مختصر یہ کہ اس بحث نے بہت طول کھینچا۔ میرے رفیق کار بھی گلانسی سے متفق ہو گئے۔ اب گلانسی صاحب کا حوصلہ اور زیادہ بڑھ گیا اور اس نے عیاری، مکاری

اور چالاکی کے تمام حربے مجھے قائل کرنے کیلئے استعمال کر ڈالے پہلے مجھے میر پور کی نازک صورتحال کے متعلق نہایت نرمی سے اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد انتہائی طور پر خائف اور مرعوب کرنے کی کوشش کی اور یہاں تک کہ برملا کہہ دیا کہ اس نوٹ سے میر پور کی فرقہ وارانہ فضا زیادہ خراب ہو جائیگی اور وہاں قتل وغارت کا سلسلہ تیز تر ہو جائیگا۔ ایسی صورتحال میں تمام تر ذمہ داری تم پر ہوگی اور اس کا قانونی مواخذہ بحیثیت وکیل تم مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہو۔ میں طنزاً مسکرا دیا جب یہ وار بھی خالی گیا تو پھر وادی کشمیر میں اراضی کے حق ملکیت کی حمایت مین جو سفارش اس نے کی تھی اس کی تنسیخ کا رعب ڈالا اور ایک ایکٹر کی طرح فائل اپنی بغل میں دبا کر کرسی سے اٹھا اور کہا کہ میں ابھی مہاراجہ کے پاس جا کر عرض کر دوں گا کہ جو رعایت آپ کے مشورہ سے میں نے مسلمانوں کے حق میں تسلیم کرلی ہے واپس لی جانی چاہئے۔ میں اس پر بھی خاموش رہا اور ٹس سے مس نہ ہوا، وہ ذرا شرمندہ ہو کر پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب اس نے ترغیب وتحریص کا اوچھا وار کیا اور مجھے یقین دلایا کہ اگر تم اس نوٹ کو واپس لے لو تو میں ابھی مہاراجہ کے پاس تمہارے حق میں بڑی سے بڑی ملازمت کیلئے سفارش کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے جواباً شکریہ ادا کر کے اس کی کرم فرمائی کو قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ اس کے بعد اسکا آخری حربہ بہت کمینہ تھا۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ یہ نوٹ تم نے کس سے لکھوایا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ نوٹ میری اپنی ذہنی کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ بابو محمد عبداللہ مرحوم کے زور قلم کا شاہکار تھا۔ اس بات پر میں بھی سیخ پا ہو گیا اور میں نے نہایت ترش لہجہ میں اسے کہا کہ تمہیں یہ بات پوچھنے کا حق ہی کیا ہے؟ تم نے میری توہین کی ہے۔

ان دنوں مڈلٹن بھی جموں ہی میں مقیم تھا اور وہ کسی وقت ریاست

کاریونیو کمشنر بھی رہ چکا تھا۔ گلانسی صاحب نے ہمیں بتلایا تھا کہ مالیہ اور حق ملکیت کے متعلق اس نے مڈلٹن سے مشورے کئے ہیں۔ یہ بات میرے ذہن میں تھی اس لئے میں نے بھی اسے بطور الزامی جواب کہا کہ تمہارا مالیہ کا نوٹ جس کی روسے مالیہ میں تخفیف کی مخالفت کی ہے مڈلٹن کی قابلیت کا مرہونِ منت ہے اور یہ تمہارا اپنا نہیں۔ اس پر وہ خاموش ہوگیا۔ دس بجے سے لگا تار پانچ بجے تک اسی ایک موضوع پر بحث جاری رہی۔ میرے رفیق کی خاموشی بلکہ گلانسی صاحب کے ساتھ ہاں میں ہاں ملانے کی وجہ سے میں بھی ذہنی اور جسمانی طور پر تھک چکا تھا۔ ادھر پانچ منٹ کے بعد لیڈی گلانسی کے تقاضوں کا سلسلہ شروع ہوگیا کہ چائے ٹھنڈی ہورہی ہے۔ وقت بہت گذر چکا تھا، یہ بات بھی میرے لئے مصیبت کا باعث بن گئی تھی آخر کار گلانسی صاحب نے اچانک ایک تجویز پیش کردی۔ اس طرح جیسے اسے اِلہام ہوا۔ تجویز یہ تھی کہ اگر میں اس سے اِتفاق کرلوں تو میری طرف سے وہ خود مالیہ کے متعلق ایک اختلافی نوٹ لکھ کر کل صبح کمیشن کے دفتر میں لے آئے گا۔ اور ساتھ ہی اس نے یقین دلایا کہ اگر یہ نوٹ مجھے پسند نہ ہو، تو پھر میں اپنا اصل نوٹ رپورٹ کے ساتھ شامل کرسکتا ہوں۔

پنڈت پریم ناتھ بزاز:۔

یاد رہے کہ اس تمام کاروائی میں پنڈت پریم ناتھ بزاز کی ہمدردیاں کم وبیش میرے ساتھ رہیں اور کبھی کبھی وہ میری ترجمانی بھی کرتے رہے۔ اس موقعہ پر میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس بات کا بِلا خوف وخطر اِظہار کردوں کہ پنڈت پریم ناتھ بزاز کے موجودہ سیاسی عقائد خواہ کچھ بھی ہوں اور اس کی پالیسی کے متعلق خواہ ہم میں سے اکثر لوگ کتنے ہی اختلافات کیوں نہ رکھتے

ہوں واقعہ یہ ہے کہ اگر پنڈت پریم ناتھ بزاز کے بجائے کمیشن میں کوئی دوسرا ہندو رکن شامل ہوتا تو غالباً مسلمانوں سے متعلق رپورٹ کا رنگ بھی مختلف ہوتا او جو کچھ گلانسی صاحب کی سفارشات کی رو سے مسلمانوں کو ملا شائد اس صورت میں اس کے نصف کی بھی توقع نہ ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسٹر بزاز نے مسلمانوں کے ہر مطالبہ اور شکایت کی دل وجان اور کمال نیک نیتی سے حمایت کی۔ الغرض گلانسی صاحب کی اس تجویز پر مسٹر بزاز نے بھی لبیک کہہ دیا۔ جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں میں تھک چکا تھا اور تجویز میں کوئی سقم بھی نہ تھا۔ اسلئے میں نے اتفاق ظاہر کر کے سات آٹھ گھنٹہ کی کوفت سے نجات حاصل کی۔ ۔دوسرے روز صبح وہ اختلافی نوٹ لکھ کر لایا تو میرے لئے اس سے اختلاف کرنا بے حد مشکل تھا۔ الفاظ کی ہیرا پھیری اور نفس معاملہ کی موجودگی کی وجہ سے اس نوٹ پر نکتہ چینی بے حد مشکل تھی ۔میں نے ایک دو فقرے مختلف جگہوں پر ایزاد کر دئے اور دیگر ممبروں نے بھی اس نوٹ کو خاطر خواہ ظاہر کیا۔ اس لئے میں نے اسے اپنا لیا۔

رپورٹ میں میری طرف سے مالیہ کے متعلق اختلافی نوٹ درحقیقت گلانسی صاحب کا رقم کردہ ہے۔ چنانچہ رپورٹ مکمل ہوگئی اس پر ہمارے دستخط ثبت ہوگئے اور اسی وقت وہ سربمہر کر کے مہاراجہ کے پاس بھیج دی گئی۔

سفارشات کے دو پہلو:۔

گلانسی کمیشن کی سفارشات کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ اس کی رو سے مسلمانوں کی متعدد بنیادی اور اہم ترین شکایات کا ازالہ ہوا۔ دوسرا یہ کہ جن مطالبات کو گلانسی صاحب نے تسلیم نہیں کیا ان کے متعلق کم از کم یہ بات تو مسلّمہ اور مصدقہ ہوگئی کہ یہ بھی ہماری شکایات کا ایک اہم جزو اور حصہ ہیں۔

ورنہ اس رپورٹ کی تحریر سے دو سال قبل سرایلین بینر جی کے بیان کے جواب میں حکومت نے اپنے کاسہ لیسوں کے ذریعہ بیانات شائع کرائے تھے کہ مسلمانوں کو ریاست میں کوئی تکلیف نہیں۔

گلانسی کمیشن کی رپورٹ نے مسلمانان ریاست کی زبوں حالی، تعلیمی، مذہبی، سیاسی اور ملازمتوں اور پسماندگی کا صحیح مُرقع دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور بعض معاملات میں مجرمانہ تساہل پر حکومت کو موردِ الزام گردانا۔ برادرانِ وطن کو یہ رپورٹ بھلی معلوم نہ ہوئی کیونکہ اس کی وجہ سے ان کی قدیم اجارہ داری ختم ہو جاتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس مسلمانانِ ریاست بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ اس رپورٹ کو اسلامیانِ ریاست کے حق کا منشور کہہ کر پکارتا رہا۔

تحریک حریت کشمیر ایک اسلامی تحریک تھی :۔

تحریک حریت کشمیر کی بنیادیں خالصتاً اسلامی اور اس لحاظ سے فرقہ وارانہ تھیں کہ غیر مسلم ایک قلیل ترین اقلیت ہونے کے باوجود ریاست کے ہر شعبہ زندگی پر حاوی تھے۔ اسی لئے انہوں نے نہ آغاز تحریک میں اور نہ اسکے بعد آج تک اس میں حصہ لیا۔ مسلمانوں کی تحریک کا نعرہ بھی خالص اسلامی تھا۔ ہم نے دنیا کے سامنے اس تحریک کو اسلام کے نام اور وسیلے سے پیش کیا اور اسلامیانِ پنجاب سے اِمداد کے خواہاں ہوئے ۔ ذہنی اور مذہبی لحاظ سے ریاست کشمیر کا مفلوج مسلمان اخوت اسلامی کے اصول سے یکسر بیگانہ تھا۔ لیکن ہندوستان کا مسلمان قومی اِبتلاء اور سیاسی نشیب و فراز کے کئی پُر خطر اور عِبرتناک دوروں سے گزر چکا تھا۔ اس لئے وہ حساس بھی تھا اور نیرنگی زمانہ کے باوجود وحدتِ ملی، اسلامی برادری اور ''تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں'' کے زرین اصول سے آشنا تھا۔ وہ خود مجبور تھا لیکن اس کی مجبوری میں

تھوڑی بہت شان بے اعتنائی ابھی موجود تھی۔ وہ بھی غلام تھا بایں ہمہ مذہب
اور قوم کے نام پر ہر جابر و قاہر طاقت سے متصادم ہونے کیلئے اس کی کمزوری
اور مجبوری اس کے راستہ میں حائل نہ تھی۔

اقتصادی، قومی اور سیاسی مصائب میں مبتلا ہوتے ہوئے بھی ہندوستانی
مسلمان نے محض اسلام کے نام پر مسلمانان ریاست کی دست گیری کی،
اور عین اس وقت جبکہ مصائب کے پہاڑ ان پر ٹوٹ رہے تھے اور جب ڈوگرہ
بربریت برہنہ ہوگئی تھی اور حکومت کشمیر کے مظالم اور مسلمانوں کے خلاف اس
کی من مانی کاروائیوں کا محاسبہ مسلمانانِ ریاست کے بس کا روگ نہ تھا۔ جب
بتیس لاکھ مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو چکا تھا اور جب وہ تباہی اور ہلاکت
کے کنارے پر کھڑے تھے اور عنقریب اعدائے اسلام کی طاقت کا ریلا ان کو
تباہی کے گڑھے میں دھکیل دینا چاہتا تھا۔ اس عالم یاس وبیم میں پنجاب
اور ہندوستان کے مسلمانوں کا جوش اسلامی حرکت میں آیا اور انہوں نے
ہمارے لئے وہ کچھ کیا کہ اگر ہم ناشکر گزار نہ ہوئے تو رہتی دنیا تک ان کا احسان
بھول نہ سکیں گے۔ لیکن ایک طرفہ تماشا بلکہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ آج ہم ریاستی
مسلمانوں میں چند لوگ وطن کے نام پر "کشمیر کشمیریوں کے لئے ہے" کا
خلاف اسلام نعرہ بلند کر رہے ہیں۔ اور حد یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی آستانہ
اغیار پر جبہ سائی کر رہے ہیں۔

معاملاتِ کشمیر میں کانگریس کی مداخلت:۔

جادۂ حق سے بھٹکے ہوئے چند لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بیرونِ ریاست کے
مسلمانوں سے اب مطلب براری ہو چکی وہ ہمارے لئے جتنی زیاد سے زیادہ
قربانی کر سکتے تھے کر چکے اس لئے ہم کو اب ہندو سرمایہ داری اس کے ظاہری

جاہ وجلال اور انکی چکنی چپڑی باتوں کی طرف متوجہ ہونا چاہئے کہ تحریک حریت
کشمیر کو پنڈت جواہر لعل نہرو کی کوہالہ پل والی نمائشی گرفتاری نے پروان نہیں
چڑھایا تھا۔نہ ہندو کانگریس کے غلط اور خوشامدانہ پروپیگنڈا نے اسلامیانِ
ریاست کی سیاسی اور قومی تربیت کی تھی۔وہ تو محض اپنی مطلب براری کیلئے کشمیر
کو دوسرا صوبہ سرحد بنانا چاہتے تھے اور اس مقصد کے حصول کیلئے وہاں بھی ان کا
بے شمار سرمایہ کام آیا اور یہاں بھی کام آرہا ہے۔وہاں پٹھانستان کا نعرہ بلند
ہوا اور اپنی موت آپ مرگیا اور اب یہاں "کشمیر کشمیریوں کیلئے ہے" کا نعرہ
بلند ہوا ہے لیکن قدرت اس کو پنپنے کی مہلت دے گی یا نہیں اس بات کا فیصلہ
بہت جلد ہونے والا ہے۔ادھر سرحد کے کانگریس نواز مسلمان اپنے آقاؤں کی
پشت پناہی کے باوجود اب دم توڑ چکے ہیں۔ادھر کشمیر کے چند مسلمان بھی جو
ہندو کانگریس کی گت پر ناچ رہے ہیں۔ مستقبل قریب میں اپنے کئے پر یقیناً
پشیمان ہوں گے۔ ہندوستان کے مسلمان نے تو اپنے خون اور قربانی سے ملت
کے نخل کو سینچا، ثمردار بنایا اور جب پھل پکنے کا وقت آیا تو اس قومی باغ کی اجارہ
داری جبراً اور معمولی معاوضہ کے بدلے چند مسلمانوں نے کانگریس کے سپرد
کردی۔لیکن سوال یہ ہے کہ کشمیر میں کیا آج تک کانگریس نے ریاست کے
خلاف کوئی معمولی سی تحریک بھی جاری کی؟ جواب یقیناً نفی میں ہے۔اسلئے کہ
خون ہر حال میں پانی سے گاڑھا ہوتا ہے۔وہ احمق ہیں جو یہ سمجھ رہے ہیں کہ
ان دونوں میں تصادم ہوگا۔حکومت کشمیر بھی ہندو اور کانگریس بھی ہندو۔پنڈت
جواہر لعل نہرو نے جو کچھ کہا مسلمانان ریاست کی آنکھوں میں دھول جھونکنے
کے لئے کہا لیکن دنیا اب اتنی بیوقوف نہیں رہی جتنا کہ "عقلمند" ہندو کانگریس
اسے سمجھتی ہے۔کشمیر کے صرف وہی چند مسلمان ان کے جھانسے میں آسکے جو

مفاد ملت سے اپنی مخصوص مصلحتوں کی وجہ سے منہ موڑ چکے تھے ورنہ اگر جواہر لعل نیک نیت ہوتا تو نہ صرف وہ خود قید و بند میں مبتلا ہوتا بلکہ اپنے ساتھ ہزاروں ہندوؤں کو بھی ریاست پر یورش کا حکم دے دیتا اور اس طرح مسلمانان ریاست کو اپنی نیک نیتی کا عملی ثبوت دیتا۔

کس قدر شرم کی بات ہے کہ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود بھی ریاست کے چند مسلمان جواہر لال اور گاندھی کو اپنا دوست اور قائد اعظمؒ کو اپنا دشمن سمجھتے رہے۔ دراصل تمام باتوں کا دارومدار نیت اور ضمیر پر ہے۔ جسکی نیت خراب ہوگئی اور جو اپنا ضمیر کھو چکا اس کیلئے اچھے برے اور دوست دشمن کی تمیز ہی کیا ہے۔ مقصود اس تمہید سے یہ بتانا تھا کہ تحریک حریت کشمیر میں مسلمانانِ ہندوستان بالخصوص زندہ دلانِ پنجاب نے کیا حصہ لیا۔

گیارہواں باب

آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس

۱۹۳۲ء سے قبل یوں تو عام ریاستی مسلمان سیاسی طور پر بیدار ہو چکے تھے اور اپنی جگہ انہوں نے اپنے حلقہ اثر میں اپنی قوت کے مطابق حکومت کے مظالم کا کافی مقابلہ بھی کیا تھا۔ لیکن بایں ہمہ ریاست جموں وکشمیر کا مسلمان اس وقت تک قومی نظام کی ایک لڑی میں منسلک نہ ہو سکا تھا۔ ینگ مینز مسلم ایسوی ایشن تو موجود تھی لیکن عملاً ریاست کے دونوں صوبوں کے نمائندہ مسلمانوں کو آئینی طور پر ایک جگہ جمع نہ کر سکی تھی۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ سلسلۂ جہادِ حریت فوراً شروع ہو گیا۔ اب گلانسی کمیشن رپورٹ شائع ہو چکی تھی۔ میر پور کی آگ حکومت کے انتہائی جبر و تشدد کی وجہ سے کب کی بجھ چکی تھی اور دو سال کی مسلسل ہنگامہ آرائیوں اور خونریزیوں کے بعد سیاسی فضا میں قدرتاً سکوت اور تعطل ناگزیر تھا۔ علاوہ ازیں اب قلمدان وزارت کرنل کالون، دلال اور وجاہت حسین کے ہاتھوں میں منتقل ہو چکا تھا جو مسلمانوں کی حالت زار پر چند آنسو بہا دیا کرتے تھے۔ لہٰذا ایسے پر سکوں اور خاموش سیاسی ماحول میں قومی اور جماعتی شیرازہ بندی وقت کی اہم پکار تھی۔ چنانچہ طے ہوا کہ جموں وکشمیر کے مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کیلئے کل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کا قیام عمل میں لانے کی غرض سے ریاست بھر کے نمائندوں کا اجلاس طلب کیا جائے۔

شیخ محمد عبداللہ سے بھی مشورہ کیا گیا تو انہوں نے بھی اس کا خیر مقدم کیا۔

اس وقت تک مسلمانوں نے جو کچھ کیا تھا وہ بے سروسامانی اور افراتفری کی حالت میں کیا تھا۔ نہ مسلمانوں کا کوئی فنڈ (بیت المال) تھا اور نہ کوئی باقاعدہ ذریعہ آمدن کہ جس سے جماعتی اور قومی امور خوش اسلوبی اور بے فکری سے پورے ہو سکتے۔ قریباً قریباً تمام کارکن نوعمر تھے نہ ان کا ذاتی سرمایہ تھا اور نہ کوئی ذریعہ معاش۔

میری مالی پریشانیاں :-

سیاسی دوڑ دھوپ کیلئے ہمیں اپنی گرہ سے خرچ کرنا پڑتا تھا۔ میرا اپنا یہ حال تھا کہ گھر والے میری مسلسل امداد کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ اس لئے سرینگر اور جموں آنے جانے کیلئے مجھے اکثر پریشانیوں کا سامنا رہتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ سرینگر اور جموں کی آمدورفت کی وجہ سے میں نے پہلے برس میں اپنی بیوی کے تمام زیورات ایک ایک کر کے گروی اور بعد میں فروخت کردئے کہ ہماری منقولہ پونجی کی کل کائنات یہی زیور تھے۔ غیر منقولہ جائیداد کا ذکر ہی کیا۔ اسکے بعد میں نے وہ وقت بھی دیکھا کہ میری بیوی کے پاس کئی دنوں تک ایک حبہ بھی نہ ہوتا تھا۔ یہ زمانہ میرے لئے انتہائی پریشانی اور کشمکش کا تھا۔ اس سے اکثر اوقات میرا حوصلہ پست ہو جاتا تھا۔ اس عالم یاس میں قدرت ہمیشہ میری ہمت بندھاتی رہی اور میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا رہا۔ میرے ذاتی اخراجات تو زیادہ نہیں تھے البتہ بیوی اور بچوں کیطرف سے مجھ پر کافی ذمہ داریاں عائد تھیں جنہیں میں آج تک پوری طرح نہیں نبھا سکا اور نہ ان ذمہ داریوں کو نبھانے کی آئندہ کوئی صورت نظر آتی ہے جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے میری گزر اوقات کا ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ وکالت تھی۔ لیکن میں سیاسی مصروفیات کی وجہ سے اسے فروغ نہ دے سکا۔ فراغت نصیب ہوتی بھی تو کس طرح؟ پھر بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ گوناگوں مصائب کے باوجود

میں ثابت قدم رہا۔ کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کیا۔ بہر حال میں مطمئن رہا اور میری پریشانی موجب راحت اور وجہ اطمینانِ قلب رہی۔ میرے نزدیک جیل میں جانا کوئی بڑی قربانی نہیں بلکہ سیاسی اسیروں کو تو یہاں مکمل آرام واطمینان نصیب ہوتا ہے۔ بشرطیکہ گھر کے دہندوں کی فکر نہ ہو۔ میں سات بار قید ہوا لیکن گھر کے دہندوں کو ہر بار ناقابل حل ہی چھوڑ آیا۔ ایسے حالات میں بے سرمایہ سیاسی کارکنوں کو اپنی قربانی تو معمولی ہوتی ہے اصل قربانی ان کے متعلقین کی ہوتی ہے۔ اور اگر اس ضمن میں میں یہ کہوں گا کہ آج تک مجھ سے زیادہ قربانی میرے بیوی بچوں نے دی ہے تو یقیناً مبالغہ نہ ہوگا۔ یہی حال میرے دوسرے رفقاء کار کا تھا۔ ان میں سے بہت سے لوگ تو قومی خدمت کا جذبہ رکھنے کے باوجود اسی مالی مشکل کی وجہ سے بادل ناخواستہ دنیائے سیاست سے رخصت ہو جانے پر مجبور ہو گئے ۔ باقی جو موجود ہیں ان کے گھروں کا نقشہ بھی میری طرح قابل بیان نہیں۔ دراصل سیاست فارغ البال گروہوں کا کام ہے ۔ تن تنہا انسان کا یا ایسے شخص کا جو قومی بیت المال کو بلاواسطہ یا بالواسطہ اپنی ملکیت تصور کرے ۔ بدقسمتی سے یہ تینوں ''صفات'' موجودہ مسلم کانفرنس کے کسی عملی کارکن میں شروع سے لے کر اب تک موجود نہیں ہیں۔ تحریک حریت کشمیر میں کبھی کسی سرمایہ دار مسلمان نے عملی حصہ نہ لیا اور جنہوں نے تھوڑا بہت آئینی حصہ لیا بھی وہ اس وقت چوٹی کے سرمایہ دار نہیں اور جن غریب کارکنوں میں ہوس سرمایہ داری پیدا ہوگئی ان کی سیاست کا رنگ ہی یکسر بدل گیا۔ دراصل سرمایہ داری ضد ہے عوامی تحریکوں کی جو سرمایہ دار لوگ ایسی تحریکوں میں بظاہر نیک نیتی سے پیش پیش ہو کر حصہ لیتے ہیں اگر آپ ان کے دلوں کی گہرائیوں میں اتریں گے تو عوام کیساتھ جذبات ہمدردی کی نسبت

ان کے دلوں میں ٹاٹاؤں اور برلاؤں کا زیادہ رنگ پائیں گے۔ ایسے طبقہ کی مساعی سے عوام کی حالت زبوں میں سرمو فرق پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ سرمایہ داری کا گُر یہ ہے کہ دنیا کا معیار زندگی اونچے سے اونچا ہوتا رہے۔ ایسی حالت میں غریب کی حالت کا سدھرنا ناممکن ہے۔

مسلم کانفرنس کا پہلا اجلاس:۔

پہلے سالانہ اجلاس میں کانفرنس کے اغراض ومقاصد اور قواعد وضوابط مرتب ہوئے اسی اجلاس کی وجہ سے ریاست کے مسلمانوں کو اپنی ایک ہم خیال اور نمائندہ جماعت نصیب ہوئی۔ جسکی وجہ سے ریاست کا دورافتادہ مسلمان اپنے اندر ہمت محسوس کرنے لگا۔ اب وہ مقامی حکام کی سینہ زوری اور خلاف قانون کاروائیوں کے خلاف خم ٹھونک کر مقابلہ پر اتر آیا۔ مسلم کانفرنس کے عالم وجود میں آنے سے ۳۲ لاکھ مسلمانوں کا ایک مرکز بن گیا اور انہوں نے اس مرکز اور اسکے سبز ہلالی جھنڈے تلے ایوان ریاست میں ایسا ہنگامہ بپا کیا کہ ارباب حکومت کو قدر عافیت معلوم ہوگئی۔

اس سال شیخ محمد عبداللہ صدر کانفرنس مقرر ہوئے اور میں معتمد عمومی۔ مسلمانوں کی جدوجہد مصائب وآلام اور قید وبند کا ایک ہی حاصل تھا وہ مسلم کانفرنس تھی۔ جس کی عمارت پر حکومت کی مشین گنوں سے ابھی آنچ نہ آسکی۔ لیکن آہ کہ جب اس کی بنیادوں کے کھوکھلا ہونے کا وقت آیا ہمارے اپنے تشتت ونفاق کا سیلاب جو ذاتی اغراض اور سیاسی عزائم نے پیدا کیا تھا اس سیسہ پلائی دیوار کو بہا لے گیا اور ہماری مخصوص مصلحتوں نے مسلمانوں کی اس ایک ڈھال کو نذر برہمن کر دیا۔

بیگانوں کا وار کبھی خالی بھی ہو سکتا ہے لیکن اپنوں کے وار کا کوئی مداوا

نہیں۔ سالانہ اجلاس کے چند مہینوں بعد تک کوئی قابلِ ذکر سیاسی واقعہ رونما نہ ہوا۔ البتہ ایک آدھ ماہ کے بعد میں نے مسٹر مہتہ مشیر مال کیخلاف تقریر کی۔ جس میں اس پر بے شمار الزامات عائد کیے۔ حکومت نے مجھ پر زیر دفعہ ۱۲۴ الف مقدمہ چلانا چاہا۔ راجہ محمد افضل خان گورنر جموں نے مجھ سے کہا کہ میں پرائم منسٹر کے سامنے اظہارِ معذرت کردوں تو حکومت مقدمہ چلانے کا ارادہ ترک کردے گی۔ کیونکہ بقول ان کے کرنل کالون پرائم منسٹر تمہارے خلاف کوئی قانونی کاروائی کرنے کا دل سے مخالف ہے۔

میں نے اس بارے میں کسی سے مشورہ نہ لیا اور ایک روز کرنل کالون کے پاس جا کر اظہار افسوس کردیا۔ میں ابھی کرنل کالون کے ہاں ہی تھا کہ مجھے احساس ہوا کہ میں کسی گناہ عظیم کا مرتکب ہوا ہوں۔ ضمیر نے مجھے ملامت کی اور میں اپنے آپکو بدترین مخلوق اور سیاسی مجرم تصور کرنے لگا۔ حقیقتاً اس واقعہ سے قبل مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا دماغ معطل ہو چکا ہے اور میں دوسروں کے تابع ہوں۔

بعد میں جب اسی روز مجھے معلوم ہوا کہ مسٹر لاتھر انسپکٹر جنرل پولیس نے ایک دن پہلے میری گرفتاری کے سلسلے میں کسی قسم کی انتظامی ذمہ داری لینے سے صاف انکار کردیا تھا تو مجھے اور بھی کوفت ہوئی۔ مسٹر لاتھر کو بھی مسلمانوں سے بظاہر ہمدردی تھی اور خصوصاً میرے ساتھ اسکے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ اس نے حکومت کو یقین دلایا تھا کہ میری گرفتاری سے سیاسی صورتحال خراب ہوجائیگی۔ غالباً اسی لئے حکومت نے سرسری معذرت کا حل سوچا۔ کوئی اندازہ نہیں کرسکتا کہ جب مجھے اس صورتحال کا پوری طرح علم ہوا تو میری پشیمانی، پریشانی اور ندامت کس حد تک پہنچ گئی۔ اب بھی یہ عالم ہے کہ اس واقعہ کو یاد کرکے میں اکثر ندامت سے پانی پانی ہوجاتا ہوں۔ میرے اتنے سے گناہ

نے میرے ضمیر کو آج تک بوجھل کر رکھا ہے۔

میں حیران ہوں کہ وہ لیڈر کون سا منہ لے کر عوام کے سامنے آتے ہیں جو جیل میں جاتے تو سامنے کے دروازے سے لیکن جب نکلتے ہیں تو جیل کے پوشیدہ دروازوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ کیا وہ لیڈر اس ضمیر فروشی سے ندامت محسوس نہیں کرتے اور عوام ان کی اس کمزوری کو بھول جاتے ہیں۔ میرا گناہ ان کے جرم سے بہت کم ہے تاہم اسوقت تک میں اپنے ضمیر کی سرزنش برداشت کر رہا ہوں۔

جموں و کشمیر اسمبلی کی ہیئت ترکیبی :۔

گلانسی کمیشن رپورٹ مکمل ہونے کے بعد سر برٹرینڈ گلانسی کے زیرِ صدارت ایک اور کمیشن آئینی اصلاحات کے بارے میں سفارشات کیلئے مقرر کیا گیا تھا۔ پہلے کمیشن کے تینوں ممبر اس کمیشن کے بھی ممبر تصور کئے گئے لیکن یہ کمیشن اپنی ساخت اور ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے ایک تو مجموعہ اضداد تھا دوسرے متعدد سرکاری اور نیم سرکاری اشخاص اس کے ممبر نامزد کئے گئے اور جو رہی سہی کسر اسکے سرکاری ہونے میں باقی تھی۔ وہ چار پانچ پنشنر ممبروں کی بھرتی سے پوری کر دی گئی۔ ان حالات میں ہم نے اس کمیشن سے ابتدا ہی میں عدم تعاون کر دیا تھا اور میں تو اس میں بالکل شامل ہی نہیں ہوا۔ اس کمیشن کی تشکیل ہی اپنی کارکردگی اور نتیجہ کی منہ بولتی تصویر تھی۔ چنانچہ اس کی رپورٹ انتہا درجے کی مایوس کن تھی۔ لیکن اس رپورٹ کی رو سے بہرحال ایک آئین ساز اسمبلی کی سفارش ضرور کی گئی تھی۔ اختیارات کے لحاظ سے یہ موجودہ اسمبلی محض ایک برائے نام اسمبلی تھی۔ نمائندگی کے لحاظ سے مسلمانوں کی اسی فی صدی آبادی کیلئے ۳۳ نشستوں میں سے صرف ۲۱ رکھی گئی تھیں اور حکومت کیلئے نامزدگی

کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔

حکومت کی بے پروائی :۔

یہ اسمبلی جو کچھ بھی تھی اس کے قیام میں دانستہ تعویق وتاخیر کی جارہی تھی۔ اسکے علاوہ گلانسی کمیشن کی سفارشات کو حکومت نے بہت حد تک تسلیم کرلیا تھا۔ لیکن ۱۹۳۳ء تک کسی ایک اہم سفارش کو بھی عملی شکل نہ دی گئی تھی حتیٰ کہ ہماری دوسالہ جدوجہد کے باوجود پریس اور پلیٹ فارم کے ابتدائی حقوق بھی ہنوز تشنۂ منظوری تھے۔ حکومت کی دانستہ اور مجرمانہ خاموشی سے ایک طرف عوام حیران ہورہے تھے اور دوسری طرف مسلم کانفرنس کی ذمہ داری اس امر کی مقتضی تھی کہ حکومت کو جھنجھوڑا جائے اور اس بارے میں عمل کیلئے آمادہ ومجبور کیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ نئی منسٹری کی آمد سے حکومت کے پرزے رنگ بدل چکے تھے اور اس حکومت سے مسلمانوں کو انصاف کی نہیں تو کم از کم بے انصافی کی بھی توقع نہیں تھی۔ اس وجہ سے مسلم کانفرنس نے مسلمانوں کے مطالبات پر عمل کرانے کیلئے حکومت کو کافی مہلت دے دی تھی۔ بایں ہمہ حکومت سیدھے ہاتھ سے مسلمانوں کو کچھ دینے کو تیار نظر نہ آتی تھی۔

مجلسِ عاملہ کا اجلاس :۔

ان حالات میں مسلم کانفرنس نے حکومت کو کافی ڈھیل دینے کے بعد مارچ ۱۹۳۳ء میں بمقام سرینگر مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا۔ ان دنوں سرکاری دفاتر ریاست کے سرمائی دارالخلافہ جموں میں مقیم تھے۔ یہ اجلاس اپنی اہمیت کے اعتبار سے غیر معمولی تھا۔ عوام کو یقین تھا کہ مسلم کانفرنس اپنے جماعتی وقار اور بقاء کیلئے کسی موثر اقدام پر مجبور ہوجائیگی۔ ادھر حکومت کے کانوں میں بھنک پڑ گئی یا اسے باخبر کردیا گیا کہ مسلم کانفرنس کے تیور بدلے ہوئے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارچ کے گندے موسم میں کرنل کالون پرائم منسٹر اور مسٹر وجاہت حسین مرحوم ہوم منسٹر جموں سے دوڑے ہوئے سرینگر پہنچے۔ ہم نے عمداً اجلاس کی کاروائی کو لمبا کر دیا۔ سرینگر پہنچتے ہی پرائم منسٹر نے مسلم کانفرنس کے وفد کو چٹھی لکھ کر ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

جواباً پرائم منسٹر کو مطلع کیا گیا کہ مجلس عاملہ اس وقت تک بعض اہم فیصلوں پر پہنچ چکی ہے۔ اسلئے وفد کا معاملہ اس کی منظوری کے بدوں طے نہیں ہو سکتا۔ مجلس کا دوسرے روز اجلاس بلایا جائیگا جو فیصلہ ہوگا اس سے اسے مطلع کیا جائیگا۔

قصہ مختصر تیسرے روز ہمارا وفد حکومت کے ان وزراء سے ملا۔ اور سودابازی کے سلسلہ میں ہم نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ ہم نے افہام و تفہیم کے دوران فضا کو ایسی خوش اسلوبی سے اپنے لئے سازگار بنالیا کہ پرائم منسٹر کیلئے انکار کرنا غیر ممکن تھا۔ چنانچہ پریس اور پلیٹ فارم کی آزادی اور دو تین اور اہم مطالبات کا اعلان اسی روز گورنمنٹ کی جانب سے ہو گیا ور ساتھ ہی یہ بھی یقین دلایا گیا کہ دیگر سفارشات کمیشن کو بہت جلد عملی جامہ پہنایا جائے گا اور اسمبلی کے قواعد وضوابط اور ضمنی قواعد تیار کرنے کیلئے ایک کمیٹی کا تقرر بھی چند ہفتوں تک ہو جائیگا۔ اس فوری اور غیر متوقع کامیابی سے عوام کے حوصلے بڑھ گئے اور مسلم کانفرنس کی مقبولیت اور طاقت بھی بڑھ گئی۔

مسلم کانفرنس کی تنظیم :۔

اس کارگزاری کے بعد قدرتاً مسلم کانفرنس کے سامنے کوئی غیر آئینی پروگرام نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے کانفرنس کے استحکام کیلئے مختلف پروگرام تیار کئے گئے سیاسی دوروں کا سلسلہ طول وعرض ریاست میں شروع کیا گیا۔ چونکہ مسلم کانفرنس خود بخود ہی عوام میں ہردلعزیز ہو رہی تھی۔ اَن پڑھ اور پسماندہ علاقوں

کے مسلمان بھی اس کی مضبوطی اور کامیابی کو اپنے لئے ذریعہ نجات سمجھنے لگے اور اسی کو قومی تمناؤں کی جان تصور کرنے لگے۔ اس لئے کانفرنس کے اراکین کی بہت زیادہ کوشش کے بغیر ہی ریاست میں ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک اس کی شاخوں کا جال بچھ گیا۔ اب مسلم کانفرنس کے سامنے کوئی عملی کام نہ تھا۔ بجز اسکے کہ ہر دوسرے تیسرے مہینے مجلس عاملہ کے اجلاس طلب کئے جائیں اور دو چار ریزولیوشن پاس کر کے حکومت، عوام اور خود اپنے آپ کو اپنی زندگی کا ثبوت بہم پہنچا دیا جائے۔ البتہ سرینگر میں شہدا کے ورثا کیلئے ریلیف کا کام شروع کر دیا گیا تھا۔ ان ایام میں ہی کشمیر کے سیاسی دورہ سے فارغ ہو کر میں جموں پہنچا تو وہاں جلسوں پر پابندی عائد تھی۔ چونکہ یہ سلسلہ صرف ہندوؤں کو خوش کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا میں نے اس کی اپنی انفرادی حیثیت میں خلاف ورزی کی اور جموں جیل میں مجھے بغیر مقدمہ چلائے نظر بند کر دیا گیا۔

بارھواں باب

میرواعظ اور شیخ محمد عبداللہ

چار پانچ ماہ کے بعد ہی سرینگر میں مسلم کانفرنس دو حصوں میں بٹ گئی اور دونوں نے ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنا شروع کر دیا۔ جس میں شیخ محمد عبداللہ بھی شامل ہو گئے۔ بیکاری کی حالت کسی قسم کی ہو ذاتی یا جماعتی، انفرادی یا قومی، ہر حال میں قاطع ترقی و عروج اور موجبِ انحطاط و زوال انسانی ہے۔ کوئی فعال جماعت اگر بیکار ہے تو قوم کا مستقبل اس کی وجہ سے تاریک دتا رہے۔ وہ قوم جس نے طوقِ غلامی اور سلاسلِ محکومی کو ابھی ابھی اپنے جسم سے اُتار پھینکا ہو، اور جس قوم کے پاؤں شاہراہ ترقی پر گامزن ہو کر ابھی راہ کے گرد و غبار سے بھی اٹے ہوئے ہوں اس قوم کے لئے اس منزل پر ذہنی بیکاری کا یہ مرض زہر کا حکم رکھتا ہے۔ اور پھر قوم بھی وہ قوم جو مدتوں سے ایمان کی دولت سے تہی دست ہو چکی ہو جو اپنے ضعفِ عمل کی وجہ سے قومی روایات سے قطعاً بے گانہ ہو گئی ہو اور جو اسلامی روایات کی بجائے غیر اسلامی زندگی میں رنگی جا چکی ہو۔ ایسی قوم کے لئے تو بیکاری کا مرض پیامِ موت ہے۔ ریاست کشمیر کے مسلمان اب اس بیماری میں مبتلا ہوا چاہتے تھے۔ اصل مرض تو ابھی لاحق نہیں ہوا تھا۔ لیکن مرض کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔

چنانچہ اسی ذہنی خلفشار کے عالم میں سرینگر میں تشتت وافتراق نے اپنے ڈیرے ڈال دئے۔ مدافعت و مقابلہ اور حفاظت کی تمام تدبیریں بے سود ثابت ہوئیں اور متعدی وبا خطرناک صورت اختیار کر گئی۔ جس سے مخالفوں کے

گھروں میں گھی کے چراغ جل اٹھے اور خوشی اور تہنیت کے شادیانے بجنے لگے

تحریک کی فوری کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانان ریاست باہم یک دل ویک جان تھے۔ دوست اور دشمن اپنے اور بیگانے کی تفریق کو بالائے طاق رکھ کر ایک ہی عزم کو لے کر میدان عمل میں کودے تھے اور وہ عزم تھا حکومت کے جبر واستبداد کی جڑوں کو کاٹ ڈالنے کا۔

میر واعظ اور شیخ محمد عبداللہ:۔

یہ ایک بڑا دشوار کام تھا لیکن ان کے ارادے اور باطل شکن اتحاد نے سالوں کا کام دنوں میں پورا کر دیا۔ وہ اس وقت مخالفین کے مقابلے پر اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ کی زندہ تصویر تھے۔ لیکن تحریک کے دوسرے سال ہی سرینگر میں میر واعظ کشمیر اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان شدید اختلافات رونما ہونے شروع ہو گئے۔ اختلافات کی یہ باہمی جنگ یقیناً مفادِ ملت کے خلاف تھی۔ دیکھا جائے تو اقتدار کی اس جنگ کے لئے یہ کوئی موزوں وقت نہ تھا۔ میر واعظ کو احساس ہو چلا تھا کہ عبداللہ اب ہماری خاندانی پوزیشن کو ملیا میٹ کر دیگا۔ اور میر واعظوں کا قدیمی وقار واعتبار ختم ہو جائیگا۔ ادھر شیخ محمد عبداللہ جانتے تھے کہ جب تک میر واعظ کا گھر سیاسی، مذہبی اور قومی لحاظ سے سالم وثابت ہے وہ کشمیر کا واحد لیڈر نہ بن سکے گا۔ اس معاملہ میں ابتداء کس نے کی۔ میرے لئے یہ ذرا ٹیڑھا اور مشکل سوال ہے۔ اسلئے میں اس کا جواب یا تو عوام پر چھوڑتا ہوں یا شیخ صاحب اور میر واعظ پر۔ بہر حال نتیجہ یہ ہوا کہ یہ جنگ اس تیزی سے چھڑ گئی کہ اسکا تھم جانا اب آسان نہ تھا۔ مسلم کانفرنس سے متعلق اور شیخ محمد عبداللہ سے قریبی مراسم ہونے کی وجہ سے مجھے بھی اس کشمکش میں پہلے مسلم کانفرنس کے جنرل سیکرٹری اور پھر صدر ہونے کی وجہ سے ایک

فریق بنناپڑا۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے سیاسی اختلافات کے باوجود میرواعظ صاحب کی ذاتی حیثیت کو کبھی کسی کیلئے نہ برا محسوس کیا اور نہ ان کی شرافت اور علم کا مجھ سے انکار بن آیا۔اور باوجود اختلافات کے شیخ محمد عبداللہ اور میں دونوں اس بات پر متفق تھے کہ میرواعظ بذات خود نیک اور قومی اعتبار سے حساس ہیں جو کچھ قصور ہے وہ ماحول کا ہے۔

تفرقه کے اثرات ونتائج:۔

میرواعظ صاحب کے احبابِ خاص رجعت پسند لوگ رہے ہیں۔ اگر کبھی انتہا پسندوں نے انہیں مشورہ دیا بھی اور شیخ محمد عبداللہ سے ان کی سیاسی رفاقت ہوگئی تو یہ سلسلہ کبھی دیرپا ثابت نہ ہوسکا۔اندریں حالات میرواعظ اپنی رجعت پسند مجلس مشاورت کی وجہ سے بامِ عروج سے فرشِ زمین پر آگرنے پر مجبور ہوگئے۔ادھر شیخ محمد عبداللہ کے اہالی موالی چھٹے ہوئے شریر تھے اور ان کے مفادات دنگہ،فساد سے وابستہ تھے۔کشمیر کے دونوں لیڈروں کی باہمی سرپھٹول میں حکومت کی چاندی تھی۔چنانچہ حکومت کے ایک عنصر نے ہماری پیٹھ ٹھونکنا شروع کردی اور دوسرے نے میرواعظ پارٹی کی۔ہم اپنی جگہ خوش تھے کہ حکومت کی اکثریت ہمارے ساتھ ہے اور حکومت اپنی جگہ مطمئن اور مسرور تھی کہ ان عقل کے اندھوں کو اچھی طرح بیوقوف بنایا جارہا ہے۔

سرینگر میں باہمی کشمکش کا یہ سلسلہ اس حد تک طول کھینچ گیا کہ ایک پارٹی کا مستحسن اقدام اور کارکردگی بھی دوسری پارٹی کیلئے باعث تنقید ہوگئی۔ایک وقت آیا کہ دونوں پارٹیوں کے چیدہ چیدہ لیڈروں کو حکومت نے یوں ہی غیر رسمی طور پر گرفتار کرلیا۔میں ان ایام میں جموں میں تھا۔اس باہمی رسہ کشی کی وجہ سے مجھے بھی گرفتار کرکے قلعہ باہو میں منتقل کردیا گیا۔نوماہ کی سزادی گئی لیکن چونکہ یہ گرفتاری سیاسی حالات کی بنا پر نہ تھی اسلئے ہم سب میعاد سزا سے

کچھ پہلے ہی رہا کر دیئے گئے۔ شیخ محمد عبداللہ اور میر واعظ کی پارٹیوں کا اختلاف سری نگر تک ہی محدود نہ رہا۔ بلکہ سارے صوبہ کشمیر میں پھیل گیا۔ مسلم کانفرنس منظم جماعت تھی اس لئے کارکنوں کی تعداد بھی بے شمار تھی۔ جو تمام کے تمام آزمودہ کار تھے۔ اور قید و بند کے مصائب جھیلنے کیلئے ہر وقت تیار رہے تھے۔ اس کے برعکس میر واعظ میں یہ باتیں مفقود تھیں۔ اس لئے آخر کار میر واعظ کا پہلا رسوخ واثر بہت کم ہو گیا۔ اور ان کی تحریک اپنے ذاتی حلقہ اثر تک محدود ہو کر رہ گئی۔ میر واعظ اپنے مخصوص مذہبی ماحول کی وجہ سے قید و بند کے لئے موزوں نہ تھے۔ گو قید و بند کے معاملہ میں شیخ محمد عبداللہ بھی پھسڈی واقع ہوئے تھے جو ہمیشہ چور دروازہ کے ذریعہ ہی جیل سے باہر آئے۔ لیکن وقت کی پکار، ضرورت اور مجبوری کے "محاسن" سے وہ خوب واقف تھے۔

فرنچائز رپورٹ:۔

میں بتا چکا ہوں کہ مارچ ۱۹۳۳ء میں مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کے مطالبہ پر حکومت نے اسمبلی کیلئے ضمنی قواعد کی تیاری کے متعلق وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے دسمبر ۱۹۳۳ء یا آغاز ۱۹۳۴ء میں ایک آفیشل کمیٹی کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ جس کا چیرمین ایک انگریز مقرر ہوا۔ اس کمیٹی کی رپورٹ بے حد مایوس کن تھی۔ اور تو اس رپورٹ کی رو سے اسی فی صدی مسلم آبادی کا تناسب اسمبلی میں پچاس فی صدی کے قریب مقرر کیا گیا۔

۷۵ کے ایوان میں منتخب نشستیں صرف ۳۳ تھیں اور باقی سب نامزد اور سرکاری نشستیں مقرر کی گئیں۔ اختیارات کے لحاظ سے بھی یہ اسمبلی ایک کھلونا بنا دی گئی۔

سیالکوٹ میں مجلس عاملہ کا تاریخی اجلاس:۔

مسلم کانفرنس نے اس رپورٹ کے خلاف صرف احتجاج ہی نہیں کیا بلکہ

اسے غیر رسمی طور پر نا قابل قبول بھی قرار دیا۔ اس کے بعد مسلم کانفرنس نے اسمبلی کی بابت اپنی جنرل کونسل اور مجلس عاملہ کے اجلاس آغاز فروری ۱۹۳۴ء میں بمقام سیالکوٹ منعقد کئے۔ کیونکہ احتمال تھا کہ حکومت اندرون ریاست میں یا تو ان اجلاسوں پر پابندی عائد کردے گی یا ممبروں کو ایک ہی وار میں گرفتار کرلے گی۔ اجلاس میں کافی بحث وتمحیص ہوئی۔ شیخ محمد عبداللہ کے سوا باقی تمام ارکان اسمبلی کے بائیکاٹ اور تحریک کے اجرا کے حق میں تھے۔ چنانچہ بھاری اکثریت نے اسمبلی کے بائیکاٹ اور تحریک کے اجراء کے حق میں اپنا فیصلہ صادر کردیا۔ اب سوال پیدا ہوا کہ جماعتی آئین کو معطل کرکے ڈکٹیٹر شپ قائم کی جائے۔ اجلاس نے متفقہ طور پر مجھے تحریک کا ڈکٹیٹر مقرر کردیا۔ شیخ محمد عبداللہ نے تحریک میں گرفتار ہونا تو درکنار اس کیساتھ تعاون کرنے سے بھی انکار کردیا۔ یہ رویہ اول خود ان کے حق میں اور آخر کار جماعت کے حق میں مضر ثابت ہوا۔

گرفتاریوں کا سلسلہ :۔

اِجلاس کے اختتام پر جب ہم جموں واپس پہنچے تو مجھے اور میرے چند رفقا کو دوسرے ہی دن گرفتار کرلیا گیا اور متعدد علاقہ جات کے کارکنوں کو بھی منزل مقصود پر پہنچنے سے قبل راستہ ہی میں پکڑ لیا گیا۔ یہ واقعہ فروری ۱۹۳۴ء کا ہے۔ ریاست کے اطراف واکناف میں تحریک کا اثر تو ہوا اور شہروں اور قصبہ جات میں تحریک جاری بھی ہوگئی۔ لیکن چونکہ حکومت نے مسلم کانفرنس کو تیاری کی مہلت نہ دی اور نہ ہم خود تیاری کیلئے مناسب تدابیر اور پیش بندی کرسکے۔ اسلئے تحریک کو وہ کامیابی نصیب نہ ہوسکی جو ہمارے ذہن میں تھی۔ کارکنوں کو مختلف میعاد کی سزائیں ہوئیں۔ مجھے ایک سال کی سزا دی گئی۔ شیخ محمد عبداللہ لاہور چلے گئے۔ ان کی اس پالیسی کی وجہ سے تحریک پر بھی بہت حد تک ناخوشگوار اثر پڑا۔ اور ان کے خلاف ریاست بھر میں بالخصوص صوبہ جموں میں

ناراضی اور مخالفت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس دفعہ پھر مجھے جموں ہی میں گرفتار کرلیا گیا تھا۔ مقدمہ کی سماعت کے بعد مجھے سنٹرل جیل جموں سے اودھم پور ڈسٹرکٹ جیل منتقل کردیا گیا اور ایک سال کی تمام سزا میں نے اسی جیل میں کاٹی۔ سزا کے پہلے چار ماہ تک ساغر صاحب میرے ساتھ اسی جیل میں رہے لیکن ان کی سزا جلد ختم ہوگئی اور میں نے قید کا بقیہ حصہ تنہا بسر کیا۔

غداری:۔

تحریک کچھ عرصہ تک تو کامیابی کے ساتھ چلتی رہی لیکن جموں کے ایک دوست نے جو پہلے "یکے از نمائندگان" تھے اور جو بعد میں حکومت کے خیمہ بردار بن چکے تھے تمام طول وعرض ریاست میں بالخصوص ان مقامات پر جہاں تحریک زوروں پر تھی زبانی اور تحریری اطلاعات بھیج دیں کہ غلام عباس کے حکم سے تحریک ملتوی کردی گئی ہے۔ اس لئے تمام لوگ غیر آئینی اور خلاف قانون باتوں سے احتراز کریں۔ عوام نے قدرتاً اس خبر پر اعتبار کیا۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہوگئی۔ بعد میں جب جماعت کو اس حقیقت حال سے واقفیت ہوئی تو وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ جب اپنے ہی مار آستیں ثابت ہوں تو اعداء اور اغیار کا کیا شکوہ!

جیل میں شیخ محمد عبداللہ سے ملاقات:۔

اسیری کے تین چار ماہ کے بعد شیخ محمد عبداللہ اور وہی دوست اودھم پور جیل میں باجازت حکومت مجھ سے ملے۔ ملاقات کی غرض یہ تھی کہ اسمبلی کے انتخابات میں تعاون کیلئے مجھے مائل کیا جائے۔ ایسے موقعوں پر اسیروں کو ہم خیال بنانے کیلئے بیرونی سیاست کا نقشہ انتہائی مایوسانہ اور بھیانک طریقہ سے کھینچا جاتا ہے۔ تاکہ محبوس خائف اور پریشان ہوکر مقابلہ کی سکت پہلے ہی کھودے۔ مجھ پر بھی یہی حربہ استعمال کیا گیا۔ لیکن مجھے افسوس صرف شیخ محمد عبداللہ پر ہوا کہ وہ بھی رجعت پسندی کے عمیق گڑھے میں گر رہے تھے۔ مجھے

اس گفتگو کے دوران یہ یقین دلایا گیا کہ اسمبلی کے ساتھ تعاون کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ تمام سیاسی اسیر آزاد کردئے جائیں گے۔ مجھے ان دوستوں کی گفتگو پر تعجب بھی ہوا، ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔

میں نے ان کو مجلسِ عاملہ اور جنرل کونسل کے فیصلوں سے آگاہ کیا اور صاف بتادیا کہ کم از کم میں قوم کے مفاد کے پیش نظر کردہ زہر کی پڑیا کو حلق سے اتارنے کیلئے قطعاً تیار نہیں۔ وہ مایوس ہو کر چلے گئے

اِنتخابات:۔

میری حالتِ اسیری میں انتخابات بھی ہوئے اور شیخ محمد عبداللہ نے اپنے حلقہ اثر میں انتخابات میں امیدوار کھڑے کر کے انتخابی مہم میں پوری دلچسپی بھی لی۔ جب جیل میں مجھے شیخ محمد عبداللہ کے اس طرز عمل کا علم ہوا تو بہ حیثیت اسیر میرے دل ودماغ پر جو گزری وہ میں ہی جانتا ہوں۔ انتخابات کی مہم ختم ہوگئی۔ اس عرصہ میں بے شمار اسیر اپنی معیادِ اسیری کاٹ کر جیل سے باہر تو چلے گئے لیکن یہ کارکن باہر جا کر جماعتی تنظیم یا قومی کام کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ کیونکہ ان کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہ تھا۔

چند ماہ کے بعد شیخ محمد عبداللہ کو ہوش آیا اور ان کو فکرِ فردا نے جماعتی تنظیم کیلئے مجبور کیا۔ وہ سمجھ گئے کہ اگر مسلمانوں کے یہی لیل ونہار رہے۔ تو اس صورت میں نہ مسلم کانفرنس زندہ رہ سکے گی اور نہ قومی رہنما سیاسی لحاظ سے زندہ رہ سکیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بمقام سوپور ۱۹۳۴ء کے وسط میں مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس کا اہتمام کیا۔ جلسہ اگرچہ کامیاب نہ ہو سکا پھر بھی اس سے جماعت کے نام کو قائم اور زندہ رکھنے کی ایک امید پیدا ہوگئی۔

تیرہواں باب

اسیری میں نئے تجربات

اس دفعہ میری جیل کی زندگی نے میری کتاب کے تجربات کے تمام ابواب کو یکسر بدل ڈالا۔ ایک سال کے حالات اسیری نے زندگی میں کئی بابوں کا اضافہ کیا۔ جس کی وجہ سے میری زندگی میں بہت سی تبدیلیاں پیدا ہوگئیں۔ اسکی متعدد وجوہ تھیں۔ ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ اس سے پہلے ہمیشہ سلسلہ قید و بند کے باعث قومی جدوجہد کسی نہ کسی رنگ میں حکومت کے مقابلہ پر ہمیشہ کامیاب و کامران ہی رہتی تھی۔ جس سے عوام کے حوصلے بلند رہتے تھے۔ لیکن اب کے وہ بات پیدا نہ ہوسکی۔ میری مختصر سی سیاسی زندگی میں یہ پہلا اعتراف شکست تھا۔ اس سے قبل ہمیشہ مجھے یہ زعم رہا کہ جو بات جماعت کے منہ سے نکلے گی۔ حکومت اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوگی۔ لیکن اب یہ محسوس ہوا کہ جس طرح مہوس ہر نئے تجربہ کے وقت پر امید اور خوش فہم ہوتا ہے اسی طرح سیاسی جماعتیں بھی میدان عمل میں اتر کر ہر بار گمان کر لیتی ہیں کہ بس اب ہم منزل مقصود تک پہنچ جائیں گی۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ اس ناکامی سے یقین ہوگیا کہ دنیا کو قابو میں لانا اتنا آسان کام نہیں جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ بالخصوص دنیائے سیاست کی تسخیر صبر و شکیب، شکست و ناکامی استقلال، عزم بالجزم اور ہزاروں دشواریوں کے تحمل کے بعد بھی ناممکن ہوسکتی ہے اور طاغوتی طاقتوں کو سرنگوں کرنے اور ان کی تکبر اور پندار سے اکڑی ہوئی گردنوں اور تنے ہوئے جسموں کو جھکانے، نشۂ جبر و استبداد سے انکے بگڑے ہوئے دماغوں کو درست اور متوازن کرنے کیلئے ایک عمر درکار ہے اور یہ مہم

صرف جذباتی نعروں اور قید و بند کی صعوبتوں یا خالی خولی باتوں سے سر نہیں ہوا کرتی۔ چنانچہ اس حقیقت ثانیہ نے میری آنکھیں کھول دیں اور اس سے آئندہ زندگی کے لائحہ عمل پر معتد بہ اثر پڑا۔

قید وبند کی مسرتیں :-

دوسری وجہ یہ ہوئی کہ قید کا بیشتر حصہ مجھے تنہائی میں بسر کرنا پڑا۔ مجھے سال بھر روزانہ بند کمرے میں مقفل کر دیا جاتا اور یہ واقعہ ہے کہ مجھے پورے ایک سال تک کبھی چاند دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ میرے کمرے کا صرف ایک دروازہ تھا اور اس دروازہ کا رخ چاند کی مخالف سمت میں تھا۔ اس جیل کی بیرونی دیواروں کی لمبائی چوڑائی اور اونچائی علی الترتیب غالباً ۴۰، ۳۵، ۲۰ فٹ ہونگی۔ عمارت عین صحن کے مرکز میں واقع تھی۔ اس لئے میرے کمرہ سے بیرونی دیوار کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ آٹھ فٹ ہوگا۔ اندریں حالات گرمیوں اور برسات کے مہینوں میں ہوا کا ایک جھونکا بھی شاذ و نادر ہی نصیب ہوتا تھا۔ میں نے ابتدا میں بہ توسل جائز جیل خانہ جات کے بڑے افسر سے جو انگریز ڈاکٹر تھا، موسم گرما میں رات کے وقت صحن میں سونے کی اجازت چاہی لیکن صاحب بہادر نے جو تحریری جواب بھیجا ستم ظریفانہ بھی تھا اور مضحکہ خیز بھی۔ صاحب بہادر نے لکھا کہ رات کو صحن میں سونے سے خطرہ ہے کہ قیدی دیوار پھاند کر مفرور ہو جائے اس لئے یہ اجازت خارج از بحث ہے۔ میں اس سکھا شاہی فیصلہ کو ٹھکرانے کے اسباب مہیا کر سکتا تھا لیکن میرے دل نے فیصلہ کیا کہ اس طرح قید و بند کی لذت بے مزہ اور کم ہو جائے گی۔ اس لئے میں نے صبر و سکون سے کام لیا۔

ڈسٹرکٹ جیلوں میں قیدیوں کی تعداد عام طور پر دو چار سے کبھی زیادہ

نہیں ہوتی۔ لیکن اس جیل میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ تقریباً تین ماہ تک اخلاقی قیدیوں سے جیل بالکل خالی رہا۔ جیل کے اندر صرف ایک پہرہ دار ،وارڈر ہوتا ہے۔ صاحب بہادر کے خیال کے برعکس جیل کے عملے کو یقین تھا کہ نہ میں بھگوڑا ہوں اور نہ پیشہ ور چور کہ کمرے کے اندر سے باہر کے قفل کو توڑ سکوں اور نہ اتنا چالاک اور تجربہ کار ڈاکو کہ کسی طرح کمرہ سے باہر نکل سکوں۔ اور زمین سے جست لگا کر ۲۰ فٹ اونچی دیوار پر پہنچ جاؤں۔ یہی وجہ تھی کہ تین ماہ کے عرصے میں رات کے وقت کبھی کسی وارڈر نے پہرے پر اندر آنے کی زحمت نہ اٹھائی۔

خطرات اور ان پر قابو:۔

میں سانپ' اونٹ اور آوارہ گرد سانڈوں سے ہمیشہ خائف رہا ہوں۔ ایسے سانڈوں کی شہر جموں میں کثرت ہے۔ شہر کے تمام بازاروں میں چپے چپے پر پالتو سانڈ خرام ناز سے چلتے رہتے ہیں کیونکہ بقول آلڈوس ہکسلے اُن کی بے راہ روی اور آوارہ گردی پر کوئی محاسبہ نہیں۔ جیل کی چار دیواری کے اندر اُن کا تو گزر مشکل تھا لیکن جیل کے چاروں طرف جنگل ہونے کی وجہ سے سانپوں کی بہتات تھی اور وہاں میرے ہوتے ہوئے کئی سانپ مارے بھی گئے۔ اِن حالات میں جبکہ میں جیل میں تنہا بھی تھا۔ رات کو وارڈروں کی بے رُخی نے دو چار دِن مجھے محض سانپوں کے خوف سے پریشان بھی رکھا۔ یہاں تک کہ رات کو جب کبھی کسی کونہ سے ذرا سی سرسراہٹ ہوئی، میں نے یقین کرلیا کہ یہ سانپ ہے اور سانپ کے تصور کے ساتھ ہی آوارہ سانڈوں کا خیال بھی میرے دماغ میں آجاتا۔ دو چار راتیں میں نے اسی اضطراب میں کاٹیں۔ لیکن کسی وارڈر یا اہل کار کو جتایا تک نہیں کہ اُنکی غیر حاضری قابل اعتراض ہے۔

آخر ایک ہفتے کی کشمکش کے بعد میں اس معمول سے مانوس ہو گیا۔ دن کو تو کسی پہرہ دار کی شکل نظر آجاتی تھی لیکن رات کے وقت میں اپنا رفیق خود ہوتا۔ مجھے یقین کامل تھا کہ یہ آزمائش خدا کی طرف سے ہے۔ لیکن تنہائی اور تنہائی بھی جیل کی۔ اس کے دو ہی نتیجے ہو سکتے تھے۔ یا تو میرے حوصلے چھوٹ جاتے یا میں آزمائش کی یہ منزل صبر و شکیب کے ساتھ مردانہ وار طے کر جاتا۔ حسنِ اتفاق ہے کہ اول الذکر حالت کا اثر میرے دِل پر نہ ہوا۔ انسان کی سب سے بڑی کمزوری اُس کا دُنیاوی ماحول، اِس کے عزیز و اقارب، دوست احباب اور اہل و عیال ہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اِس زمانہ میں مجھے دنوں چھوڑ، ہفتوں تک جیل کی چار دیواری سے باہر کی دُنیا کا خیال اور احساس تک نہ ہوتا۔ گویا قدرت نے میرے دِل و دماغ میں سے خود میرے خویش و اقارب اور بچوں تک کی یاد محو کر دی۔

تنہائی کے فوائد:۔

اختتامِ قید کے لگ بھگ تو میری یہ حالت تھی۔ اور یہ احساس تھا کہ باہر جا کر شاید ہی دُنیا کے دھندوں کے قابل رہ سکوں گا۔ لیکن انسان دراصل قدرت کا ایک کھلونا ہے اور محض ایک آلۂ کار۔ اپنے ماحول اور حالات کا تابع۔ وہ ماحول کا سب سے زیادہ اُسی وقت محتاج ہوتا ہے جب بہ خیالِ خود یہ باور کر لیتا ہے کہ اُس نے اُسے مسخر و مطیع کر لیا ہے۔ اور یہ انسانی طلسم اُسی وقت جا کر ٹوٹتا ہے جب انسان اپنے گرد و پیش کے حالات میں تبدیلی اور نیا پن پاتا ہے۔ دُنیا میں معدودے چند اہل کمال ہی ایسے ہونگے جو ماحول کی کثافتوں سے بالاتر رہ سکے ہوں۔

عالمِ تنہائی میں اگر وساوسِ شیطانی، خیالاتِ فاسد، جذباتِ حیوانیہ اور

دنیوی خواہشات کا گزر نہ ہو، دماغی توازن، اعتدال قلبی، عواطف نفسی میں کوئی بیرونی خلل اور فتور پیدا نہ ہو، تو تنہائی کی یہ زندگی انسان کی بے شمار اندرونی کثافتوں اور نجاستوں کو خود بخود بہت حد تک صاف کر دیتی ہے۔ انسان خالی الذہن ہو کر اپنی ظاہری و باطنی حالت کا اچھی طرح جائزہ لینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے ماضی پر غور کر سکتا ہے اور اپنے مستقبل کی تیاری کا محاسبہ کر سکتا ہے۔ اپنی کمزوریوں کا جب دوسروں کی کمزوریوں سے موازنہ کرتا ہے تو اُسے اپنے مقابلہ میں دوسروں کی کمزوریاں ہیچ نظر آتی ہیں۔

جیل میں داخل ہوتے ہی مصائب کے اسباب ظاہری باہر رہ جاتے ہیں۔ اور جہاں تک ذہنی، دماغی اور قلبی معصیت کا تعلق ہے یہاں کا ماحول اور خصوصاً تنہا ماحول اس کی اصلاح اور تزکیہ کر دیتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے اِن باتوں کے لئے یہ شرط لازم ہے کہ انسان شیطان رجیم کی دست برد اور یورش سے محفوظ و مامون ہو۔

احتساب نفس:۔

مجھے تنہائی کی زندگی کے اس طویل عرصہ میں غور و فکر کا کافی موقع ملا۔ میں نے ٹھنڈے دِل سے اپنے آپ کو اپنا ہی ثالث اور محاسب جان کر غیر جانب داری سے ایک ایک کر کے اپنے محاسن و معائب کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہ چیز انسانی فطرت میں داخل ہے کہ جب وہ آزاد ہو اور سوسائیٹی میں اپنی پوزیشن کو ممتاز نہیں تو کم از کم دوسروں کے برابر ہی سمجھتا ہو ایسی حالت میں اس کی ذہنی جانچ پڑتا ل کے پلڑے کا جھکاؤ ہر معاملہ میں اپنی طرف ہی ہوتا ہے۔ وہ ہر حالت میں اپنے آپ کو تمام دُنیا کے مقابلہ پر برتر و بالا سمجھتا ہے۔

اُسے یہ یقین بھی اکثر متفکر و مغموم کرتا اور ستاتا رہتا ہے کہ تمام دُنیا کے انسان کیوں اُس کے نیک خصائل کے معترف و مداح نہیں ہوتے۔ انسان کو اس ماحول میں آئینہ عالم کے مقابل ہوکر اپنا چہرہ ستھرا ستھرا اور اپنا دل ایمان کی دولت سے بھرپور معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دوسروں کا چہرہ کالا کلوٹا اور اُن کا دِل ظلمت و عصیاں سے معمور نظر آتا ہے۔ اُسے اپنے اندر کوئی نقص، کوئی کوتاہی، کوئی اخلاقی کمزوری، کوئی مذہبی اور قومی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن اسکے مقابل پر عوام تو درکنار خدا کے مقبول و محبوب بندے بھی اس کی نظروں میں ہرلحاظ سے ناقص اور کمزور دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے تمام بُرے کام اچھے اور دوسروں کے اچھے کام کچھ بُرے سے نظر آتے ہیں۔ میری بھی شاید آج تک یہی کیفیت تھی لیکن اب میں نے اپنے گریباں میں مُنہ ڈالا اور اپنی سابقہ زندگی کا موازنہ کیا تو میری کم نگاہی اور خودسری کے تمام پردے ایک ایک کر کے چاک ہونے شروع ہوگئے اور میں نے اس کی تلافی کے لئے اپنی بساط اور توفیق کے مطابق پوری کوشش شروع کردی۔

طبیعت کا ٹھہراؤ اور سُلجھاؤ:۔

باہر آنے پر مجھ میں کیا انقلاب آیا چھوٹوں، بڑوں، دشمنوں اور دوستوں کے ساتھ میرے طرزِ عمل اور خلوص میں کس قدر فرق پڑا، میرے مزاج، میری طبیعت اور ذات میں کتنی تبدیلی واقع ہوئی، کیا میری نخوت و پندار کے بُت ٹوٹ گئے، کیا بغض وحسد کے جذبے مدہم پڑ گئے۔ اور کیا صبر واستقلال، اتقاء، توکل، صداقت و دیانت کے اوصاف تھوڑے بہت مجھ میں پیدا ہوئے یا نہ ہوئے۔ یہ تمام سوالات ہیں جن کے جواب میں حقیقتاً میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کا فیصلہ میرے احباب خصوصاً میرے نکتہ چینوں کا کام ہے۔ لیکن جیل میں

میں نے جو کچھ حاصل کیا وہ یہ تھا کہ میرے خیالات اور خوش فہمیوں کے کئی ہوائی قلعے مسمار ہو گئے اور اُن کی جگہ میں نے حقیقت اور واقفیت کی مضبوط بنیادوں پر ایک نئے گھر کی طرح ڈال دی۔ میری طبیعت میں ٹھہراؤ اور سلجھاؤ پیدا ہو گیا۔ قناعت اور سنجیدگی میں بھی کچھ اضافہ ہوا۔ اس سے قبل ان چیزوں کی کمی میں خود محسوس کرتا تھا۔ تقریر و تحریر میں حکومت کے ساتھ بات چیت میں اور لوگوں کے ساتھ مباحثوں میں بارہا میں نے معاملہ فہمی، تدبر اور غور و فکر سے کام نہ لیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ بایں ہمہ ان موقعوں پر قدرت میری مدد کرتی رہی۔ یہی نہیں بلکہ جیل کی طویل سکونت اور تنہائی کی وجہ سے میری ذکی الحس جذباتی طبیعت میں بھی نمایاں تبدیلی واقع ہو گئی۔ جذبات کی رو میں میں اب بھی کبھی کبھار بہہ جاتا ہوں۔ اس کا میری ہمت پر بھی اثر پڑ چکا ہے۔ تاہم اس دفعہ جیل سے باہر آنے کے بعد میری اس افتادِ طبع میں واقعی قابل قدر فرق پڑ گیا۔ میرے اظہار و بیان کے طریقے اور ہر کہ دمہ کے ساتھ برتاؤ اور سلوک کے قرینے اور سلیقے میں بھی کئی نئے پہلو نمایاں ہو گئے۔ اس کے بعد حتی الوسع میں نے چھوٹوں کو کبھی چھوٹا نہ سمجھا اور بڑوں کو خواہ کتنا ہی اختلاف عقائد کیوں نہ رہا ہو بڑا ہی سمجھا۔ حتی المقدور میری یہی خواہش رہی کہ میری زبان اور قلم میرے طریقِ کار اور طرزِ عمل سے کسی کا دل نہ دکھے اور مجھے یہ پورا احساس و اعتراف ہے کہ اس آخری خوبی یا نقص نے دنیائے سیاست میں مجھے فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچایا۔ کیونکہ یہ چیز آہستہ آہستہ علامت ہو جاتی ہے شرافت یا کمزوری کی اور آج کل کی لغت سیاست میں یہ باتیں بیکار سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن بہر حال تنہائی کی زندگی نے میرے اندر یہ انقلاب پیدا کرنے میں کافی مدد دی۔

مطالعہ:۔

جیل میں سب سے بڑا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ یہاں مجھے لٹریچر کے

مطالعہ کا کافی موقع ملا۔ میں ابتدا میں بتا چکا ہوں کہ اسکول اور کالج کے زمانہ میں میں نے کتب بینی حتیٰ کہ اپنی کتب نصاب سے بھی ہمیشہ احتراز کیا۔ تعلیم سے فراغت پانے کے فوراً بعد ہی مکروہات سیاست میں الجھ کر رہ گیا اور میری مصروفیت اتنی بڑھ گئی کہ مطالعہ کا وقت ہی نہ مل سکا۔ یا یہ کہ طبیعت شروع ہی سے مطالعہ کی چور تھی۔ اس لئے مصروفیات کا بہانہ پردہ پوشی کرتا رہا۔ اب قید تنہائی میں میرے لئے کوئی اور شغل نہ تھا۔ نماز کا میں بچپن میں عادی ضرور رہا لیکن آخر نماز میں کتنا وقت کاٹا جا سکتا ہے۔ لہٰذا میرے لئے قدرت نے مطالعہ کا موقع بہم پہنچا دیا۔ چنانچہ میں نے زیادہ تر مذہبی کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ قرآن حکیم کا میں نے اپنے خیال کے مطابق گہرا اور محققانہ مطالعہ کیا۔ متعدد اصحاب کی تفاسیر اور تراجم پڑھے۔ شدید سیاسی اختلافات کے باوجود میں اس بات سے انکار نہ کروں گا کہ مولانا آزاد کے ترجمان القرآن نے مجھے قرآن حکیم کے بیشتر حقائق اور رموز سمجھنے میں مدد دی۔ صرف سورہ فاتحہ کی تفسیر اور تشریح ہی میرے دل کی آنکھیں کھولنے کیلئے کافی تھی اور میں نے اسے بار بار پڑھا۔

میں نے مولانا محمد علی امیر جماعت احمدیہ کی انگریزی تفسیر القرآن بھی پڑھی۔ اس تفسیر کو چند مخصوص بنیادی اختلافات کے سوا معلومات کے لحاظ سے بہت مفید اور وسیع پایا۔ مولانا نذیر احمد مرحوم اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے تراجم کا بھی میں نے دوبارہ مطالعہ کیا۔ اس کے بعد سیرۃ النبی کی تمام جلدوں کا مطالعہ کیا۔ علامہ شبلی مرحوم اور مولانا سلیمان ندوی نے اس کتاب میں اپنے وسیع مذہبی، تاریخی، فلسفیانہ اور ادبی معلومات و کمالات کے جوہر دکھائے ہیں اور ہادی برحقؐ کے اسوہ حسنہ کے ایک ایک مبارک پہلو پر جس

فاضلانہ، محققانہ اور والہانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے مسلمان اگر چاہیں تو اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں ۔ مختصر یہ کہ جو شخص عشقِ رسول کا جویا ہو جو خدا اور قرآن کو سمجھنے کا خواہش مند ہو اسے سیرۃ النبی کے سوا غالباً دنیا میں اور کوئی بہتر مشغل زندگی نصیب نہ ہو سکے گی ۔ کوئی شقی القلب اور جادہ حق سے بھٹکا ہوا انسان بھی اگر اس کتاب کا چشمِ بینا سے مطالعہ کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ حقائق کی دولت سے مالا مال نہ ہو جائے ۔

میری خوش بختی نے کئی بار کے مطالعہ سے اس کتاب میں عرفان و ہدایت کے سینکڑوں خزائن اور حضور اقدس ؐ کے جمال کے بین نمونے دیکھے ہیں ۔ حق یہ ہے کہ خدا کو سمجھنے اور اس کے توحید کا قائل ہونے کیلئے قرآن کی رہنمائی از بس ضروری ہے اور خدا اور اس کی مقدس کتاب کو سمجھنے اور اس پر ایمان لانے کیلئے حضور پر نور علیہ ﷺ کو پہنچاننا ناگزیر ہے ۔ جو خدا کے حبیب صادق اور ہادئ برحق کو پہنچاننے اور جاننے سے قاصر رہا وہ نہ خدا کو جان سکا نہ قرآن کو اور شائد ایسے شخص کو خدا بھی جاننے سے انکار کر دے ۔

ہندو لٹریچر اور فلاسفی :۔

اسلامی کتب کے مطالعہ کے دوران مجھے اتفاقاً تلک کی مترجمہ بھگوت گیتا کا ایک نسخہ مل گیا ۔ گیتا گہرے مطالعہ کی محتاج ہے ۔ اس کتاب کی ابتدا ہی ظلم کے خلاف سے ہوئی ہے ۔ بقول قرآن حکیم خدا تعالیٰ نے ہر قریہ اور ہر بستی میں انسانی اصلاح کیلئے اپنے مرسل مبعوث کئے ہیں ۔ ہندستان کا یہ برصغیر بھی اس نعمت خداوندی سے محروم نہیں رہ سکتا تھا ۔ ممکن ہے اصل گیتا کا مصنف ایسی ہی کوئی مقدس ہستی ہو ۔

سوامی وویکانند اور سوامی رام تیرتھ کی بعض تصنیفات بھی میری نظر سے

گزریں۔ نفس کشی، گیان ودھیان ذکر وفکر، تصوف وروحانیت کے تذکروں اور طریقوں سے یہ کتب بھری پڑی ہیں۔ دنیا سے کنارہ کشی اور حصول روحانیت کے متلاشیوں کیلئے ان کی تعلیم میں بہت مواد موجود ہے۔ رام تیرتھ کے خیالات نے بالخصوص میرے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ قرآن حکیم کا جا بجا ارشاد ہے کہ تمام موجودات خدا نے انسان کے فائدے کیلئے پیدا کی ہیں۔ اور دیگر تمام مخلوقات کو انسان کے تابع کر دیا گیا ہے۔ اس نکتہ کی تشریح سوامی رام تیرتھ نے وضاحت سے کی ہے۔ چیتے، سانپ، بچھو غرض تمام درندے اور حشرات الارض جن سے انسان خائف ہوتا ہے دراصل وہ سب انسان کے سامنے عاجز اور بے دست وپا ہیں۔ یہ انسان کی اپنی روحانی اور اخلاقی کمزوری ہے کہ وہ انہیں اپنا دشمن یا اپنے سے طاقتور سمجھتا ہے۔ اگر اس میں قوت ارادی توکل علی اللہ موجود ہو تو پھر کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔

کوئی شے بذاتہٖ اچھی ہے نہ بُری، انسان کے اپنے خیالات ہی اسے ایسا بناتے ہیں اور انسان اپنے آپ کو جو کچھ سمجھے بالآخر وہی بن جاتا ہے۔ اسلئے اگر انسان صرف خدا کی ذات سے ڈرے جو خالق حقیقی ہے۔ تو پھر آقا اور بندہ کا رشتہ اتنا مضبوط و مستحکم ہو جاتا ہے کہ اس بندہ سے تمام مخلوق ارضی خود بخود سہمی رہتی ہے۔ ڈر اور خوف انسان کے اپنے دل کی پیداوار ہے اور یہ صرف اسی دل میں ڈیرے ڈال سکتا ہے جو معبود حقیقی کی یاد اور اس کے نور کی تجلی سے محروم ہے۔ دوسرے الفاظ میں جس دل میں ذکر الٰہی موجود ہو وہاں ڈر، اوہام اور بزدلی کا کیا دخل۔ یہ چیزیں وہیں رہ جاتی ہیں جہاں طاغوتی قوئے غالب ہوں۔

ریاضتِ مقبول:۔

البتہ مجھے ان دونوں ہند وصوفیا کی تعلیم میں گوشہ نشینی اور تخلیہ پسندی

کا اس حد تک پرچار پسند نہیں آیا کہ دنیا کو ترک کر کے بندھیاچل کے غاروں اور ہمالیہ کے دامن کی جھونپڑیوں میں پناہ لی جائے۔ ان کے خیال کے مطابق آدمی اسی طرح خدا کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔ یعنی رہبانیت کا پہلوانِ کتب میں بے حد نمایاں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان علائق دنیوی سے مبرّا اور خالی الذہن ہو کر اچھی طرح مصروف ریاضت و عبادت ہو سکتا ہے۔ اور اس بات میں جنگل اور پہاڑ کا قدرتی ماحول بھی اس کا ممد و معاون ہوتا ہے۔ لیکن واقع یہ ہے کہ طریقِ عبادت انسان کو ناکارہ محض بنا کر رکھ دیتا ہے۔ اس کی اس عبادت و ریاضت سے دنیا متمتع نہیں ہو سکتی

لا رهبانية فى الاسلام :۔

اسلام نے ایسے عبادت و ریاضت کی شدید ممانعت کی ہے اور بالآخر میں بھی ہر قسم کے جذبات سے بالاتر رہ کر یہی اخذ کرنے پر مجبور ہوا کہ اسلام کی عملی تعلیم ہی عین فطرت انسانی اور حالات زندگی کے مطابق ہے۔ ورنہ تارک الدنیا ہو کر تو چور اور ڈاکو بھی گرگِ کہن سال کی طرح شائد خدا رسیدہ بن سکتے ہیں۔ اس لئے مقبول ترین ریاضت و عبادت وہی ہے اور لذت و سرور بھی اسی ریاضت میں ہے جو دنیا کے جھمیلوں میں اشتغال اور محویت کے ساتھ ساتھ کی جائے۔ اس دنیا میں محبت کیلئے قدم قدم پر اسباب کشش موجود ہیں۔ جہاں حرص و آز کے دل فریب جال جا بجا بچھے ہوئے ہیں۔ جہاں قدم قدم پر دل لبھانے والے سامان عیش و عشرت کی کثرت ہے۔ جہاں جذبات حیوانیہ اور خواہشات شہوانیہ کی تسکین کیلئے انسان دیوانہ وار کیف و سرور دنیاوی کی منہ مانگی مرادیں پا سکتا ہے۔ جہاں کی فضا میں صبر و شکیب اور ضبطِ نفس کی شکست کے سامان موجود ہیں اور جہاں اہل و عیال، خویش و اقارب، دوست دشمن، فکر روزگار اور غم دنیا کی لاتعداد پابندیاں اور بالخصوص جہاں حق سوز اور معصیت

پرور حالات سے تمام کرہ ہوائی محیط و مسموم ہے۔ اسی ماحول میں اور اسی دنیائے امتحان و آزمائش میں رہ کر اگر انسان اس سے کم مقام پر بھی پہنچ سکے جو مقام دنیا سے منہ موڑنے والوں، عزت گزیں، خلوت نشین، سادھو، سنیا سیوں اور صوفیوں کو حاصل ہوتا ہے تو اول الذکر گروہ خدا اور دنیا کی نظروں میں لاریب بہتر اور زیادہ مقبول ہے۔

بہ تقاضائے حالات میں بھی ایک سال کیلئے جیل میں رہ کر گویا رہبانیت کے چکر میں پھنسا رہا۔ اس وقت میری عمر کم وبیش تیس سال ہوگی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ روحانی اور اخلاقی اعتبار سے میں یہ محسوس کرتا تھا کہ میری عمر میں بیس سال کی کمی اور تجربہ و تزکیہ نفس کے لحاظ سے بیس سال کا اضافہ ہوگیا۔ مگر ساتھ ہی میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میرے عمل کی اکثر قوتیں مضمحل ہو چکی ہیں یا آہستہ آہستہ مضمحل ہو رہی ہیں اور ان کی بجائے میرا دل و دماغ خیالات اور سوچ بچار کی صلاحیتوں سے معمور ہوگیا ہے۔ لیکن بقول گوئٹے سوچنا آسان ہے اور عمل کرنا مشکل اور دنیا میں انسان کیلئے سب سے بڑی مشکل بات اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ اس مقولہ کا اطلاق ہر شعبہ زندگی میں خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی، نجی ہو یا سماجی، مساوی طور پر ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی رہائی کے بعد یہی ہوا۔ تمام وہ خیالات جنہوں نے جیل کے اندر میرے دل میں آہستہ آہستہ اور غیر ارادی طور پر پرورش پائی تھی وہ ایک ایک کر کے دنیائے عمل کے طوفانوں سے ٹکرا ٹکرا کر بلبلوں کی طرح میرے صفحۂ دل سے مٹ گئے اور جو اس دست برد سے محفوظ رہے ان کی وجہ سے میری عملی سیاسی زندگی پر دنیاوی حیثیت سے اچھا اثر نہ پڑا۔ تاہم اس مرتبہ کی اسیری نے میری زندگی میں خاصا انقلاب پیدا کر دیا اور میں مختلف پہلوؤں سے اس زادِ راہ سے مستفیض ہوتا رہا۔ اس کی وجہ شائد یہ ہے کہ دنیا میں برے عمل تو ضائع ہو سکتے ہیں لیکن اچھے عمل انسانی کمزوریوں کے باوجود آسانی سے ضائع نہیں ہو سکتے۔

چودھواں باب

مسلم کانفرنس کی جدید تنظیم!

فروری ۱۹۳۵ء میں جیل سے باہر آیا تو حالات بدلے ہوئے تھے۔ لوگ بدل تھے، جماعتی تنظیم کا نام ونشان تک نہ تھا۔ شیخ محمد عبداللہ کے خلاف عام مسلمانوں خصوصاً نوجوان طبقہ میں ان کی تحریک سے لاتعلقی اور بعد میں انتخابات میں حصہ لینے کے باعث بے حد جذبہ ناراضی پیدا ہو گیا تھا۔ جو کارکن جیل سے رہا ہو کر آئے تھے وہ بھی ستانا چاہتے تھے۔ اور جو باہر تھے وہ مایوسی کی وجہ سے خاموش تھے۔ عوام کے سیاسی جوش وخروش میں نمایاں کمی ہو چکی تھی۔ میرے آزاد ہونے پر جموں میں اسمبلی کا اجلاس شروع تھا۔ مسلم کانفرنس کے گروپ کی تشکیل عمل میں آچکی تھی۔ اور اب وہ ایوانِ اسمبلی میں مصروفِ کار تھا۔ دنیا ایک طرف مسلم کانفرنس گروپ کو دیکھتی تھی اور دوسری طرف میری آزادی کے بعد مجھ کو اور طنزیہ مسکراہٹ سے کہہ رہی تھی کہ کیا طرفہ ماجرا ہے کہ مسلمانانِ ریاست کی واحد نمائندہ جماعت نے ایک طرف تو جماعتی حیثیت سے اسمبلی کا بائیکاٹ کر کے قید وبند کے مصائب برداشت کئے اور دوسری طرف جماعت کے صریح فیصلہ کے خلاف اور کارکنان جماعت کے محبوس ہونے کے دوران گروپ کی تشکیل عمل میں لائی گئی۔ اس تضاد کا کیا مطلب۔ اس جماعتی کمزوری اور بے راہ روی کے کیا معنی؟ لیکن عوام کی غلط فہمیاں جلد ختم ہو گئیں۔ یوں بھی عوام کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے اور اچھے اور برے دونوں قسم کے لوگوں کی لیڈری کم وبیش برقرار رہتی ہے۔ ورنہ عوام کی یادداشت اگر قوی

ہوتو پھر جماعتوں کی ترتیب اور قوم کی تنظیم مشکل ہو جائے۔ کشمیر کے تمام سربرآوردہ رہنما گو میرے ساتھ قید ہو گئے تھے لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہمارے آزاد ہونے سے قبل صوبہ کشمیر میں سیاسی زندگی کے آثار رونما ہو چکے تھے۔

کانفرنس کی تنظیم جدید:۔

ہماری رہائی کے بعد مسلم کانفرنس کو از سرِ نو منظم کرنے کیلئے مجلس عاملہ اور جنرل کونسل کے اجلاس طلب کئے گئے اور علاقہ جات میں سیاسی اور تنظیمی دوروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس طرح تین چار ماہ کے اندر پھر مسلم کانفرنس اپنے سابقہ اقتدار اور وقار کے مقام پر پہنچ گئی۔ بلکہ پہلے کی نسبت اسکے عمل میں زیادہ جذبہ پیدا ہو گیا۔ سیاسی تحریکوں میں اکثر ایسا ہی اُتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ ہر تحریک کے ختم ہونے یا کچلے جانے پر تشدد اور قید و بند کی وجہ سے عوام کی طبیعتوں میں کمزوری اور بے حسی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کا ردِ عمل ہمیشہ خاطر خواہ نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ مسلم کانفرنس کی تنظیم نو کے بعد شیخ عبداللہ کی خواہش پر دوبارہ کانفرنس کا سالانہ اجلاس سرینگر قرار پایا اور اس کیلئے میں صدر تجویز ہوا۔ یہ سالانہ اجلاس ۲۵، ۲۶ /اکتوبر ۱۹۳۵ء کو منعقد ہوا۔ مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ شیخ عبداللہ ان کے رفقاء اور مسلمانانِ کشمیر نے میری آؤ بھگت اپنے مقدور اور وسائل سے بڑھ چڑھ کر کی۔ دریائی جلوس اور جلسہ کے انتظامات، پنڈال کی آرائش اور مندوبین کے طعام و قیام کا اہتمام سب قابلِ تعریف تھا۔ اس اجلاس میں مندوبین کی نمائندگی بھی پہلے اجلاس کی طرح حوصلہ افزاء تھی۔ اس اجلاس نے جہاں ایک طرف مسلمانوں کے حوصلوں اور ارادوں کو پہلے کی طرح بلند کر دیا وہاں حکومت کے ایوانوں پر مسلمانوں کی اس نشاۃ ثانیہ سے تفکر اور پریشانیوں کی گھٹائیں چھا گئیں۔

مئی ۱۹۴۶ء میں اسلامیان کشمیر کی خوش بختی سے حضرت قائداعظمؒ سیاحت کی غرض سے کشمیر تشریف لائے۔ مسلم کانفرنس کی جانب سے میں نے مسلمانوں کے کثیر اجتماع میں ان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ حضرت قائداعظم کو دیکھنے اور ان کی خدمت میں باریاب ہونے کا میرا پہلا موقعہ تھا اور میرے لئے وہ ساعت حقیقتاً نیک اور زندگی کی سب سے سہانی گھڑی تھی جب میں نے قائداعظم سے پہلی بار مصافحہ کیا۔

ریاست میں تنظیمی دورے :-

میں نے صدارت کے دوران سیاسی دوروں کا وسیع پروگرام مرتب کیا۔ صوبہ کشمیر میں سوائے ضلع مظفر آباد کے تمام وادی کا سرسری دورہ ایک ہی دن میں ہوسکتا ہے۔ کیونکہ وہاں سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اور جہاں سڑکیں نہیں وہاں قدررت کا اپنا انتظام اس سلسلہ میں زیادہ اچھا ہے۔ لیکن صوبہ جموں قریباً تمام کا تمام ایک تو حدود اربعہ کے لحاظ سے بہت وسیع ہے دوسرے پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے اس کے ذرایع نقل وحمل قدرتاً ناقص اور نامکمل ہیں اس لئے یہاں زیادہ تر پیدل سفر کرنا پڑتا ہے۔ ان حالات میں صوبہ جموں کو منظم کرنا مشکل کام تھا۔ اس کے علاوہ شیخ عبداللہ کے لئے سب سے بڑی سہولیت یہ تھی کہ وادی کشمیر میں جو صرف اسی۸۰ میل لمبی اور چالیس میل چوڑی ہے۔ ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سب ایک زبان بولنے والے، ایک قومیت رکھنے والے، خدائے قدوس کو ایک ہی رنگ، ایک ہی ڈھنگ سے ماننے والے تھے۔ جن کا تمدن ایک لباس ایک چلنے پھرنے، کھانے پینے کا طور طریقہ ایک تھا اور جوان وجوہ کی بناء پر باہمی عزت وناموس، ہمدردی، خیر خواہی، محبت اور مودت، اتفاق واشتراک کے ذریعے ایک دوسرے سے پیوست تھے۔

۔اورایک مشترک سوز کے صحیح جذبات میں اتنے رنگے ہوئے تھے کہ ان کی مثال کم از کم ہندوستان میں ملنا مشکل ہے۔اس کے علاوہ ان کو نہ کبھی مولانا محمد علی مرحوم اور نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی جادو بیانیوں سے نہ مولانا ظفر علی خان اور مولانا شوکت علی مرحوم کی شعلہ فشانیوں سے دوچار ہونے کا اتفاق ہوا۔

اس وقت ہندوستان میں کیا ہو رہا تھا۔ سیاسی جماعتوں میں کشمکش کیوں تھی ۔ سول نافرمانی اور عدم تشدد کس کو کہتے ہیں۔ ہندوستانی پریس اور پلیٹ فارم سے کیا مراد تھی ۔ یہ تمام ایسی باتیں تھیں جو سرینگر کے معدودے چند تعلیم یافتہ مسلمانوں کے سوادیہات کے سادہ مزاج اور صاف دل کشمیریوں کی حدِادراک سے پرے تھیں۔ انکے جسم اور ان کی روحیں حکومت اس کے تشدد اور متواتر غلامی کے بوجھ تلے دب دب کر نڈھال ہو رہی تھی۔ اس لئے ان کو بیرونی سیاست اور بیرونی لیڈرشپ کا خیال تک نہ تھا۔ انہوں نے صدیوں پہلے وادی میں کسی سیاسی تحریک کا نام سنا تھا اور نہ کسی لیڈر کا۔ ۱۹۳۱ء میں ”اسلام زندہ باد“ کا نعرہ انہوں نے پہلی دفعہ سنا۔

صوبہ جموں :-

صوبہ جموں میں کوائف دگرگوں تھے۔ سفر کی دشواریاں ایسی کہ ایک ضلع سے دوسرے ضلع کی حد تک پہنچنے کیلئے ہفتوں کی کٹھن اور دشوار مسافت درکار تھی ۔ یہاں کے مسلمان قبیلوں اور برادریوں کے بندھنوں میں گرفتار تھے ۔ کہیں سید اور مغل، کہیں جاٹ اور گوجر، کہیں راجپوت اور چوہان، یعنی ہر قبیلہ دوسرے کے درپئے آزار، ایک ضلع کی بولی، وضع قطع، شکل وشباہت، تہذیب اور معاشرت دوسرے ضلع سے مختلف۔ اس کے علاوہ ریاستی اور غیر ریاستی کا اختلاف بھی صوبہ جموں میں کافی زوروں پر تھا۔ پھر یہاں کے بڑے بڑے

شہروں اور قصبوں کے لوگ ہندوستان کی تمام سیاسی تحریکوں سے کم و بیش واقف تھے۔ کیونکہ سرحد پر ہونے کے باعث یا ہندوستان اور پنجاب سے آمدورفت کی وجہ سے یا وہاں کے علماء وزعما کے مواعظ وتقاریر کے باعث اور سب سے زیادہ پنجاب کے ہم زبان ہونے کی وجہ سے یہاں کے لوگ سیاسی اور قومی مسائل سے کسی حد تک آگاہ تھے۔ اس وجہ سے لیڈر بھی انہوں نے اتنے دیکھے ہوئے تھے کہ وہ عبداللہ اور عباس پر جو ابھی نو آموز تھے تازہ واردانِ سیاست تھے بہت جلد یقین نہ کر سکتے تھے۔ ادھر اپنی فرقہ بندیوں اور ذات پات کے جھمیلوں سے بھی ان کو فرصت نہ تھی کہ وہ سیاست کی طرف متوجہ ہوں۔ اندریں حالات صوبہ جموں میں کشمیر کے مقابلہ پر تنظیم کے سلسلہ میں قدم قدم پر رکاوٹیں اور دقتیں تھیں۔ ایک دفعہ شیخ عبداللہ نے کسی معاملہ میں مجبور ہو کر مجھ سے خود کہا کہ اگر میں صوبہ جموں میں ہوتا تو کب کا میدانِ سیاست سے راہ فرار اختیار کر گیا ہوتا۔ جن حالات سے میں گزر رہا تھا ان نامساعد حالات میں مسلم کانفرنس کی شیرازہ بندی کوئی آسان کام نہ تھا۔ اگر یہاں کشمیر کی طرح شخصیت پرستی ہی موجود ہوتی تو بھی بڑی بات تھی لیکن یہاں بعض مسلمانوں میں بت پرستی کے باوجود شخصیت پرستی نام کو بھی نہ تھی۔ تاہم ادھر ہم نے بھی خدا کی اس مظلوم اور مقہور قوم کو بیدار کرنے کیلئے بقلبِ صمیم عزم بالجزم کر لیا تھا۔ دل میں سیاسی کام کا خاصہ جذبہ اور ولولہ موجود تھا۔ عوام کی پست حالی نے ہمیں ابھارا۔ مشکلات کے ہوتے ہوئے بھی قومی خدمت کے بے پناہ جذبہ نے مایوس نہ ہونے دیا۔

بہر حال صوبہ جموں کے تنظیمی دوروں کے پروگرام میں خلاف توقع مسلم کانفرنس کو بہت کامیابی ہوئی۔ نیت نیک ہو اور عمل بے غرض تو پہاڑوں

اور سنگین چٹانوں کی دشواریاں بھی عزائم کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتیں۔ آدمی کا دنیا میں سب سے بڑا اور مقدس کام فرض کا بجالانا ہے اور بقول گوئٹے فرض کی بجا آوری یہ ہے کہ وقت کی فوری مانگ کو پورا کیا جائے۔ اس لئے جس نے وقت کو کھودیا اور اس کی پکار، طلب اور تقاضا سے بے پروائی اور پہلوتہی کی اس نے سب کچھ کھودیا۔ وقت کبھی کسی کو معاف نہیں کرتا۔

بھدرواہ اور کشتواڑ:۔

میں نے صدارت کے ایک سالہ عرصہ میں تمام ریاست کشمیر کا دورہ کیا۔ بعض ضروری مقامات پر تو مجھے کئی بار جانا پڑا لیکن بھدرواہ اور کشتواڑ میں اس سال صرف پہلی بار گیا۔ یہاں کے مسلمان شیخ عبداللہ کے مخالف اور میرے عقیدت مند تھے۔ اس دورے میں میرے دو تین رفقاء بھی ہمراہ تھے۔ علاقہ کے مسلمانوں نے ہمارے استقبال کے سلسلہ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ قدم قدم پر اپنی محبت اور مہمان نوازی کے بے بہا پھول ہماری راہ میں بکھیر دئے اور اپنی آتش شوق کو شیفتگی اور عقیدت کے مختلف طریقوں سے ٹھنڈا کیا۔ چنانچہ بھدرواہ سے ایک ہفتے کے قیام کے بعد ہم جب کشتواڑ کی طرف روانہ ہوئے تو بھدرواہ کے تمام مسلمان بلالحاظ صغیر و کبیر ہمیں رخصت کرنے کیلئے تقریباً تین میل تک ہمارے ساتھ آئے۔ رخصت کے وقت وہ اتنا روئے کہ میں خود آبدیدہ ہوگیا۔ علاقہ بھدرواہ کے ہردلعزیز بزرگ منشی رسول ملک بھی ہمراہ تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی تھی۔ اس رات ہمارا قیام ''جائی'' میں تھا۔ ریاست کشمیر میں یہ وادی قدرتی مناظر اور خوبصورتی کے لحاظ سے مجھے بہت پسند ہے۔ اس کی اونچائی قریباً سات ہزار فٹ ہے اور بھدرواہ کے قصبہ سے یہ مقام قریباً آٹھ دس میل دور ہوگا۔ رات

ہم یہاں ٹھہرے لیکن صبح روانگی سے کچھ دیر بعد موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔
۔راستہ میں اگلے پڑاؤ تک آبادی کا کہیں نام تک نہ تھا۔ جتنا ہم آگے بڑھتے گئے بارش کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ پچھلے پہر تک ہم بمشکل آٹھ میل کا سفر طے کر سکے اور اب ایسے مقام پر پہنچے کہ یہاں سے تقریباً نصف میل تک راستہ بالکل بارش کی نذر ہو چکا تھا۔ اس جگہ سے دور نیچے ایک میل پر نالہ بہتا ہے۔ ۔ٹوٹے ہوئے راستہ کی وجہ سے ہمیں آگے جانے کیلئے اوپر سے نیچے نالہ تک آنا پڑا۔ یہاں پہنچے تو اوپر سے مٹی اور پتھر لڑھک لڑھک کر ڈھیر سے لگے ہوئے تھے۔ چلتے چلتے اس راستہ کے درمیان پہنچے تو اوپر سے اور مٹی اور پتھر لڑھکنے لگے اور ساری زمین متحرک ہو کر سرکنے لگی۔ یہی محسوس ہوا کہ اب بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے، کچھ مقامی رضا کار بھی ہمراہ تھے۔ ان میں سے بعض نے نالہ میں چھلانگیں لگا دیں لیکن ہم میں سے اکثر کیلئے ایسا کرنا محال تھا۔ غرض زندگی اور موت کی اس کشمکش میں پورے تین گھنٹے صرف ہو گئے۔ اور جب ہم اوپر راستہ کے دوسرے سرے پر پہنچے تو شام ہو چکی تھی ۔بارش نہ ہوتی تو ہم دوپہر تک منزل مقصد تک پہنچ جاتے۔ مگر ابھی آدھی سے زیادہ مسافت شائد باقی تھی۔ بھوک کی شدت سے کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ رات کے نو دس بجے ہم "کلودھار" پر پہنچے۔ اس جگہ کی بلندی دس ہزار فٹ ہے، یہاں سے ہمیں ابھی اور نیچے جانا تھا۔ بارش کی تسلسل اور شدت میں شروع سے اب تک کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ نو دس ہزار فٹ کی بلندی پر سردی کا اندازہ شدید بارش میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں صورت یہ تھی کہ ہم مسلسل بارش میں آٹھ گھنٹوں سے برابر سرگرم سفر تھے۔ ہمارے گرم سویٹروں اور موٹے پٹو کے کوٹوں کے اندر سے پانی بہہ رہا تھا۔ رات تیرہ و تار تھی۔ ریچھوں اور چیتوں کی آوازیں اور

بارش کے قطروں کی ٹپاٹپ کے سوا اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ قصہ کوتاہ رات کے ایک بجے محکمہ جنگلات کے ایک ریسٹ ہاؤس میں پہنچے۔ رات کے اندھیرے اور موسلادھار بارش میں یہ منزل ہم نے کس طرح طے کی، بڑا لمبا ماجرا ہے۔ بار برداری کے خچر ہمارے ہمراہ تھے۔ بستر کھولے تو معلوم ہوا کہ کسی کپڑے کا ایک انچ ٹکڑا بھی خشک نہیں اور میرے سوٹ کیس میں حقیقتاً پانی بھرا ہوا تھا۔ ہم لوگ بھوک اور سردی سے نڈھال ہو رہے تھے۔ بنگلے کا چوکیدار وہاں موجود نہ تھا۔ دوستوں اور گھر والوں کے تقاضا کے باوجود میں نے عادتاً کبھی کوئی سامان خورد و نوش سوائے سگریٹوں کے ساتھ نہیں رکھا۔ اسلئے بھوک کا علاج نہ تھا اور سردی سے بچنے کیلئے ریسٹ ہاؤس کی دری ہم سب نے اکٹھی اوڑھ لی۔ دوسرا سارا دن بستر اور کپڑے خشک کرنے میں صرف کرنا پڑا۔

تیسرے روز ہم کشتوار پہنچے اور وہاں ایک ہفتہ قیام کے بعد "تھن درہ" کے راستے سے سرینگر پہنچ گئے۔ جموں سے سرینگر تک کا یہ تقریباً تین سو میل لمبا پہاڑی سفر ہم نے ایک مہینے میں طے کیا۔ اس سفر میں تقریباً بیس مختلف مقامات پر جلسے منعقد ہوئے اور اس پہاڑی علاقہ میں تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں سے ہم نے خطاب کیا۔ میں کئی مختلف راستوں سے جموں سے سرینگر گیا ہوں لیکن یہ راستہ شروع سے آخر تک ہر لحاظ سے لاجواب ہے بشرطیکہ سیاحت اور تفریح مدنظر ہو اور باذاق سوسائٹی بھی ہو۔

گلگت برطانوی عملداری میں:۔

راجہ ہری کشن کول کے جانے کے بعد جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کرنل کالون نے قلمدان وزارت سنبھالا۔ کالون منسٹری بہت حد تک کامیاب رہی کیونکہ اس میں سر برجور دلال ایسا نیک دل اور مخلص آدمی مہتہ اور وجاہت حسین

ایسے قابل اور تجربہ کار وزیر موجود تھے۔ کالون کے زمانہ میں مسلمان ذہنی طور پر کم از کم مطمئن تھے۔ اور مسلم کانفرنس نے بھی حتی المقدور اس سے تعاون کی کوشش کی۔ حالانکہ اس پنج سالہ عہد وزارت میں مجھے دو مرتبہ جیل جانا پڑا۔

کالون خود شریف النفس انسان تھا۔ مگر برطانوی اقتدار نے اسے خاص مقصد کیلئے روانہ کیا تھا۔ انگریز قوم دنیا میں سیاسی اور قومی لین دین کے لحاظ سے سب سے زیادہ خود غرض اور حریص قوم واقع ہوئی ہے۔ اپنے قومی مفاد کے لئے اہل دنیا کی ہلاکت سے بھی اسے احتراز اور ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔ انگریز اگر ایک ہاتھ سے دیتا ہے تو دوسری ہاتھ سے واپس لے لیتا ہے۔ دیتا بھی وہ اس وقت ہے جب ایک سود خوار بنئے کی طرح اسے سود در سود ملنے کا یقین ہو۔ اس نے کشمیر کے بگڑے ہوئے حالات سے بھی فائدہ اٹھایا اور مہاراجہ کو خائف کرنے کیلئے اپنی مرضی کے وزراء یہاں بھیجے۔ مہاراجہ آئینی طور پر تو مہاراجہ تھا لیکن میرا یقین ہے کہ اسوقت ریاست کی تمام باگ ڈور عملاً کالون کے ہاتھ میں تھی۔ چنانچہ حکومت ہند نے ڈیموکلیز کی تلوار حکومت کشمیر کے سر پر لٹکا کر اور یوں ڈرا دھمکا کر گلگت کو اپنے قبضہ میں کرلیا۔ اس کے بعد کالون کا مشن ختم ہوگیا اور مہاراجہ کو انگریز نے خوشنودیٔ مزاج کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔ چنانچہ گلگت کے انتقال اقتدار کے بعد ہی ایک ایک کر کے کالون گورنمنٹ کے تمام منسٹر رخصت کردئے گئے۔

مہاراجہ کشمیر:۔

گلگت کے یوں نکل جانے سے مہاراجہ کو بے حد صدمہ ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ مہاراجہ دل ہی دل میں مسلمانوں کی تحریک حریت کو ہی اس حادثے کا بالواسطہ باعث سمجھتا تھا اور مجھے بھی اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ مسلمانوں کی

تحریک ان ایام میں اپنے عُروج وکمال کو نہ پہنچی ہوئی ہوتی تو شائد انگریز ریاست کے معاملات میں براہ راست مداخلت کی جرات نہ کرسکتا اور نہ گلگت ہاتھ سے جاتا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ مہاراجہ نے مسلمانان ریاست کی شکایات کا ازالہ کرنے کی بجائے انکو باغی قرار دیا۔ حالانکہ اس وقت مسلمانوں کو مہاراجہ سے کوئی خاص پرخاش نہ تھی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم بار بار مطالبات کی فہرستیں لے کر اس کے سامنے دست سوال دراز نہ کرتے۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے اس وقت میں مہاراجہ کے بدلے ہوئے تیور دیکھنے کے باوجود بھی اس کو نیک نیتی کے متعلق حسن ظن رکھتا تھا۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ مہاراجہ نے ابتدائی دور حکومت میں ایسے قوانین جاری کیے جن کی وجہ سے زمیندار اور کاشتکار عناصر کو قدرے فائدہ پہنچا لیکن راعی اور رعایا دونوں کی بدقسمتی یہ تھی کہ مہاراجہ کو کچھ اندرونی اور کچھ بیرونی مشیروں نے مسلمانوں کے خلاف شدت سے بدظن کردیا ور منافرت کے یہ جذبات روز بروز بڑھتے گئے۔ انکا ردِ عمل ظاہر تھا اور وہ وقت آگیا جب مہاراجہ کے دل میں مسلمانوں کی غیر وفاداری اور دشمنی کا یقین راسخ ہوگیا۔ چنانچہ گلگت کے کھو جانے سے مہاراجہ کے عزائم میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوگئی۔ ہم نے تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کی بے حد کوشش کی لیکن یا تو مہاراجہ کو صحیح حالات سے مطلع نہ کیا گیا۔ یا وہ خود بخود اپنے تعصب کے باعث مسلمانوں سے متنفر ہوگیا۔

وجاہت حسین مرحوم:۔

کالون کے جانے کے بعد درمیانی عرصے میں نواب خسرو جنگ قائم مقام پرائم منسٹر مقرر ہوئے۔ یہ واقعہ مارچ/اپریل ۱۹۳۷ء کا ہے انہی ایام میں گاؤ کشی کے سلسلہ میں سیشن جج جموں نے متعدد مسلمانوں کو سات سات سال

قید کی سزا دی۔اس سے ریاست میں کہرام مچ گیا۔اور مسلمانوں نے ریاست کے کونے کونے میں احتجاجی جلسے اور مظاہرے شروع کردیۓ۔میں نے جموں میں ایک تقریر کے دوان اس سفاکانہ فیصلہ کی شدید مذمت کی اور مہاراجہ کو خطاب کر کے اصلاحِ احوال کی اپیل کی۔حکومت نے میری تقریر کو باغیانہ قرار دے کر میرے خلاف زیردفعہ ۱۲۴الف مقدمہ چلانے کی اجازت دے دی۔ میں اسی روز اتفاقاً ہائی کورٹ کی طرف جارہا تھا کہ کونسل سے واپسی پر وجاہت حسین مرحوم جو اپنے دفتر کی طرف جارہے تھے مجھے مل گئے۔ان کا چہرہ پہلے ہی زرد سا تھا لیکن اس زردی میں کچھ اور اضافہ نظر آیا۔کہنے لگے چودھری صاحب آج فرصت کے وقت ضرور مجھے ملئے۔میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے میرے خلاف مقدمہ کی اجازت کے تمام حالات سنادیئے۔مہاراجہ کے خلاف کوئی ایک آدھ فقرہ محل نظر تھا۔جس کی بنا پر میرے خلاف یہ تمام کاروائی عمل میں لائی گئی۔میں نے وجاہت حسین صاحب کو بتایا کہ میری تقریر کے قابل اعتراض فقروں کا مفہوم بدلا گیا ہے اور حقیقت بھی یہی تھی۔اس وقت میں نے مہاراجہ کو ہدفِ نکتہ چینی نہ بنایا تھا۔اس پر وجاہت صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر اصلیت یہی ہے تو مجھے چاہئے کہ میں ایک چٹھی کے ذریعے مہاراجہ کی غلط فہمی رفع کردوں۔انہوں نے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس طرح معاملہ رفع دفع ہوجائے گا۔میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر انہیں صاف جواب دے دیا۔ ایک گھنٹہ تک وہ مجھے مجبور کرتے رہے لیکن اس وقت ایک تو میری حیثیت صدر مسلم کانفرنس کی تھی۔دوسرے مجھے پہلا واقعہ بھی یاد تھا جس کی تلافی کا شائد یہی وقت تھا۔وجاہت حسین صاحب نے اس سلسلے میں شیخ عبداللہ کا حوالہ بھی دیا کہ بسا اوقات وہ یہی طریق کار اختیار کرلیا کرتے ہیں۔

مگر میں نے وجاہت حسین صاحب کے پیہم اصرار کے باوجود مہاراجہ کو کسی قسم کی چٹھی لکھنے سے صاف انکار کردیا۔ جس پر وہ مایوس ہوگئے۔ میں نے پہلے کبھی ان کو اتنا مغموم نہ دیکھا تھا اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں نے انکی تجویز قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ بات چیت کے بعد ہم کافی دیر تک خاموش بیٹھے تھے کہ نواب خسرو جنگ اچانک آگئے۔ وجاہت صاحب نے بے ساختہ کہا، نواب صاحب اچھا ہوا کہ آپ تشریف لے آئے۔ نواب صاحب نے میرے مقدمہ کا واقعہ ازراہ ہمدردی چھیڑ دیا کیونکہ اس بارے میں مجھے اپنی مجبوری کا یقین دلانا چاہتے تھے۔ میں نے جواباً ایک لمبی تقریر کا سلسلہ شروع کردیا اور ایک گھنٹے تک تمام متعلقہ حالات سے ان کو آگاہ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان دونوں کی زبانیں گنگ ہوگئی ہیں۔ بالخصوص نواب خسرو جنگ تو بالکل تصویر حیرت بنے ہوئے تھے۔ کمرے میں سکوت چھا گیا تھا۔ آخر نواب صاحب نے بھی مجھے چٹھی لکھنے کے متعلق مشورہ دیا لیکن میں نے پھر انکار کردیا۔

گوپالا سوامی آئنگر:۔

دو دن میں نے اپنی گرفتاری کے انتظار میں گزار دیئے۔ تیسرے دن جموں میں سر گوپالا سوامی آئنگر کی آمد تھی۔ غالباً کونسل کے دوبارہ غور کرنے کے بعد میرے مقدمہ کا معاملہ گوپالا سوامی کے آنے پر ملتوی کردیا۔ چنانچہ جس روز آئنگر جموں پہنچا اسی روز وجاہت حسین کی طرف سے مجھے پیغام ملا کہ نئے وزیراعظم مسلم کانفرنس کے وفد سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ ملاقات کے دوران پہلے سر آئنگر نے میری تقریر کا ذکر کرتے ہوئے اظہار افسوس کیا اور کہا کہ میں تمہارے خلاف کسی قسم کی کاروائی کرکے مسلمانوں کو شروع ہی میں بدظن نہیں کرنا چاہتا۔ اس موقعہ پر اس نے یہ بھی یقین دلایا کہ مسلم کانفرنس کے تعاون کا

میں بے حد خواہش مند ہوں اور مسلمانوں کے ساتھ پورا انصاف کروں گا اور اگر میں مسلمانوں کو مطمئن نہ کر سکا تو ریاست سے واپس چلا جاؤں گا۔

آئنگر اپنے اصلی رُوپ میں :۔

۱۹۳۶ء کے وسط میں مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس پونچھ میں ہوا۔ اجلاس کے فوراً بعد آئنگر سے ہماری ٹھن گئی۔ کالون نے ملازمت کے تعلق میں گلانسی سفارشات کی روشنی میں مسلمانوں کو تھوڑی بہت اشک شوئی کی تھی۔ لیکن آئنگر نے اپنی پالیسی میں نمایاں تبدیلی کر لی اور گلانسی سفارشات کو کھلے بندوں نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ بلکہ ایک مرتبہ تو اس نے برملا کہہ دیا کہ گلانسی کمیشن کی رپورٹ اب ختم ہو چکی ہے۔ چنانچہ اس کی تمام طبع شدہ کاپیاں ضائع کر دی گئیں۔ یہ سال آئنگر کے خلاف آئینی جنگ اور جماعتی تنظیم میں صرف ہوا۔

پندرہواں باب

شیخ محمد عبداللہ کا نیشنلزم

۲۵۔۲۷ مارچ ۱۹۳۸ء کو مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس جموں میں منعقد ہوا۔ جس کے صدر منتخب شیخ محمد عبداللہ تھے۔ اجلاس سے چند یوم قبل شیخ صاحب نے خان عبدالغفار اور پنڈت جواہر لال نہرو سے پہلی دفعہ ملاقات کی۔ جب وہ جموں پہنچے تو ان کے تیور بدلے ہوئے تھے اور سرحد سے نیشنلزم کا اتنا تُند و تیز جام چڑھا کر آئے تھے کہ اسکا نشہ کبھی اُتر ہی نہ سکا۔ آتے ہی انہوں نے میرے ساتھ بند کمرہ میں نیشنلزم کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ اسکے جواز اور عدم جواز کے بارے میں پہلے تو نرمی سے بحث ہوئی لیکن مجھے افسوس ہوا کہ اب یہ معاملہ بحث و تمحیص اور قومی نفع ونقصان کی سرحدیں پھاند چکا تھا۔ شیخ عبداللہ کا اصرار تھا کہ تین دن تک ہونے والے اجلاس میں اس کا فیصلہ ضروری ہے۔ شیخ صاحب کی طبیعت کا پہلو واضح رہے کہ جب تک وہ دوست ہیں تو پکے دوست ہیں لیکن جب وہ آنکھیں پھیر لیتے ہیں تو دشمنی میں بڑے سے بڑا دشمن بھی انکا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ جب تک ہم اکٹھے تھے ہم دونوں کے درمیان کسی معاملہ میں اختلاف نہ ہوا۔ اکثر متنازع فیہ معاملات میں شیخ عبداللہ میری طرف جھکنے پر مائل ہو جاتے تھے۔ لیکن ان کی طبیعت اور سیاسی زندگی کا سب سے بڑا سقم آزادی رائے کا فُقدان رہا ہے۔ انکے لئے ہمیشہ ایک مشیر خاص کا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ مشیر حالات کے مطابق بدلتے بھی رہے ہیں۔ ہر اہم معاملہ کے حُسن اور قبح پر وہ

سنجیدگی سے غور کر سکتے ہیں اور بحث و تمحیص میں حصہ بھی لے سکتے ہیں۔ لیکن آخری فیصلہ کبھی ان کے بس کا روگ نہیں رہا۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ اس دفعہ وہ نیشلسٹ دوستوں کے ہاتھوں نیشنلزم کی شراب پی کر آئے تھے۔ اس صحبت میں بد قسمتی سے ہمارے نصب العین اور طریق کار کے درمیان ایک نمایاں دیوار حائل ہونے کا شدید احتمال پیدا ہو گیا۔ سالانہ اجلاس سر پر نہ ہوتا تو صورت مختلف ہوتی۔ جوں توں کر کے میں نے اس موقعہ کیلئے شیخ محمد عبداللہ کو ہموار کر لیا اور اس طرح باہمی خانہ جنگی کی جو آندھی آ گئی تھی وہ بغیر نقصان کے گزر گئی۔

جموں میں فقید المثال اجلاس:۔

مسلم کانفرنس کا یہ اجلاس ہر اعتبار سے فقید المثال تھا۔ پنڈال کی آراستگی اور خوبصورتی تو ایک طرف قیام وطعام کے سلسلہ میں جو خاطر خواہ نفاست پیدا کی گئی تھی لوگ اسے دیکھ کر متحیر تھے۔ مندوبین کی نمائندگی کی تقریباً سو فی صد تھی۔ انکے علاوہ بے شمار لوگ ریاست کے طول و عرض سے یہ بحیثیت سامعین آئے تھے۔ مسلم کانفرنس کے جلسوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ جیوشِ اسلام سینکڑوں کی تعداد میں کشمیر، کوٹلی، پونچھ، راجوری اور میر پورہ وغیرہ تمام دور دراز علاقوں سے یہاں آئے۔ دن کے وقت شہر میں ان کا جلوس مسلمانوں اور ہندوؤں کے دلوں میں اپنی اپنی جگہ عجیب کیفیت طاری کرتا تھا۔ مسلمانوں کی قومی پارلیمان کی کامیابی اور ان کی تنظیم وطاقت اور اتحاد و اتفاق کے ایمان پرور مظاہرے دیکھ کر آئنگر وزارت کے چھکے چھوٹ گئے لیکن جلسے کے فوراً ہی بعد جموں کے چند نگاہ باطن رکھنے والے بزرگوں نے کہہ دیا کہ مسلمانوں کے اس جلسہ کو مخالفین کی نظر بد لگ گئی اور یہی ہوا۔

انتخابات میں کامیابی :-

جلسے کے ایک ماہ بعد ہی اسمبلی کے انتخابات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تمام نشستوں کیلئے کانفرنس نے اپنے اُمیدوار کھڑے کئے۔ دو امیدواروں کو کاغذاتِ نامزدگی نامنظور ہو گئے۔ باقیوں کیلئے انتخابات کی مہم کٹھن تھی۔ صوبہ کشمیر کی یہ انتخابی جنگ سوائے مظفر آباد کے بہت آسان تھی۔ لیکن صوبہ جموں میں مصیبت کا سامنا تھا۔ جون کا مہینہ تھا جب یہاں بَلا کی گرمی ہوتی ہے۔ علاقہ دشوار گزار، کارکنوں کی کمی اور جماعت کی مالی حالت ناگفتہ بہہ۔ ساتھ ہی حکومت سالانہ اجلاس سے متاثر ہونے کے علاوہ کچھ تجربہ بھی حاصل کر چکی تھی اور اب اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ سالانہ اجلاس کے اتحاد و اتفاق کا نشہ مسلمانوں کے دماغ سے اس طرح سے نکل سکے گا کہ انتخابات میں ان کو نیچا دکھایا جائے۔ چنانچہ چند حلقہ ہائے انتخاب کے سوا ریاست بھر میں دو دو تین تین امیدوار حکومت کی شہ پر اور اعلانیہ مدد سے ہر حلقہ انتخاب میں ہمارے خلاف کھڑے کر دیئے گئے۔ صوبہ جموں میں گوجر جاٹ اور راجپوت وغیرہ کی لعنت تو موجود ہی تھی حکومت کے کارندوں نے مسلمانوں کی اس کمزوری کو خوب ہوا دی۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس انتخابی جنگ میں یہ قومیں آپس میں گتھم گتھا ہو کر اور ٹکرا کر خود ہی فنا ہو جائیں گی۔ کشمیر میں یہ معاملہ تو تھا نہیں اسلئے حکومت نے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی پیٹھ ٹھونک کر انہیں ہمارے مقابلہ پر صف آرا کر دیا۔ میں نے انتخابی دوروں کی مہم شروع کر دی۔ ساغر صاحب تمام نزدیک و دور سفر کے دوران میرے ہمراہ رہے۔ وہ خود بھی جموں خاص کی نشست سے مسلم کانفرنس کے امیدواروں میں سے تھے۔ لیکن چونکہ وہ بلا مقابلہ کامیاب ہو چکے تھے۔ اس لئے میرے ساتھ کام کرنے کیلئے فارغ تھے۔

طُوفانی دورہ :-

غرض میں نے اپنے رفقائے کار کی معیّت میں صوبہ جموں کے تمام دشوار گزار راستوں کو طے کر کے اور علاقہ کا طوفانی دورہ کر کے اپنی پوزیشن کا جائزہ لے لیا۔ جو خاطر خواہ تھا ہمارے سامنے اس زمانہ میں نہ دن دن تھا اور نہ رات رات۔ نہ بھُوک تھی نہ پیاس۔ ان حالات میں آرام اور نیند کی خواہش کہاں۔ ہمارے مقابلہ پر نام نہاد گوجر جاٹ کانفرنس نے بھی انتخابی مہم کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ حکومت کے بل بوتے پر وہ بھی مصروف تگ ودو تھے۔ لیکن عوام خواہ وہ گوجر تھے یا جاٹ یا راجپوت اندھادھند مسلم کانفرنس کے حلیف انتخابات بن رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گرمیوں کے اس عالمِ شباب میں جب کہ درجہ حرات ۱۱۴-۱۱۵ سے کم نہ ہوتا تھا بسا اوقات عین دوپہر کے وقت بیس، پچیس پچیس میل کی مسافت پیدل ایسے مقامات میں کی جہاں میلوں تک ستانے کیلئے ایک سایہ دار درخت بھی نظر نہ آتا تھا۔ راجوری اور کٹھوعہ کی نشستوں کیلئے ہمیں بیحد جدوجہد اور تگ ودو کرنی پڑی اور یہ دو حلقے صوبہ جموں میں اور مظفر آباد صوبہ کشمیر میں ہمارے لئے کمزور تھے۔ مظفر آباد میں ہم نے تمام طاقتیں مرتکز کر دیں۔ میں اور ساغر صاحب راجوری سے برہ چنگس واپس آ رہے تھے۔ نوشہرہ میں ہم رات ایک بجے پہنچے۔ اس سے پہلے ہم نوشہرہ کبھی نہ آئے تھے۔ رات سنسان تھی اور ہم بھوکے پیاسے تھے۔ بار برداری کے گھوڑے اور آدمی بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ نہ یہاں کوئی آدمی تھا اور نہ کسی جگہ چراغ کی روشنی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ بستی سنسان اور ویران ہے۔ اِدھر اُدھر گھوم کر ہم زمین پر بیٹھ گئے۔ چونکہ تھکن سے چور تھے اسی اثنا میں میں نے سگریٹ کے لئے دیا سلائی سلگائی تو مجھے دو تین قدم دور سامنے دو سانپ

کنڈلی مارے بیٹھے نظر آئے۔ وہاں سے اٹھ کر ہم دوسری جگہ گئے اور وہاں بھی چار پانچ سانپوں کو ادھر ادھر رینگتے دیکھا آخر کار ہم نے فیصلہ یہی کیا کی بجائے بیٹھنے کے لیٹنا اچھا ہے۔ چنانچہ ہم پتھروں کا تکیہ لگا کر سانپ بچھوؤں کے خوف سے خالی الذہن ہو کر لیٹ گئے کیونکہ اب ہماری دیا سلائی بھی ختم ہو چکی تھی۔ تھوڑے عرصے کے بعد ہمارے آدمی پہنچ گئے تو رات کے تین بجے ایک واقف مسلمان کے گھر چائے پی اور پھر آگے روانہ ہوئے۔

تفرقے کا نیا تیر:۔

ریاست کے انتخابات کے سلسلہ میں رائے شماری شروع ہوگئی۔ قواعد کے مطابق تمام حلقہ ہائے انتخاب میں پولنگ ایک ہی روز میں ختم ہوگئی اور خدا کے فضل سے انیس کی انیس نشستوں پر ہم ووٹوں کی عظیم اکثریت سے کامیاب ہوگئے۔ مسلم کانفرنس کی مقبولیت اس انتخاب سے اور بڑھ گئی لیکن ادھر آئنگر وزارت کے سینے پر جو زخم سالانہ اجلاس کی کامیابی کی وجہ سے لگ گئے تھے وہ انتخابات میں شکست سے اور ہرے ہوگئے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کشمیر کے یہ زخم اب ناسور کی شکل اختیار کر گئے تھے اور آئنگر کو جس نے اسلامی اتحاد واتفاق کا یہ نقشہ آج سے پہلے ہندوستان میں کہیں نہ دیکھا تھا ہماری تنظیم کو دیکھ کر ڈوگرہ راج کا انجام نظر آ گیا۔

مسلم کانفرنس کو نیچا دکھانے اور کمزور کرنے کیلئے تمام حربے حکومت اختیار کر چکی تھی پنڈت جواہرلال کی ملاقات اور ہماری اسکے بعد کی جماعتی کاروائی کا آئنگر کو علم تھا۔ وہ خود کانگریسی تھا اور پرانا گھاگ ہی نہیں بلکہ ایک متعصب اور موقع شناس حاکم بھی تھا۔ اس لئے اب کی دفعہ حکومت کشمیر کے اس نمائندے کے ترکش سے جو زہر آلود تیر نکلا وہ سیدھا نشانے پر جا کر بیٹھا

اور مسلم کانفرنس کے جگر کے پار ہو گیا۔

شیخ محمد عبداللہ کی نیت کانگریس کے معاملہ میں بدل چکی تھی۔ جموں میں مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر انہوں نے اپنی نئی پوزیشن کا جائزہ لینے اور مندوبین کو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے کافی ہاتھ پاؤں مارے تھے لیکن ہوا کے مخالفانہ رُخ کو بھانپ کر اس وقت اپنا دامن چھڑا لیا۔ شاید شیخ صاحب اسی موقع پر نیشنل اِزم کے بارے میں مندوبین اور عوام سے اِستصواب رائے کے لئے مصر ہو جاتے، لیکن یہ اجلاس جموں میں تھا۔ اور وہاں نمائندوں اور رضاکاروں کا بیشتر حصہ اور سامعین کا اجتماع صوبہ جموں سے آیا ہوا تھا اور چونکہ صوبہ جموں کسی صورت میں بھی نیشنل ازم کو قبول کرنے کیلئے تیار نہ تھا اس لئے شیخ صاحب نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ معاملہ کو کسی اور موزوں موقع تک ملتوی کر دیا جائے۔

جموں کے ہندو اور مسلمان :۔

یہاں یہ بتانا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ آج سے چند سال قبل سیاسی خیالات اور معتقدات کے لحاظ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان باہمی تعلقات کے سلسلہ میں صوبہ جموں اور صوبہ کشمیر کے مسلمانوں کے نظریات اور عمل میں کافی فرق تھا۔ صوبہ جموں میں گو اکثریت مسلمانوں کی ہے لیکن غیر مسلموں کی تعداد بھی ہر علاقہ میں کافی ہے اور بعض دیہات حتیٰ کہ ایک دو تحصیلوں میں وہ اکثریت میں تھے۔ ہندو مہاراجہ کے ہم مذہب اور اکثر ان میں سے اسکے ہم قبیلہ ہونے کی وجہ سے بزعم خود اپنے آپ کو ہر حیثیت میں مسلمانوں سے برتر اور علیٰ سمجھتے تھے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن جموں کا قیام ۱۹۰۹ء میں عمل میں آیا۔ ۱۹۲۳ء میں اس کا احیاء

کیا گیا تھا اس سے قبل مسلمانوں میں بحیثیت مجموعی قومی احساسِ کمتری بدرجہ اتم موجود تھا البتہ شہروں اور قصبوں میں تعداد کی کمی کے باوجود مسلمانوں نے اپنی انفرادی اور اجتماعی پوزیشن کو ان ایام میں بھی برقرار رکھا تھا۔ بحیثیت قوم مسلمانوں کے متعلق ہندوؤں کا طرزِ عمل اور سلوک نہایت بُرا اور ذلیل تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پایانِ کار صوبہ جموں کے مسلمان قومی اور مذہبی طور سے ہندوؤں کے مخالف ہوگئے اور دونوں قوموں میں آہستہ آہستہ تمام تعلقات رواداری ختم ہو گئے۔ تحریک حریت کشمیر کے دوران میں بالخصوص غیر مسلموں نے اپنی پست ذہنیت کا قدم قدم پر ثبوت دیا۔ یوں بھی تہذیب وتمدن، معاشرت وثقافت اور قومی اخلاق وکردار کے لحاظ سے دونوں قوموں میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔ اور ہر جگہ قریبی ہمسائیگی کی وجہ سے یہ فرق اور زیادہ نمایاں ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ہندو حکومت نے مسلمانوں کے ساتھ ہر شعبہ زندگی میں سوتیلی ماں کا سا سلوک روا رکھا تھا اور ان کو عمداً اور التزاماً اچھوتوں کے درجہ سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ ان وجوہ کی بناء پر صوبہ جموں کے مسلمانوں کیلئے متحدہ قومیت کے جھانسے میں آجانا کوئی آسان بات نہ تھی۔ پھر یہ کہ مسلم کانفرنس کے زمانہ میں جس قدر سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کو پنجاب اور ہندوستان سے آنے کی دعوت دی گئی وہ تمام کے تمام اسی عقیدے کے لوگ تھے۔ اس وجہ سے ایک تو صوبہ جموں کے مسلمان اپنی انفرادی قومی حیثیت کو برقرار رکھنے کے معاملہ میں بالکل پختہ ہو گئے دوسرے یہ کہ اسی طرح سے خاص قسم کی اکابر پرستی کی بجائے ان میں کھرے اور کھوٹے کی تمیز بھی پیدا ہوگئی۔ ساتھ ہی پنجاب سے میل ملاپ اور آمد ورفت کی وجہ سے ان کے اندر بہت نمایاں سیاسی سوجھ بوجھ کی نشو ونما ہوگئی۔

کشمیر کے مسلمان اور ھندو:۔

اسکے برعکس صوبہ کشمیر میں تقریباً پچانوے فیصد اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ غیر مسلم نہایت ہی حقیر اور قلیل تعداد میں آباد ہیں۔ اس لئے سوائے اس کے کوئی چارہ کار ہی نہ تھا کہ یہ غیر مسلم اپنی جہد للبقاء اپنی سیاسی اور سماجی حیثیت اور حیات کو برقرار رکھنے کیلئے مجبوراً مسلمانوں کے ناز بردار اور کاسہ لیس بن جائیں اور مسلمانوں کو اپنی عقیدت اور وفاداری کا ہر طریقہ سے اطمینان دلائیں۔ کشمیری مسلمانوں نے بھی ادھر کشمیری پنڈتوں کے معاملہ میں اپنی مذہبی رواداری کا ثبوت دیا اور دوسرے یہ جان کر کہ غیر مسلموں کی اقلیت بہر حال بے ضرر ہے ان میں گھل مل جانے میں تامل نہ کیا۔ اس لئے وادی کشمیر میں تحریک حریت سے قبل سیاسی، سماجی اور جماعتی زندگی کا تخیل فرقہ وارانہ طور پر تقریباً ناپید تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ۱۹۳۱ء میں سرینگر میں فرقہ وارانہ تصادم کی وجہ سے اور بعد میں مسلم کانفرنس کے قیام سے ہندو اور مسلمان کی سیاسی اور جماعتی جدوجہد مذہبی اور فرقہ وارانہ طور پر شروع ہوگئی اور آہستہ آہستہ کشمیری مسلمان اپنی علیحدہ انفرادی حیثیت اور قومی زندگی کی اہمیت سے آگاہ ہوئے۔

لیکن وادی کشمیر کے مسلمان کا تمام قوموں کے مقابلہ پر ایک مخصوص قومی کردار رہا ہے کہ علاوہ بیحد مذہب پرست ہونے کے وہ ابتدا سے اکابر پرست رہا ہے۔ شائد اسکی وجہ ابدی محکومی و مجبوری پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ بے بسی، غلامی اور استبداد کے چنگل میں پھنسی ہوئی قومیں عام طور پر دعاؤں اور مناجاتوں ہی کے سہارے زندہ رہ سکتی ہیں اور اس طرح اطمینان اور تسکین دل کا سامان حاصل کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیری مسلمان آغاز تحریک حریت کشمیر کے زمانہ تک خدا اور رسول کے بعد بغیر کسی درمیانی کڑی کے

میر واعظ وقت کو دنیا کا سب سے بڑا روحانی مذہبی اور قومی رہنما سمجھتا رہا ہے۔

کشمیری مسلمان کیلئے دنیا کے بڑے بڑے تاجداروں اور فرمانرواؤں کا حکم مذہبی راہنماؤں کے حکم کے سامنے ہمیشہ ہیچ اور بے اثر رہا ہے لیکن جب کشمیر میں سیاسی بیداری کی وجہ سے مذہب کی بجائے سیاست نے جگہ لی تو یہ اقتدار سیاسی کارکنوں کی طرف منتقل ہو گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں شیخ عبداللہ کی سیاسی حیثیت وادی کشمیر کے دیگر کارکنوں سے زیادہ ممتاز ہوگئی۔ لیکن شیخ صاحب کے اس مرتبہ کے حصول کا سہرا زیادہ تر میر واعظ کشمیر کے سر تھا۔ جنہوں نے اپنے تمام مذہبی اثر ونفوذ سے شیخ عبداللہ کو عوام سے متعارف کرادیا۔ بعد میں سیاسی جدوجہد اور گرفتاری کی وجہ سے شیخ کی پوزیشن اور زیادہ مضبوط ہوگئی اور اسی اکابر پرستی کے جذبہ کے تحت کشمیری عوام اسکے اندھا دھند پیرو ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ نیشنلزم کو اپنانے کے کچھ عرصہ بعد تک بھی عوام شیخ عبداللہ کے ہم خیال رہے۔ اسکے علاوہ وادی کشمیر ہندوستان سے بہت دور اور بالکل الگ تھلگ ہے۔ اس وجہ سے پنجاب یا ہندوستان سے کوئی قومی یا سیاسی مقرر کبھی سرینگر نہ جاسکا۔ جس کے خیالات کا اثر عوام پر پڑ سکتا اور نہ ہی کشمیر کے مسلمانوں کو کبھی پنجاب کے مسلمانوں سے باہمی اختلاط کا زیادہ موقع مل سکا۔

ان تمام وجوہ کی بنا پر وادی کشمیر کا مسلمان اپنے اندرونی لیڈروں کی آواز کو خواہ وہ سیاسی ہو یا مذہبی حرفِ آخر تصور کرتا رہا۔ اسی لئے کشمیر میں شیخ عبداللہ کی وجہ سے نیشنل ازم کے جراثیم کو کچھ عرصہ کے لئے پرورش پانے کا موقع مل گیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس معاملہ میں جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا۔ ارادی یا غیر ارادی طور پر میرا بھی ہاتھ تھا اور یہ حقیقت ہے کہ ان کشمیری مسلمانوں کو بھی جو نیشنل کانفرنس کے جھانسے میں آگئے مجھ سے گہری وابستگی رہی ہے۔

سولہواں باب

نیشنل کانفرنس کا قیام

متحدہ قومیت کا پروپیگنڈا:۔

بہر حال ان حالات میں شیخ عبداللہ کو متحدہ قومیت کے سیاسی رجحانات کی تخم ریزی اور پرورش کیلئے سرینگر شہر کی ہوا ہی راس آسکی۔ چنانچہ اسمبلی کے انتخابات سے فارغ ہو کر شیخ صاحب نے سرینگر میں اندرونی اور خُفیہ طور پر نیشنل ازم کا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ کیونکہ وہ اپنے اثر کے باجود اعلانیہ ایسا کرنے کے ہمت نہ کر سکتے تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دل سے نیشنل ازم کے قائل نہ تھے اور ظاہر ہے کہ جو بات دل سے نہ اٹھے اور جس بات کا پس منظر نیک نیتی کا حامل نہ ہو اس بات کا قائل ملامت ضمیر کی وجہ سے جرات بے باکانہ کا سرمایہ دار نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ وادی کشمیر کا تعلیم یافتہ طبقہ تقریباً تمام کا تمام نیشنل ازم کے اعلانیہ خلاف تھا اور شیخ محمد عبداللہ صاحب متعدد وجوہ کی بنا پر اس طبقہ کے مرہونِ منت تھے۔ اس لئے وہ اس طبقہ سے خائف رہتے تھے۔ لیکن ادھر وہ اپنے کانگریسی آقاؤں کے تقاضوں سے بھی مجبور تھے۔ ساتھ ہی پنڈت پریم ناتھ بزاز کی سیاسی اور صحافتی رفاقت بھی ان کے حوصلے بلند کرنے میں ممد و معاون تھی۔ چنانچہ شیخ عبداللہ نے انتخابات کے تقریباً ایک ماہ بعد غالباً ۲۵ رجون ۱۹۳۸ کو مجلس عاملہ کا اجلاس سرینگر میں طلب کیا۔ اس سال وہی مسلم کانفرنس کے صدر تھے۔ اس اجلاس میں کانفرنس بلانے کی غرض اسمبلی پارٹی کے لیڈر کا انتخاب اور مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنا تھا۔

جموں میں منعقدہ اجلاس کی نسبت شیخ صاحب کو اِس دفعہ اپنی طاقت پر بہت گھمنڈ تھا۔ لیکن اسمبلی پارٹی کے لیڈر کے انتخابات نے معاملہ صاف کر دیا۔ دو امیدواروں میں مقابلہ تھا۔ دن بھر کے مسلسل اور شدید پروپگنڈے کے باوجود شیخ عبداللہ کے امیدوار کو اُنیس ممبران اسمبلی میں سے صرف دو ووٹ حاصل ہوئے اور ہمارا امیدوار بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگیا اور یہی طاقت کی کشمکش اب مسلم کانفرنس کو توڑنے کے معاملہ میں فیصلہ کن ثابت ہونے والی تھی۔ شیخ صاحب اس شکست سے بوکھلا سے گئے۔

مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلنے کی تجویز شیخ عبداللہ کے ایک مخصوص کاسہ لیس کی جانب سے اجلاس میں پیش ہوئی تھی۔ لیکن ہوا کے رُخ کو بھانپ کر شیخ صاحب نے بہ حیثیت صدر یہ تجویز اپنی جانب سے پیش کر دی۔ تاکہ اجلاس کو اس کے مسترد کرنے میں کرسی صدارت پر عدم اعتماد کی گنجائش نہ ہو سکے۔ مجلس عاملہ کا یہ اجلاس متواتر تین دن تک جاری رہا۔ باہمی بحث بحثی، کھینچا تانی اور دلائل و براہین کی کوئی انتہا نہ رہی۔ نیشنل ازم کے حق میں شیخ عبداللہ کی دو دلیلیں تھیں۔ ایک یہ کہ بقول اِن کے گوپالا سوامی آئینگر نے انکے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر ریاست میں نیشنلسٹوں کا برائے نام ڈھانچہ قائم ہو جائے تو حکومت اصلاحات کے سلسلہ میں ایک انقلاب انگیز قدم اُٹھانے کے لئے تیار ہوگی۔ اور کم از کم دو عوامی منسٹر حکومت میں شامل کر لئے جائیں گے۔ دوم! یہ کہ میرے ساتھ اب چند غیر مسلم سیاسی کارکن شامل ہو کر قومی کام کرنا چاہتے ہیں۔ میں اب اُن کو کس طرح نظر انداز کر سکتا ہوں۔ شیخ صاحب کی یہ دونوں باتیں بے معنی تھیں۔ نہ تو آئینگر ریاست میں اصلاحات نافذ کر کے مسلمانان ریاست کی سیاسی پوزیشن مضبوط کرنا چاہتا تھا، کیونکہ اِس

طرح مستقبل قریب میں ہی راجا ہری سنگھ کی مستبدانہ اور آمرانہ طاقت کے ختم ہونے کا احتمال تھا اور نہ غیر مسلموں میں سے کوئی فرد نیک نیتی سے مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو کر ہندو اقلیت کے پاؤں پر کلہاڑا مارنے کا مرتکب ہو سکتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ شیخ صاحب کے یہ پانچ چھ معتمد علیہ ہندو (جن میں سے صرف ایک آدھ ہی نیک نیت ہوگا) آئینگر کے مخصوص ایجنٹ تھے۔ حکومت اور ہندو دونوں مسلمانوں کی سیاسی اور قومی تنظیم سے جس کا مظہر انتخابات اسمبلی کے نتائج تھے خوفزدہ اور پریشان ہو گئے تھے۔ اِس لئے وہ مسلم کانفرنس کی مضبوط جماعت کو توڑ کر مسلمانوں کی وحدتِ ملی کو پاش پاش کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اِس اجلاس میں یہی دلائل دیئے گئے۔ لیکن دلیل و برہان کی قبولیت کا معاملہ انسان کی نیت پر ہوتا ہے۔ جہاں نیت میں فتور ہو اور جان بوجھ کر غلط کاری مدنظر ہو وہاں حقائق و شواہد یا دلائل و براہین کا کیا تعلق؟

قومی شیرازے میں اِنتشار:۔

شیخ عبداللہ کے پیشِ نظر اس وقت گنتی کے چند ہندوؤں کی رفاقت تھی اور حکومت کی جانب سے محکمانہ طاقت کا وعدۂ فردا اور بین الاقوامی ذاتی شہرت اور کانگریس کے ظاہری مسحور کن سامان زینت و زیبائش۔ شیخ صاحب اِن چیزوں کو ہر حال میں حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اُس وقت بھی محسوس نہ کیا اور اس وقت بھی وہ اِس احساس سے قطعاً عاری ہیں۔

حصول ذاتی جاہ و شہرت کی قیمت تمام کی تمام قوم کا سیاسی و مذہبی مستقبل تھا اور ہے۔ اِس لئے مجلس عاملہ کی عظیم اکثریت قومی کارکنوں کی جرح و تعدیل، مذہبی اور قومی فرض شناسی اور حقیقت نمائی کی تمام کاوشیں اور کوششیں شیخ عبداللہ کو راہ پر لانے سے قاصر رہیں اور چار یوم کی پیہم بحث و تمحیص کے

باوجود بھی وہ مٹھی بھر لوگ جنہیں آگے چل کر جعفر وصادق اور کوزلنگ کے ناموں کو پھر سے زندہ کرنا تھا اپنی ہٹ پر قائم رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مجلس عاملہ کے اُنیس ممبروں میں سے صرف دو کارکن شیخ عبداللہ کے حق میں تھے۔ بایں ہمہ فریقین کی ارادی اور غیر ارادی طور سے یہی خواہش تھی کہ معاملہ رائے شماری کے بغیر فریق مخالف کے خلاف طے پاجائے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار شیخ عبداللہ اور میرے درمیان کشمکش نے طول پکڑ لیا۔ شائستہ نوک جھونک کے بعد نوبت انتہائی دُرشت کلامی اور تلخ گوئی تک پہنچ گئی۔ اس طرح اجلاس کسی تصفیہ کے بغیر منتشر ہوگیا۔ لیکن یہ ظاہر تھا کہ اب شیخ عبداللہ اور میری سیاسی اور قومی راہ بالکل الگ الگ اور متضاد تھی۔ دراصل تاریخ کشمیر میں یہ بہت بڑا منحوس دن تھا۔ جب وحدت ملی اور قومی شیرازہ بندی کے قصرِ فلک بوس کی آہنی بنیادوں کو کانگرس اور مہاسبھا کے تعلق کی وجہ سے پاش پاش کر دینے کی طرح ڈالی گئی۔ جس کی اِنتہا کا یہ عالم ہے کہ آج اس کے باعث کشمیری مسلمان ہی نہیں بلکہ تمام ملتِ اسلامیہ سوگوار ہے۔

رائے شماری کا نتیجہ شیخ عبداللہ کے خلاف بہ حیثیت صدر مسلم کانفرنس صریحاً عدم اعتماد کے مترادف تھا۔ اس کے علاوہ ایسی صورت میں اصلاح حال کی تمام راہیں مسدود ہو جانے کا کلی احتمال تھا۔ اس لئے میں نے مصلحتاً مجلس عاملہ میں رائے شماری سے اجتناب کیا۔ میرا یقین تھا کہ کچھ عرصہ بعد شیخ صاحب اپنی کوتاہ اندیشی اور کمزوری کو محسوس کر کے خود بخود راہ پر آجائیں گے، لیکن آئندہ سیاسی حالات کی رفتار اسلامیان ریاست کی متحدہ قوت میں انتشار اور جماعتی حیثیت میں قومی غداری کے ارتکاب کا باعث ہوئی۔

تبادلہ خیالات کے بعد میں مجلس عاملہ کے اجلاس کے خاتمہ پر جموں چلا

آیا اور کچھ عرصے کیلئے سیاسی اور جماعتی طور خاموش رہا تا کہ شیخ عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کو پشیمانی اور اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کا موقع مل سکے لیکن سیاسی صورتحال میں عجیب وغریب عناصر بروئے کار آئے۔ آئینگر بظاہر اپنے مقصد میں ہماری باہمی کشمکش کی وجہ سے کامیاب اور مطمئن تھا۔ پھر ہندوؤں کو خطرہ تھا کہ مبادا شیخ عبداللہ اپنی موجودہ رائے تبدیل کر کے پھر فرقہ پرستی کے چنگل میں پھنس جائیں۔ اس لئے وہ شیخ کو متحدہ قومیت کے جال میں قطعی طور جکڑ لینا چاہتے تھے۔ ادھر شیخ صاحب خود مجلس عاملہ میں ناکامی، سیاسی کمزوری اور بے بسی کی خفت کو مٹانا چاہتے تھے۔ اس لئے یہ تمام لوگ فرداً فرداً اور مشترکہ طور پر اپنے اپنے رنگ میں مصروف کار ہو گئے۔

شیخ عبداللہ کی اسیری :-

چنانچہ شیخ عبداللہ اور ان کی پارٹی نے جس میں دو چار کشمیری پنڈت بھی شامل تھے رام چند کاک کے خلاف اعلانیہ اور جماعتی طور پر علم بغاوت بلند کر دیا۔ رام چندر کاک اس وقت گورنمنٹ کا چیف سیکرٹری تھا۔ آئینگر اس زمانہ میں اس کے خلاف تھا اور (سوائے بزاز کے) شیخ عبداللہ کے حواری کشمیری پنڈت کاک کے ذاتی دشمن ہونے کی وجہ سے آئینگر کے طرف دار تھے۔ قصہ مختصر اس ساری اعصابی جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد اگست۔ ستمبر ۱۹۳۸ میں شیخ عبداللہ اور چند کشمیری پنڈت اور سکھ ساتھی خلاف قانون اجتماع میں تقریر کرنے کے سلسلہ میں گرفتار کر لئے گئے۔ شیخ عبداللہ کی اس دفعہ کی گرفتاری سے کشمیری عوام زیادہ متاثر نہ ہوئے۔ اسلئے یہ تحریک پہلے ہی دن کچل دی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک تو آئینگر نے پہلے ہی تحریک کو دبانے کیلئے حفظ ماتقدم کی تدبیریں اختیار کر رکھی

تھیں ۔ دوسرے ہندوؤں کی شمولیت نے اس تحریک کو ابھرنے نہ دیا۔ آئینگر کشمیری پنڈت اور ڈوگرے خوش تھے کہ قومی انتشار کی وجہ سے شیخ عبداللہ کی طاقت اس کی گرفتاری کے بعد ایک ہی دن میں ختم کردی گئی اور ساتھ ہی شیخ عبداللہ کیساتھ چند غیر مسلموں کی گرفتاری سے شیخ کے عقیدہ متحدہ قومیت پر ابدی مہر ثبت ہوگئی۔ اس موقعہ پر یہ بات خاص طور سے ذکر کے قابل ہے کہ ریاستی سیاست کے تعلق میں ریاست کا ایک ہندو بھی کانگریس کا حامی نہ تھا۔ کیونکہ برائے نام نیشنل ازم بھی ہندو اور ریاست کی ہندو حکومت کے مفاد کے صریحاً منافی تھا۔ لہٰذا شیخ عبداللہ کو ہندوؤں کی جانب سے متحدہ قومیت کا جو یقین دلایا جارہا تھا۔ اس کی غرض محض یہ تھی کہ شیخ کو جو اس وقت ہندو کانگریس کی مالی منفعت کے جال میں آچکا تھا اسلامی سواد اعظم سے کاٹ دیا جائے اور اس طرح مسلمانوں کو جماعتی طور پر کمزور کر کے اپنی حکومتی اور اقتصادی اجارہ داری کے غلبے کی بنیادیں زیادہ مضبوط کردی جائیں۔

ساغر صاحب کی اسیری :۔

شیخ عبداللہ کی گرفتاری نے جموں کے مسلمانوں کیلئے بھی نئی صورتحال پیدا کردی۔ چنانچہ عوام کی رہنمائی کیلئے جلسہ عام بلایا گیا۔ میں اس جلسہ میں خود شامل نہ ہوا۔ ساغر صاحب نے اس جلسہ کو مخاطب کیا۔ ان کی تقریر بالکل مختصر تھی۔ جس کا ماحصل یہ تھا کہ شیخ عبداللہ کے ساتھ چونکہ متحدہ قومیت کے مسئلہ پر ہمارا اختلاف ہو چکا ہے اور انکی یہ نئی گرفتاری ریاست میں اسی متحدہ قومیت کی تکمیل کی ایک کڑی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اس تحریک سے متاثر نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ مسلم کانفرنس کے متوقع فیصلہ کا انتظار کرنا چاہئے۔ لیکن میرے تعجب اور غصے کی کوئی انتہا نہ رہی جب دوسرے روز صبح ساغر صاحب چند

اور دوستوں کو جن کا جرم اس جلسے میں صرف پر امن اور خاموش شرکت تھی گرفتار کرلیا گیا۔ ان دنوں شہر میں جلوسوں اور جلسوں اور تقریروں کی قطعاً کوئی ممانعت نہ تھی۔ اور نہ ایسا کوئی قانون نافذ تھا جس کی رو سے کسی مقرر کیخلاف قانونی مواخذہ ہوسکتا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک متروک قانون جو تحریک آزادی کشمیر کی گزشتہ ہشت سالہ شدید کشمکش کے زمانہ میں بھی لاگو نہ کیا گیا تھا ساغر صاحب اور ان کے ساتھیوں پر عائد کیا گیا ہے۔ اس قانون کی رو سے کسی پبلک اجلاس کے انعقاد کی منظوری قبل از وقت سپرینٹنڈنٹ پولیس سے حاصل کرنا ضروری تھی جس کے بغیر مقرر اور سامعین دونوں برابر کے مجرم قرار دئے جاسکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسا قانون متمدن اور مہذب ملکوں میں آج سے صدیوں قبل بھی رائج نہ ہوسکا۔

میری اسیری:۔

حکومت کا منشاء اس غیر متوقع حرکت سے صاف عیاں تھا۔ ورنہ ''آ بیل مجھے مار'' کے مصداق حکومت کیوں اس تحریک سے عدم تعاون کرنے والوں کو دعوت عمل دیتی۔ میرے ہم خیال رفقاء کی گرفتاری نے میرے لئے مشکل صورتحال پیدا کردی۔ جلسہ میرے ہی ایما پر ہوا تھا۔ اس لئے ان کی گرفتاری کی بالواسطہ ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی تھی۔ اسکے علاوہ میرے بہترین سیاسی رفقا کو بلاقصور جیل میں دھکیل دیا گیا تھا۔ چنانچہ دوستوں کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد میں سرینگر پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ حکومت ان لوگوں کو آزاد کردے گی جن کی گرفتاری خلاف قانون تھی۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ علاوہ بریں میرے تمام پرانے کارکن خواہ وہ شیخ عبداللہ کی جماعت سے متعلق تھے یا میرے گروپ کے ساتھ! تمام کے تمام قید ہوچکے تھے۔ سرینگر میں دفعہ ۱۴۴ ضابطہ

فوجداری کا نفاذ تھا۔ جلسے ممنوع تھے۔ چنانچہ ۱۵ ستمبر کو جمعہ کی رات میں نے مسجد شاہ ہمدان کے اندر ایک بھرے جلسے میں تقریر کی اور قید ہوگیا۔ اس قید کو قریباً دس سال ہوگئے ہیں، لیکن اس عرصہ میں میں نے ہزار بار سوچا کہ میں دوسروں کی آگ میں کیوں اور کیسے کودا۔ آج بھی میرے پاس اس بات کا جواب نہیں۔ لوگ شائد اسی واقعہ سے میرے اور شیخ عبداللہ کے درمیان فرق محسوس کر سکیں۔

گرفتاری کے بعد راتوں رات مجھے سنٹرل جیل سرینگر میں پہنچایا گیا۔ سری نگر جیل میں یہ میری پہلی قید تھی۔ جیل میں چونکہ جگہ کم تھی اس لئے مجھے چند پیشرو سیاسی قیدیوں کے ساتھ جیل کے وسیع احاطہ میں ایک خیمے کے اندر رکھا گیا۔ موسم شگفتہ تھا۔ جگہ بہت کشادہ تھی۔ مخصوص اسیرانِ قفس کا جھرمٹ تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ میری اسیری کی ساری سابقہ زندگی قید تنہائی میں بسر ہوئی تھی۔ اس کے برعکس اب کی دفعہ اسیر قفس ہونے کے باوجود دن میں چوبیس گھنٹے کھلی چھٹی تھی۔ چنانچہ شروع میں اکثر طبیعت میں یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ اگر تین سال تک بھی سزائے قید ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ لیکن ہفتے عشرے میں یہاں کے ماحول سے میری طبیعت اچاٹ ہوگئی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہاں تنہائی اور یکسوئی میسر نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ مال غنیمت کی بھرمار تھی۔ مال غنیمت ہم سیاسی قیدی کی اصطلاح میں کھانے پینے کی ان چیزوں کو کہا جاتا تھا جو بیرون جیل سے خلاف قانون طور پر درآمد ہوتی تھیں اور جیل کا نظم ونسق اور کنٹرول اس قدر ڈھیلا تھا کہ غالباً اخلاقی قیدیوں کی ہر بیرک میں چار چار حقے موجود تھے۔ میرا اپنا یہ یقین ہے کہ اس جیل میں افسروں کی آنکھ بچا کر دنیا کی ہر چیز درآمد ہو سکتی تھی۔ یہاں تک کہ اگر جیل کے اندر دروازوں کی چھوٹائی مانع نہ

ہوتی تو شائد قیدی ہاتھی اور اونٹ بھی بشرط ضرورت منگوا سکتے تھے۔ ان باتوں نے مل جل کر میری قید کی چند روزہ ہنگامی مسرت کو بیزاری میں تبدیل کر دیا۔

ریاسی جیل:۔

چند یوم کے بعد مجھے چھ ماہ کی سزا ہوگئی۔ چونکہ یہ منتقم حکومت کی روایت کے منافی تھا کہ مجھے قید تنہائی سے کبھی فراغت دے۔ اس لئے فیصلہ کے دوسرے روز ہی مجھے ریاسی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ جیل کے سوا دوسری جگہ مجھے مطالعہ کیلئے کبھی تھوڑا وقت بھی نصیب نہ ہوا۔ یہاں تنہائی میسر ہوئی تو میں نے پھر وسیع اور عمیق مطالعہ کا سلسلہ شرع کر دیا۔ علامہ اقبال مرحوم کے "چھ لیکچر" اسی جگہ میں نے پڑھے۔ میں فلسفہ کا طالب علم نہیں تھا۔ اس لئے ان کے سمجھنے میں مجھے بے حد دقت محسوس ہوئی۔ لیکن کچھ نہ کچھ میں نے اس کتاب سے اخذ کر لیا۔ اس خشک اور ادق مطالعہ کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں علامہ کی کتاب "ارمغان حجاز" جو ابھی ابھی شائع ہوئی تھی میں نے منگوا بھیجی جو عبادت کے بعد میرے لئے اطمینانِ قلب کا بہترین سرمایہ ثابت ہوئی۔ اس جیل میں بچھو بے شمار تھے۔ بعض اوقات روزانہ ایک ایک کمرہ سے درجنوں برآمد ہوتے تھے۔ زہریلی قسم کے سانپ بھی کم نہ تھے لیکن عجب اتفاق ہے اور روایت بھی یہی ہے کہ آج تک جیل میں کبھی کسی کو بچھو یا سانپ نے نہیں کاٹا۔ گویا فرش پر سونے والے بے بس قیدیوں کا محافظ خود خدا ہوتا ہے۔

فروری ۱۹۳۹ء میں میری اور شیخ عبداللہ کی یکے بعد دیگرے رہائی ہوئی۔ چونکہ جیل کے معاملہ میں ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار تھے۔ اس لئے سیاسی نظریات کے اختلاف اور گزشتہ تلخ اور ناخوش گوار تعلقات کے باوجود ہم میں پھر باہمی مراسم کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ لیکن توقع کے مطابق شیخ عبداللہ جیل سے

پکے نیشنلسٹ ہو کر نکلے۔ دونوں فریقوں میں مذاکرات کا سلسلہ از سر نو شروع ہو گیا۔ دو قوموں کا نظریہ ابھی پوری طرح منصۂ شہود پر نہیں آیا تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کے دل اندر ہی اندر سے گواہی دے رہے تھے کہ ہندو اور مسلمان کسی صورت اور کسی رنگ میں بھی ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ چہ جائیکہ متحدہ قومیت کے اصول کے تحت وہ ایک دوسرے سے گھل مل جائیں۔ عبداللہ پارٹی کے ساتھ مذاکرات کے دوران میں شیخ عبداللہ اور پنڈت بزاز سے سوال کیا گیا کہ کیا حکومت کشمیر کے خلاف مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی اور دفتری شکایات جن میں گاؤکشی، تبدیلی مذہب پر شدید پابندیاں، ہندی کی ترویج اور ملازمت میں حق تلفی وغیرہ بھی شامل تھیں پنڈت جواہر لال کے نزدیک قابل اعتنا اور معقول ہو سکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے یونہی یہ کہہ دیا کہ پنڈت جواہر لال ایسے نیشنلسٹ بھی مسلمانوں کے دلی طور سے مخالف ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ مسلمانان ریاست کی مذکورہ بالا مخصوص تکالیف و شکایات کے ازالہ کیلئے لب کشا ہو سکیں۔ اس پر یہ قرار پایا کہ پنڈت جی کی رائے ان تمام معاملات میں بذریعہ خط و کتابت حاصل کی جائے۔

پنڈت جی کا جواب بالکل میری پیش گوئی اور توقع کے مطابق نہ تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف حکومت کشمیر کے استبدادی اور امتیازی قوانین کی شدید مذمت کی اور شکایات کی بھی تائید کی۔

نیشنل کانفرنس کا قیام :۔

باہمی سیاسی گفت و شنید اور اپنی پارٹی سے اندرونی مذاکرات کے بعد یہ بات قرار پائی کہ نیشنل کانفرنس کے قیام کے فیصلہ کیلئے سرینگر میں مسلمانوں کا ایک مخصوص اجلاس طلب کیا جائے چنانچہ نیشنل کانفرنس کے قیام کیلئے مندرجہ

ذیل شرائط طے پائیں:

۱۔ مسلمانوں کی تمام مخصوص مذہبی، اقتصادی، سیاسی اور دفتری شکایات کیلئے جدوجہد کرنا نیشنل کانفرنس کے اغراض ومقاصد میں شامل ہوگا۔

۲۔ اسمبلی اور دیگر پبلک اداروں کے انتخابات میں مرّوجہ جداگانہ طریقہ انتخاب بحال رہے گا۔

۳۔ شیخ عبداللہ کانگریسی پالیٹکس نہیں اپنائیں گے۔ نہ کسی حالت میں کانگریس کی حمایت کی جائے گی۔

۴۔ مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ کی مخالفت کسی رنگ میں بھی نہ کی جائیگی۔

۵۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف جہاد آزادی میں ریاست کی تمام بسنے والی قومیں شریک ہوں گی۔ اور کانفرنس کا مُنتہائے مقصود ہر طریقہ سے ریاست میں ذمہ دارانہ نظام حکومت کا قیام ہوگا۔ وغیرہ!

یہ شرائط کھلے اجلاس میں میری جانب سے پیش کی گئیں اور فریقِ مخالف کی جانب سے تسلیم کی گئیں۔ ہماری جانب سے اعلان بھی کیا گیا کہ ہم ایک قسم کے میثاق کے تحت نیشنل کانفرنس میں شامل ہونے کیلئے تیار ہیں اور ہم متحدہ قومیت کے علمبرداروں کا سیاسی طرز عمل کچھ عرصہ دیکھنے کے بعد قطعی فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ ہر قسم کی ممکن جرح وتعدیل تنقید وتنقیح، پیش بندی اور حفظ ماتقدم کے بعد نیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ہندو پریس نے متفقہ طور پر نیشنل کانفرنس کے قیام کی مخالفت کی کیونکہ ان کے نزدیک مذکورہ بالا شرطوں اور جکڑ بندیوں کی وجہ سے یہ جماعت ایک فرقہ پرست جماعت تھی۔

اثرات ونتائج:۔

نیشنل کانفرنس کے قیام کے سلسلہ میں مفصلہ ذیل امور اثر انداز ہوئے

۱۔ شیخ عبداللہ اب ہمارے ہاتھ سے بالکل نکل چکے تھے اور نہرو کو اب اپنا گرو اور غالباً روحانی رہنما بھی سمجھنے لگے تھے۔

۲۔ اس وقت کے سیاسی حالات اور مسلمانوں کے تعلق میں مہاراجہ ہری سنگھ اور حکومت کشمیر کی مخصوص پالیسی کے پیش نظر ہمارے نزدیک مسلمانوں کا باہمی اختلاف قومی خودکشی کے مترادف تھا۔

۳۔ تمام چیدہ کارکن متفق تھے کہ ریاست میں مسلمانوں کی دو جماعتیں قائم نہیں رہ سکتیں۔

۴۔ اس وقت ہر ایک بخیال خود یہ سمجھتا تھا کہ شیخ عبداللہ مسلمانوں کو ختم کردینے کی سازش نہ کرپائیں۔

مسلمانوں کی اسی فیصدا کثریت کی موجودگی میں غیر مسلموں کی شمولیت مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت میں خلل انداز نہ ہو سکے گی۔

۶۔ جن شرائط کے تحت نیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں لایا جانا مقصود تھا وہ سراپا فرقہ وارانہ تھیں۔

۷۔ متحدہ قومیت کے اصول کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ متحدہ قومیت کیلئے ہند اور مسلمان کا ایک دوسرے میں جذب ہوجانا اسلامی نقطہ نگاہ سے ناممکن ہے۔ ہندو اور مسلمان کے درمیان صرف ایک سیاسی سمجھوتہ کے تحت اشتراک عمل ہو سکتا ہے۔ کانفرنس نے محض ہندوؤں کو ساتھ شامل کرنیکا فیصلہ کیا تھا۔

۸۔ ہندوؤں اور شیخ عبداللہ کے واسطے ہماری جانب سے اتمامِ حجت بھی پیش نظر تھا۔

اس میں میری ذاتی کمزوری کا بھی دخل تھا۔ گزشتہ آٹھ سال کی شدید

اور مسلسل سیاسی کشمکش نے جس میں ہر قسم کی جسمانی، روحانی مالی پریشانی اور بے اطمینانی شامل تھی، میری سیاسی کمر ہمت کو اس قدر توڑ دیا تھا کہ میں تن تنہا اس وقت علیحدہ تنظیم کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

مئی ۱۹۳۶ء میں حضرت قائداعظم سرینگر تشریف لائے تھے۔ مسلم کانفرنس کی جانب سے ان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا تھا۔ اس وقت صدر میں ہی تھا۔ ابھی شیخ عبداللہ اور ہم اکٹھے ہی تھے۔ سپاسنامے کے جواب میں حضرت قائداعظم نے فرمایا تھا کہ ریاست میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت کی وجہ سے مسلمانوں کے لیڈروں کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف غیر مسلموں کی تالیف قلوب کریں بلکہ ان کو سیاسی گاڑی کا ایک پہیہ سمجھ کر ساتھ چلائیں۔

یہ تمام وہ باتیں تھیں جنہوں نے بحیثیت مجموعی میرے اور میرے رفقاء کے ارادوں کو تبدیل کیا۔ اصل میں ہوتا وہی ہے جو قدرت کو منظور ہو۔ ہمارا یہ تمام سلسلہ سیاست خود بخود ڈھب پر آ رہا تھا۔ آج محسوس ہوتا ہے کہ اسوقت ہماری حیات قومی کی پوری تگ و دو ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ بلکہ ہم اس فرومایہ اور مجبور تنکے کی طرح تیز و تند ہوا کے آگے آگے اڑ رہے تھے جس میں خواہش مدافعت کے باوجود مقابلہ کی سکت اور طاقت نہ ہو۔

پرستارانِ خدا کے دو اسکول:۔

دنیا میں خدا کے پرستاروں کے دو مخصوص سکول ہیں۔ قُربِ الٰہی کے بارے میں ان دونوں گروہوں کے عقیدے اور نظریئے علیحدہ ہیں۔ ایک گروہ کے مطابق خدا کے حضور میں مقبولیت کا راز انسانی عجز و نیاز، خضوع و خشوع اور رضائے خداوندی کے سامنے بلا چُون و چرا جھک جانے میں پنہاں ہے اور دوسرے سکول کے عقائد کے لحاظ سے انسانی بیچارگی کی عام سطح سے بہت

اُونچے مقام پر پرواز کر کے خدا کے ساتھ مقاصد ومطالب روحانی ودینوی کے حصول کا سلسلہ قائم کیا جا سکتا ہے۔اس خیال کے مطابق ایسے لوگوں کی مرضی کیخلاف جب بھی کوئی بات ہوگی تو وہ اسکے برعکس منوانے کی قدرت واستطاعت اپنے اندر موجود پائیں گے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس گروہ میں بھی محدودے چند "رنداں قدح نوش" نظر آئیں گے۔جن کی مومنانہ نگاہ اور ارتقائے خودی سے ہر قسم کی تقدیر میں تبدیلی پیدا ہوسکتی ہے۔لیکن ظاہر ہے کہ دونوں گروہوں کا منتہائے مقصود ایک ہی ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ سیاسیات کشمیر کا معاملہ میرے نزدیک خدا کی مشیت کے مطابق اچھے اور برے مقامات سے ہوکر گذر رہا تھا۔جس پر ہمیں قطعاً کوئی اختیار نہ تھا۔

اگر شیخ عبداللہ اوران کے ساتھی باہمی میثاق پر قائم رہتے تو شائد نیشنل ازم ہی عوام کے درد کا مداوا ہوسکتا۔لیکن ایسا نہیں ہوا۔یہ یقیناً اچھا ہوا کہ نیشنل کانفرنس آج سے دس سال قبل معرض وجود میں آئی اور زیادہ اچھا یہ ہوا کہ ناقابل اصلاح ''کشمیری گاندھی'' بہت جلد اپنے اصلی روپ میں مسلمانوں کے سامنے آگیا۔ورنہ اگر تقسیم ہندوستان کے دوران میں یا اس سے کچھ عرصہ پہلے شیخ عبداللہ اچانک پینترا بدلتے تو شائد ریاست کشمیر چپکے ہی چپکے انڈیا کی آغوش میں چلی جاتی۔

شیخ عبداللہ کی وعدہ خلافی :۔

ابھی نیشنل کانفرنس عملی طور پر معرض وجود میں بھی نہ آئی تھی کہ شیخ عبداللہ پہلے دہلی میں پنڈت جواہر لال نہرو سے ملے اور واپسی پر لاہور پہنچ کر ''ٹریبیون'' اخبار کے ذریعہ ایک بیان میں کانگریس کی تعریف کے گیت گانے لگے۔

دوسرے دن جب وہ جموں پہنچے تو میں نے ان سے اس بیان سے متعلق محاسبہ کیا۔ اس پر انہوں نے مجھے یہ کہہ کر فوراً مطمئن کر دیا کہ مجھے اس بیان کے متعلق کچھ علم نہیں۔ یہ ٹریبیون کے ایڈیٹر کی مکاری ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آئندہ شیخ عبداللہ کو لاہور جانے کا تین چار مرتبہ اتفاق ہوا اور ہر بار ٹریبیون میں کانگریس کی مدح سرائی میں ان کے بیانات کا سلسلہ جاری رہا۔ اور استفسار پر وہی لاعلمی کا مختصر جواب ملتا رہا۔ آخری مرتبہ ایک بیان میں دبی زبان سے مسلم لیگ پر بھی نکتہ چینی کی گئی تھی۔ حالانکہ باہمی سمجھوتہ کی ہمارے نزدیک سب سے اہم شرط یہی تھی کہ شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کانگریس کے حق میں اور لیگ کے خلاف قطعاً لب کشائی کے مجاز نہ ہوں گے۔ انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے اس بارے میں حلفیہ وعدے بھی کر رکھے تھے۔

ہندی اور قانونِ اسلحہ :۔

اسی پر بس ہوتی تو شائد بات کچھ دیر کیلئے بنی رہتی۔ لیکن شیخ عبداللہ نے اب یہ ستم ظریفی شروع کر دی کہ اپنی تقریروں میں آہستہ آہستہ مسلمانوں کے مخصوص مذہبی مطالبات پر بھی نکتہ چینی کا آغاز کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۹۴۰ء کے وسط کا ہے۔ میں اس وقت تک سیاسی حیثیت سے قطعاً "منقارِ زیر پر" اور "قلم و قرطاس زیب جیب" کیے ہوئے تھا۔ اسی دوران میں ہندی کا مسئلہ بہت زیادہ طول پکڑ گیا۔ کیونکہ گوپال سوامی آئینگر اب سرعت کیساتھ ہندی اور بالخصوص ہندی رسم الخط کو مسلمانوں پر ٹھونسنا چاہتا تھا۔ اس سے چند ماہ قبل ایکٹ اسلحہ کا نفاذ بھی ہو چکا تھا۔ جس کی رو سے ہندو راجپوتوں کو بلا روک ٹوک اسلحہ رکھنے اور تفنگ و بارود کے کارخانے جاری کرنے کی کھلی اجازت دی گئی تھی اور اسکے مقابلہ پر مسلمانوں کو عموماً بالکل نہتا کر دیا گیا تھا۔ ہندی کے متعلق جو تازہ احکام حکومت وقت کی جانب سے جاری کیے گئے تھے۔ ان کے بارے میں مجھے ایک خاص دوست نے سرینگر سے بذریعہ ٹیلیفون مطلع کیا۔ اسی روز شیخ عبداللہ بھی لاہور سے جموں پہنچ گئے۔ ان دنوں

ہم پھر ایک دوسرے سے کھچے کھچے رہتے تھے۔ کیونکہ میں عملی طور پر نیشنل کانفرنس میں شامل ہوئے بغیر اس جماعت کے خوفناک مستقبل کی وجہ سے مشوش اور متردد ہو رہا تھا۔ بہر حال میں نے شیخ عبداللہ کو ہندی سے متعلق حکومت کے عزائم سے آگاہ کیا اور کہا کہ چند روز میں اسمبلی کے ہونیوالے اجلاس میں ایکٹ اسلحہ اور ہندی دونوں کے خلاف زبردست احتجاج کیا جائے اور اگر اقدام کی ضرورت ہو تو اس سے بھی تامل نہ کیا جائے لیکن انہوں نے دوٹوک جواب دے دیا ورا سمبلی کے اجلاس میں چوہدری حمید اللہ خان کے احتجاج کے باوجود نیشنل کانفرنس گروپ نے دونوں قومی معاملات کے بارے میں رائے شماری کے وقت غیر جانبداری کا اعلان کر دیا اور مسلمانان ریاست کی جو امیدیں ان سے وابستہ تھیں ان سب پر پانی پھر گیا۔ بس اس واقعہ کے بعد شیخ عبداللہ کے ساتھ میرے تعلقات ہمیشہ کیلئے ٹوٹ گئے۔ اس اہم واقعہ کے چند ماہ بعد پنڈت جواہر لال نہرو شیخ عبداللہ کی دعوت پر سرینگر آئے۔ وہاں سے وہ جموں پہنچے۔ خان عبدالغفار خان بھی ان کے ہمراہ تھے۔ جموں کے ہندوؤں نے ان کا جلوس نکالا۔ لیکن شیخ عبداللہ شہر جموں میں داخل ہونے کے ساتھ ہی میرے مکان پر پہنچے اور پھر صلح صفائی کی باتوں کے بعد کہا کہ پنڈت جی نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ قبل اسکے کہ وہ یہاں کسی اور کے ساتھ گفتگو کریں تم سے تبادلہ خیالات کرنا چاہتے ہیں۔ اٹھو چلیں۔ میں نے انکار کر دیا۔ اصرار پر میں نے صاف کہہ دیا کہ میرا ہندوستان کی سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ اور میں کانگری پالیٹکس اور اسکے نیشنل ازم کو قوم اور ملک کیلئے ایک لعنت سمجھتا ہوں۔ اسلئے اگر پنڈت جی سے بھی بڑا کوئی لیڈر ہو تو مجھے ملاقات کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ان لوگوں کا کام ہے جو بین الاقوامی شہرت کے طالب ہیں۔ اس پر شیخ عبداللہ کے مزاج کا پارہ بہت چڑھ گیا۔ اس دن ان کی گفتار اس قدر واہی، تباہی تھی کہ مجھے ان کی حالت پر ترس آتا تھا۔ کیونکہ ہمارے دو اور دوست بھی موجود تھے۔ جو ان کیلئے نیم اجنبی تھے۔ بس اس واقعہ کے بعد میری ایک ہنگامی ملاقات ۱۹۴۴ء میں ہوئی جب کہ حضرت قائداعظم سرینگر تشریف لائے اور دوسری ۱۹۴۸ء میں سنٹرل جیل جموں میں جبکہ شیخ صاحب چیف ایڈمنسٹریٹر بن چکے تھے۔

سترھواں باب

مسلم کانفرنس کی نِشاۃ الثانیہ!

اب میرے لئے خاموشی اور سیاسیات سے کنارہ کشی کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میں خوش تھا کہ اب ذرا سیاسی زندگی سے ستانے کا موقع مل گیا۔ اور سکونِ قلب نصیب ہوا۔

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات فقط ایک تغیر کو ہے زمانے میں

لیکن سیاسی زندگی میں ایک بار قدم رکھ کر آج تک کس نے باوجود دلی خواہش اور تمنا کے اس سے رستگاری حاصل کی ہے؟ چنانچہ پنڈت جی کی واپسی کے بعد شیخ عبداللہ کی کانگریس نوازی اور مسلم کشی کی داستانیں طول و عرضِ ریاست میں نشر ہونے لگیں۔ مسلمانوں کا ایک باشعور طبقہ اسلامی تنظیم کے پاش پاش ہو جانے کی وجہ سے تصویر یاس و اضطراب بنا ہوا تھا۔ عوام بددل تھے لیکن مہاراجہ ہری سنگھ، آئینگر اور ریاست کے ہندو بغلیں بجا رہے تھے۔ کہ مسلمانان ریاست کی تنظیم اور مرکزیت کا قصر عظیم ہمیشہ کیلئے منہدم ہو گیا۔ ادھر میں اور میرے ساتھی شرمسار اور پریشان تھے کہ جس قسم کیلئے اتنی جدوجہد کی اس کا کیا انجام ہوگا۔ لیکن قوم کے معاملہ فہم بالغ نظر اور دور اندیش لوگوں نے قومی خطرے کا نشان بلند کر دیا اور عوام نے بھی اپنے مستقبل کی بھیانک تصویر دیکھ کر انگڑائیاں لینی شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے طول و عرض ریاست سے وفود، خطوط اور دیگر ذرائع سے مجھ سے اپنے جمود تعطل کو توڑنے

کے مطالبے اور تقاضے شروع ہو گئے اور دو تین ہفتوں کے اندر اندر نوبت اس حد تک پہنچ گئی کہ مجھے مسلم کانفرنس کی ترتیب نو کا کٹھن کام پھر سنبھالنا پڑا۔ چند خاص دوستوں سے مشورہ کر کے ۱۹۴۱ء میں مسلم کانفرنس کے احیاء کا اعلان کر دیا اور صوبہ جموں کے دورے شروع کر دیئے۔

دور افتادہ اور پسماندہ عوام کے سیاسی عقیدے اور نظریئے عام طور پر کسی خاص تحقیق و جستجو پر مبنی نہیں ہوتے۔ وہ ایک آدمی کو ایک خاص معیار پر تول کر ایک دفعہ اپنا سیاسی لیڈر تسلیم کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ زمانہ کے سیاسی نظریات میں تغیر کی وجہ سے لیڈر کو تبدیل نہیں کرتے بلکہ لیڈر کی وجہ سے اپنے سیاسی نظرئے اور اصول قائم کرتے ہیں۔

میں نے صوبہ جموں میں شیخ عبداللہ کو بطور مہمان ہر جگہ بحیثیت لیڈر متعارف کرایا تھا۔ پہاڑوں میں بسنے والے سیدھے سادے مسلمانوں نے میری اس بات کو پلے باندھ رکھا تھا۔ اسلئے اب متعدد مقامات پر اپنے ہاتھوں سے باندھی ہوئی سیاسی گانٹھوں کو دانتوں سے کھولنا پڑا خاص کر تحصیل راجوری اور کسی حد تک میر پور میں مسلمانوں کے ایک حصہ کو شیخ عبداللہ سے منحرف کرانے میں کافی دقت کا سامنا ہوا۔

مسلم کانفرنس کا احیاء ہو چکا تھا کہ اس دوران شیخ عبداللہ راجوری کا چکر کاٹ کر جموں آئے اور انہوں نے ایک دوست کے ذریعہ مجھے پیغام بھیجا کہ اگر عباس راجوری پہنچ کر واپس آ سکے تو میں اسے ایک ہزار روپیہ بطور تاوان دوں گا۔ یہ کڑوی گولی مجھ سے بآسانی نگلی نہ جا سکتی تھی۔ میں نے تیسرے ہی دن راجوری کا قصد کیا اور بلا پروگرام راجوری پہنچ گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ واقعی میرے لئے زمین ہموار نہ تھی۔ یہاں تک کہ دو چار مقامی مخلص دوستوں نے بھی مجھے مراجعت کا

مشورہ دیا۔ میں نے قصبہ کو نظر انداز کر کے تحصیل راجوری کا دورہ شروع کر دیا۔ ہر جگہ لوگ گمراہ کئے جا چکے تھے۔ لیکن وہ جلد ہی راہ پر آتے گئے سب سے آخر میں میں نے قصبہ راجوری میں جلسہ کا اعلان کر دیا۔ وہاں چند پرانے نیشنلسٹ موجود تھے۔ لیکن وہاں بھی مخالفوں کو منہ کی کھانی پڑی اور اس طرح ساری تحصیل راجوری دس دن میں نیشنل ازم سے تائب اور شیخ عبداللہ سے بدظن ہو گئی۔

صوبہ جموں میں نیشنل اِزم کا خاتمہ :۔

راجوری سے میری واپسی کے ایک ماہ بعد شیخ عبداللہ اپنی ہردلعزیزی کے گھمنڈ میں پھر وہاں گئے۔ مگر جلسہ عام میں اس قدر پیٹے گئے۔ سر سے پاؤں تک لہولہان ہو گئے اور پولیس کی معیت میں راتوں رات وہاں سے بھاگ گئے۔

کچھ دیر دم لینے کے بعد انہوں نے پونچھ کا رخ کیا۔ پونچھ کے مسلمانوں کے دلوں میں مسلم کانفرنس اور میرے لئے انتہائی جذبہ عقیدت موجود تھا اور وہاں جاں نثار کارکنوں کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ وہاں سے بھی شیخ عبداللہ کو اپنا سا منہ لے کر لوٹنا پڑا۔ بلکہ پونچھ شہر میں تو لوگوں نے جلسہ عام میں ان کا ناک میں دم کر دیا۔ اس قدر علانیہ ان کی ذلت ہوئی کہ انہیں مجمع سے بھاگنا پڑا۔

شیخ عبداللہ میرے پرائیویٹ حالات سے اور ذاتی مجبوریوں سے آگاہ تھے۔ غالباً یہ یقین تھا کہ میں مسلم کانفرنس کی تنظیم نو کے بار گراں کا متحمل نہ ہوسکوں گا۔ لیکن مسلم کانفرنس کے احیاء کی وجہ سے انکو اب جان کے لالے پڑ گئے اور وہ زخم خوردہ چیتے کی طرح جھلا گئے۔ راجوری اور پونچھ میں اس قدر رسوائی اور ناکامی کے باوجود انہوں نے صوبہ جموں میں کسی نہ کسی مقام پر نیشنل کانفرنس کا نقش قائم رکھنے کی انتہائی کوشش کی چنانچہ اس سلسلہ میں ان کی آخری کوشش میرپور میں ۱۹۴۳ء میں نیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے

انعقاد کی تھی۔ میر پور میں ہمارے دو چار پُرانے ساتھی نیشنل کانفرنس میں اس وقت شامل تھے۔ اسکے علاوہ میر پورہ شہر میں سکھوں اور ہندوؤں کا کافی اثر ورسوخ تھا۔ اسی بنا پر نیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس وہاں منعقد کیا گیا تھا۔ کشمیر سے کافی مندوبین شامل ہوئے اور گنتی کے اور بھرتی کے دس بارہ صوبہ جموں سے بھی۔ فریدہ بیدی وغیرہ کو شمولیت کے لئے خاص دعوت دی گئی تھی۔ اس جلسہ کے صدر منتخب خود جناب شیخ تھے۔ ابتدا میں صدارتی جلوس کا عبرت ناک حشر ہوا۔ اہل جلوس اور شیخ کی وہ درگت بنی کہ اکثر مندوبین جلوس چھوڑ کر کشمیر واپس بھاگ گئے۔ سالانہ اجلاس کا پہلا جلسہ عام بھی منعقد نہ ہو سکا۔

صوبہ جموں کے اندر نیشنل ازم کے تابوت میں یہ آخری کیل تھی اور اسکے ساتھ نیشنل ازم صوبہ جموں میں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ اسکے بعد کبھی عبداللہ یا ان کے ساتھیوں نے صوبہ جموں کا رخ نہ کیا۔ چنانچہ وہ شہر جموں جب کبھی آتے تو ہندوؤں کے محلہ میں ان کا قیام ہوتا۔

جموں میں مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس:۔

صوبہ جموں کے چند علاقوں کا دورہ ختم کرنے کے بعد مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس میری صدارت میں طلب کیا گیا۔ صوبہ جموں سے نمائندوں کی تعداد بہت حوصلہ افزا تھی۔ مگر صوبہ کشمیر سے مندوبین کم تعداد میں شریک ہوئے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مسلم کانفرنس کے پرانے کارکن کم وبیش تمام نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گئے تھے اور دوسری یہ کہ ابھی ہم نے وادی کشمیر میں تنظیم کا سلسلہ شروع نہ کیا تھا۔ یہ اجلاس ۱۷۔ ۱۹ اپریل ۱۹۴۳ کو شروع ہوا۔ ریاست کا پہلا تاریخی اجلاس جس میں تحریک حریت کشمیر کی طرح ڈالی گئی تھی صوبہ جموں میں ہوا تھا۔ نیشنل کانفرنس کے قیام سے قبل آخری اجلاس اسی جگہ

منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس سے چھ روز پہلے کشمیر اسمبلی کا اجلاس جموں میں شروع ہو چکا تھا۔ ان ایام میں کرپس مشن ہندوستان میں پہنچ چکا تھا اور فریقین کے ساتھ سیاسی مذاکرات آخری مراحل طے کر رہے تھے۔ اس وقت امید تھی کہ یہ مشن اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا اور ایک مشترکہ مرکزی یونین کی داغ بیل ڈالی جائیگی۔ چنانچہ اپریل ۱۹۴۲ء کو سر گوپال سوامی آئنگر پرائم منسٹر کشمیر نے بمقام جموں ایوان اسمبلی میں بحث و تقریر کے دوران ریاست کی طرف سے یہ اعلان کرنے کی جسارت کی کہ ہندوستان میں یونین کے قیام کی صورت میں ریاست کشمیر اس یونین میں شمولیت کرنے میں باقی ریاستوں سے پیش پیش ہوگی۔ مسلم لیگ کا ردعمل اس قسم کی یونین کے خلاف تھا۔

میں نے اپنے خطبۂ صدارت میں آئنگر کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ریاست کی تمام سیاسی زندگی میں پہلی بار اس بات کا کھلے بندوں اظہار کیا گیا کہ مہاراجہ کشمیر کے ہندو ہونے کی وجہ سے ریاست کشمیر ہندو ریاست نہیں کہی جا سکتی۔ مسلمانوں کی یہاں عظیم اکثریت ہے۔ اس لئے دنیا کے تمام جمہوری اصولوں کے پیش نظر ریاست کشمیر مسلمانوں کی ریاست ہے۔ لہٰذا آئنگر کو آئینی طور پر یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مسلمانوں کی مرضی اور منظوری کے بغیر ریاست کے مستقبل اور قسمت کو ہندو اور انڈیا کے حوالے کر دے اور اگر ایسا کیا گیا تو مسلمان بزور بازو حکومت کشمیر کے اس منتقمانہ اور فرقہ وارانہ اقدام پر خطِ تنسیخ کھینچ دیں گے۔ اسی اجلاس میں میں نے پہلی بار مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کی ہم نوائی کی اور اسی اجلاس میں سب سے پہلی مرتبہ "پاکستان زندہ باد" اور "قائداعظم زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں نے جموں کی ہندوانہ فضا، مہاراجہ اور حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا کر دیا پاکستان کا نعرہ بلند کر کے ہم نے مسلمانان ہند کے مطالبہ کی حمایت کی لیکن ہری سنگھ آئنگر اور ڈوگرہ ہندو سخت مضطرب اور برہم ہو گئے کہ ہم نے واقعہ

ہری سنگھ کیخلاف علم بغاوت اور علم جہاد بلند کر دیا ہے۔

ہری سنگھ یا آئینگر اور ہمارے درمیان پہلے ہی سے کوئی رشتہ محبت قائم نہ تھا۔ میری تو ان سے ذاتی عداوت تھی۔ لیکن آج کے بعد ان تمام متعصب اور اسلام دشمن عناصر کا مسلم کانفرنس کے ساتھ مستقل اور شدید بیر ہو گیا۔ ہم نے بھی سر دھڑ کی بازی لگانے کا تہیہ کر لیا۔ آغاز تحریک سے لے کر ۱۹۴۲ء تک ہم نے جو مصیبتیں جھیلی تھیں وہ کیا کم تھیں۔ لیکن ہماری اس دور کی جدوجہد اور سیاسی کشمکش میں صبر واستقلال کے ساتھ ساتھ نبرد آزمائی اور دشمن کی طاقت کو پائے استحقار سے ٹھکرا دینا ایسی چیزیں تھیں، جن پر ہمیں بہت فخر تھا۔ فکر اس لئے کہ یہ چیزیں ہمارے اطمینان قلب کا موجب تھیں۔ پنجابی کہاوت ہے کہ غریب کی جوانی اور سردیوں کی چاندنی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ بعینہ پنجاب اور ہندوستان کے سبکسارانِ ساحل مسلمان اپنے ہنگاموں اور کاموں میں اس قدر مصروف تھے کہ ہم پر ریاست میں جو بیت رہی تھی، اسکے متعلق ہمدردی کے چند جملوں سے بھی وہ ہماری دل جوئی نہ کر سکے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سرد مہری پر ہم نے کبھی اپنے ماتھے پر شکن نہ آنے دی۔ کیونکہ ہم جو کچھ کر رہے تھے وہ محض اپنا فرض سمجھ کر کر رہے تھے اور ابتداء سے حکومت کشمیر کے ناوکِ ستم تن تنہاء برداشت کرنے کے خوگر ہو چکے تھے۔

مسلم کانفرنس کیخلاف مخالفین پاکستان کی صف بندی:۔

مسلم کانفرنس کی نشاۃ ثانیہ سے شیخ عبداللہ کے حوصلے پست ہو رہے تھے اور اسکے نیشنلسٹ ہونے کے باوجود حکومت کشمیر اس کی سابقہ مشکوک سیاسی روایات اور جماعتی غنڈہ گردی کی بنا پر ابھی اس کے ساتھ سیاسی گٹھ جوڑ پر آمادہ

نہیں تھی۔ البتہ کانگریس نے مسلم کانفرنس کو اس کا سب سے بڑا دشمن سمجھ کر اور اسی وجہ سے اسے پاؤں پر کھڑا کرنے کی غرض سے جماعتی کام کیلئے تحریری وتقریری پروپیگنڈا اور زر کثیر صرف کرنا شروع کردیا تھا۔

مسلم کانفرنس کی جانب سے پاکستانی حمایت نے ہندوؤں کو ہمارا جانی دشمن بنادیا تھا اور نیشنل کانفرنس کے حق میں یا لیگ اور پاکستانی مخالفت میں زمین وآسمان کے قلابے ملادینا مہاراجہ حکومت اور ہندوؤں کیلئے باعث اطمینان اور عبداللہ کی وجہ قربت ثابت ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کے تمام بااثر طبقے جن میں مہاراجہ، اس کی ہندو حکومت، اسکی برادری، ڈوگرے، کشمیری پنڈت اور نیشنل کانفرنسی مسلمان بھی شامل تھے، مسلم کانفرنس کیخلاف ایکاڑ کرکے اعلانیہ طور پر ہم سے برسر پیکار ہوگئے اور صوبہ جموں کے ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اقلیت تھی فرقہ وارانہ فسادات کا آغاز کردیا۔ حکومت نے اپنی سرکاری مشینری کے ذریعہ سے ہمارے چیدہ چیدہ کارکنوں کے خلاف دہشت انگیزی اور قید وبند کا سلسلہ شروع کردیا۔ ادھر کشمیر میں شیخ عبداللہ کی پارٹی کو ہمارے خلاف ہر اچھے برے کام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن پاکستان کا نعرہ بلند کرتے وقت ہم نے آنے والی ان مصیبتوں اور پریشانیوں کا جائزہ اچھی طرح لے لیا تھا اسلئے ہم مشوش نہ تھے۔

اس وقت تک وادی کشمیر میں مسلم کانفرنس نے تنظیمی سلسلہ جاری نہیں کیا تھا۔ البتہ مظفرآباد سارا کا سارا ضلع مسلم کانفرنس کے جھنڈے تلے آچکا تھا۔ اب ہم نے وادی کشمیر میں سیاسی تنظیم کا کام شروع کردیا۔ مولانا یوسف شاہ میر واعظ کشمیر بھی اسی دوران مسلم کانفرنس میں شامل ہوگئے۔ کشمیری کارکنوں کے فقدان، حکومت کی صریح جانبداری اور نیشنل کانفرنس کی سرمایہ داری اور غنڈہ

گردی کی وجہ سے مسلم کانفرنس کی تنظیم کا کام کوئی آسان بات نہ تھی۔ یوں شیخ عبداللہ اس بات پر ہر قسم کا سمجھوتہ کرنے کیلئے تیار تھے کہ مسلم کانفرنس کی سرگرمیاں صوبہ جموں ور نیشنل کانفرنس کا احاطہ کار وادی کشمیر تک محدود رہے۔ مگر آنے والے حالات اور مسلم کانفرنس کی نمائندہ حیثیت کے پیش نظر ہم ہر حال میں وادی کے اندر سیاسی اور جماعتی نبرد آزمائی کیلئے جان تک کی بازی لگادینے کا مصمم عہد کر چکے تھے۔ اور دنیا میں قوت ارادی کے مقابلہ پر کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔ صرف اس کی ہیبت ہی ہزاروں معجزوں کی حامل ہوتی ہے۔

نامساعد حالات اور مناسب ذرائع واسباب کی کمی کے باوجود ہم نیشنل کانفرنس کے مقابلہ پر کشمیر میں بے خطر کود پڑے۔ صرف ایک بات ہمارے حق میں تھی کہ کشمیری عوام کو مجھ سے بہت عقیدت تھی اور نیشنل کانفرنس کے کم وبیش تمام لیڈر سیاسی اختلافات کے باوصف اعلانیہ مقابلہ کی جرات کم کرتے تھے۔ بہر حال بظاہر مہینوں میں ختم ہونے والی کٹھن سیاسی منزلیں دنوں میں طے ہوئیں اور معمولی سی تگ ودو اور جدوجہد سے سرینگر کے بالائی حصے کے سوا جن میں (امیرا کدل بھی شامل ہے) نصف سے زیادہ شہر مسلم کانفرنس کے سیاسی عقیدہ کا پورا حامی ہوگیا اور اسی طرح ضلع بارہمولہ میں ہندوارہ۔ شہر بارہمولہ، دلنہ اور بڈگام وغیرہ کے تمام علاقے نیشنل ازم کی دست برد سے محفوظ ہو گئے۔ مگر جماعتی طور پر جس قدر ہم مضبوط ہو گئے، اسی قدر ہماری روحانی، دماغی اور جسمانی مجبوریاں زیادہ ہوتی گئیں۔

اٹھارواں باب

آئنگر کا تفرقہ انگیز دور!

حضرت قائداعظم سے دہلی میں ملاقات:۔ اب حکومت کے رویہ میں نمایاں معاندانہ اور جانبدارانہ تغیر پیدا ہوگیا۔ چونکہ باہمی رسہ کشی کی وجہ سے ریاستی مسلمانوں کی ہوا اکھڑ چکی تھی، اس لئے حکومت کشمیر نے ہر شعبہ زندگی میں مسلمانوں سے حکومت اور مہاراجہ کے خلاف ان کی باغیانہ روش اور قومی تکبر اور شوخ مزاجی کے بدلے گن گن کر لینے شروع کر دیئے۔ مسلم کانفرنسیوں کیلئے بالخصوص سرینگر شہر میں شہری زندگی ناممکن کر دی گئی۔ جنگ عظیم کی وجہ سے مسلم کانفرنس کوئی غیر آئینی اور سخت قدم بھی نہ اٹھا سکتی تھی۔ اس شش و پنج میں ۱۹۴۴ء میں میں نے حضرت قائداعظم سے ملاقات کیلئے دہلی کا عزم کیا۔ جہاں تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کی ملاقات میں میں نے حضرت قائداعظم کو کشمیر کی سابقہ اور موجودہ سیاسی اونچ نیچ سے آگاہ کیا۔ حضرت قائداعظم نے میری تمام باتیں بغور سنیں اور اپنی سیاسی پریشانیوں کا تذکرہ فرما کر مسلم لیگ کی جانب سے مسلم کانفرنس کو ہر قسم کی اخلاقی مدد دینے کا وعدہ فرمایا۔ حضرت قائد اعظم کیساتھ ۱۹۳۶ء کے بعد میری یہ پہلی باقاعدہ ملاقات تھی۔ میں جانتا تھا کہ آپ اور مسلم لیگ متعدد سیاسی مجبوریوں کی وجہ سے فوری طور پر ہمیں کچھ بھی مدد نہیں دے سکتے۔ لیکن اس ملاقات سے لیگ اور مسلم کانفرنس کے درمیان بالخصوص حضرت قائداعظم اور میرے مابین جو ایک خاص اخلاقی اور روحانی رشتہ قائم ہو گیا اس سے ہمارے ارادے اور حوصلے زیادہ مضبوط ہو گئے۔

ہم نے سیاسی دوروں کی بھرمار کردی اور بھدرواہ، کشتواڑ، ڈوڈہ، بانہال اور کٹھوعہ وغیرہ تمام دور نزدیک کے علاقوں میں از سر نو تنظیم ملی کی تکمیل ہوگئی۔

میرپور اور پونچھ میں گو مقامی کارکنوں نے مسلم کانفرنس کی شاخیں قائم کردی تھیں اور نیشنل ازم کا استیصال کردیا تھا۔ لیکن کانفرنس نشاۃ ثانیہ کے بعد ان علاقوں میں میں ابھی نہ گیا تھا۔ حکومت نہیں چاہتی تھی کہ میں خود ان علاقوں کا دورہ کروں۔ ریاست میں ان ہی دو علاقوں کے مسلمان تربیت یافتہ فوجی اور جنگ آشنا تھے۔ یہی علاقے ہمارے بازوئے شمشیر زن تھے۔ جن کو حکومت سیاسی اور قومی حیثیت سے کچلنے اور ہمیشہ کیلئے دبا دینے کی تاک میں لگی رہتی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں حکومت کے خلاف ہماری کھلی بغاوت ہوئی تھی۔ اس میں پونچھ اور میرپور والوں نے جو حصہ لیا تھا اس میں ڈوگرہ حکومت ان علاقوں کے مسلمانوں کے سیاسی اور قومی کس بل دیکھ چکی تھی۔ لہٰذا اس پاداش میں اس زمانہ میں انکے خلاف اتنا تشدد استعمال کیا گیا تھا کہ ایک عرصہ تک ان میں ابھرنے اور سر اونچا کرنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ لیکن ہماری سعی پیہم سے اب ان علاقوں کے مسلمانوں کی رگوں میں خون زندگی دوڑ رہا تھا۔ ان کا سینہ بیباکی وجوانمردی، قومی روح اور والہانہ جذبہ ملی کے شعور سے بھرا جا رہا تھا اور انکے دلوں میں ظلم وطغیان کے خلاف دبی ہوئی آگ کی چنگاریاں پھر سے شرر بار ہو رہی تھیں۔ حکومت کے کارندے مسلمانان پونچھ اور میرپور کی اس نئی کروٹ اور تبدیلی قلب سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اس کے ساتھ ہی جنگ عظیم جاری تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جاپان کی فوجی طاقت کی خوفناک لہروں نے بحر ہند میں بلاخیز تلاطم بپا کر رکھا تھا اور آسام کی سرحد کے قریب جاپانیوں کی

یلغار نا قابلِ مزاحمت معلوم ہو رہی تھی۔ اس لئے اوروں کی طرح مہاراجہ ہری سنگھ کو بھی اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے اور اسکے رہے سہے حوصلے ریاست کشمیر میں پاکستان کے نئے نعرے نے توڑ ڈالے تھے۔ اندریں حالات مہاراجہ اور حکومت کو یہ کس طرح گوارا ہو سکتا تھا کہ وہ پونچھ اور میرپور کے مسلمانوں کو خود ہی ہماری جھولی میں ڈال دے۔

ان علاقوں میں حکومت نے مسلمانوں کو ہم سے دور رکھنے کی انتقامی تدابیر کے علاوہ شیخ عبداللہ اور اسکے ساتھیوں کو یہاں دوروں اور سیاسی تقریروں کی عام اجازت دے رکھی تھی۔ بایں ہمہ حکومت کے یہ تمام حربے بے اثر ثابت ہو رہے تھے۔ ان علاقوں میں ہمارے دوست پے در پے تقاضے کر رہے تھے کہ میں جلد وہاں پہنچوں۔ چنانچہ میں نے جموں سے کوٹلی کے راستے پونچھ پہنچنے کا قصد کیا۔ لیکن سرحد پونچھ پر مجھے علاقہ پونچھ میں داخل ہونے کی بندش کا نوٹس دے دیا گیا اور میں وہاں سے راجوری چلا گیا۔

میر پور سے اخراج:۔

کچھ عرصہ کے بعد میں پھر پونچھ روانہ ہوا۔ لیکن پھر اسی مقام پر مجھے نوٹس دیا گیا۔ جس کی رو سے جاگیر پونچھ میں تین ماہ کیلئے داخلہ کی ممانعت کر دی گئی۔ اس دفعہ میں نے چاہا کہ نوٹس کی خلاف ورزی کر کے گرفتار ہو جاؤں لیکن رفقائے سفر کے اصرار پر مجبور ہو گیا۔ البتہ اس نوٹس کی پشت پر بسلسلہ تعمیل میں نے شیخ عبداللہ اور اپنے متعلق آئینگر کی جانب داری پر کڑی نکتہ چینی کی۔ ساغر صاحب اس دفعہ بھی میرے ہمراہ تھے اور مسلم کانفرنس کی نشاۃ ثانیہ کے بعد بالخصوص سیاسی جدوجہد میں تادم آخر ہمیشہ میرے ساتھ ہی رہے۔ ہم عالمِ مایوسی میں سرحد پونچھ سے میر پور پہنچے اور اسی رات جلسہ عام

میں شریک ہوئے۔ ساغر صاحب نے تقریر کی لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے میں حاضرین سے خطاب نہ کرسکا۔ صبح ہم میرپور کے اندرونی حصہ میں جانے کا ارادہ کررہے تھے کہ ایک مسلمان سب انسپکٹر پولیس ہمارے کمرہ میں آدھمکا اور اس نے ضلع میرپور سے ہمارے فوری اخراج اور پورے تین سال کیلئے داخلہ کی بندش کے تحریری احکام منجاب ڈپٹی کمشنر میرپور ہمیں دکھا کر رختِ سفر باندھنے کی فوری طور پر فرمائش کی ۔ میں کئی بار گرفتار ہوچکا تھا۔ نظر بندی اور اخراج کے درجنوں نوٹس پولیس افسروں کے ذریعہ سے مجھے موصول ہوچکے تھے لیکن اس مسلمان سب انسپکٹر کا رویہ ہمارے خلاف انتہائی متمردانہ تھا۔ ڈپٹی کمشنر شائد ہمیں تقریر کی اجازت بھی نہ دیتا لیکن ہمارے خلاف قانونی کاروائی کرنے کا مجاز وہ نہ تھا۔ آئینگر سے جو اس وقت سرینگر میں تھا تحریری احکام حاصل کرنے میں اسے تاخیر ہوئی۔

پونچھ میں قومی شیرازہ بندی:۔

فروری ۱۹۴۳ء میں میرے خلاف ڈپٹی کمشنر پونچھ کے نوٹس کی میعاد ختم ہوئی تھی۔ اسلئے میں پھر ۱۲ر فروری کو عازم پونچھ ہوا۔ لیکن اب کے میں جموں سے سیدھا کوٹلی کے راستے پونچھ نہ جاسکتا تھا کیونکہ اسطرح ضلع میرپور کا علاقہ میرے راستے میں پڑتا تھا۔ بانہال کا راستہ برف باری کی وجہ سے بند تھا، اسلئے میں راولپنڈی اور اوڑی کے راستے پونچھ روانہ ہوا۔ حاجی پیر پر پہنچا تو اس دفعہ پھر پولیس کے افسر وہاں موجود تھے۔ مجھے پھر چھ ماہ کیلئے پونچھ میں داخلہ کی بندش کا نوٹس دیا گیا۔ اس دفعہ اسلامیانِ پونچھ نے حکومت کے گزشتہ طرز عمل کے پیشِ نظر جلسہ کی تیاریاں اعلیٰ پیمانہ پر کر رکھی تھیں اور پلندری، راولاکوٹ، باغ اور مینڈر کے علاقوں سے جید اور سربرآوردہ نمائندوں اور رہنماؤں کا اجتماع ہورہا تھا۔ جنہوں نے

قطعی فیصلہ کر رکھا تھا کہ اگر مجھے اس دفعہ بھی پونچھ جانے کی اجازت نہ دی گئی تو حکومت کیخلاف اسی وقت سیاسی تحریک شروع کردی جائیگی۔ تمام علاقہ پونچھ میں بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ حاجی پیر پر مسلم کانفرنس پونچھ کے دو نمائندے بھی پہنچ گئے تھے۔ جنہوں نے مجھے صحیح صورتحال اور عوام کے جذبات سے آگاہ کیا۔ لیکن اپریل کے وسط میں ہمارا سالانہ اجلاس سرینگر میں ہو رہا تھا اسلئے میں نے پونچھ والوں کو صبر اختیار کرنے اور اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی تلقین کی اور پھر بے نیل و مرام واپس آ گیا۔ لیکن میرے خلاف حکومت کی ان پیہم متعصبانہ کاروائیوں نے پونچھ میں ملی شیرازہ بندی کا وہ کام سرانجام دیا جو شائد میرے جانے سے بھی نہ ہوتا۔ کیونکہ شیخ عبداللہ پونچھ میں بلا روک ٹوک تین دفعہ جا چکے تھے اور ان کی آمد پر ہمیشہ حکام پونچھ اس کی آؤ بھگت کرتے رہے۔ حکومت کی یہ متضاد روش عوام کی آنکھوں کیلئے سرمۂ بصیرت بن گئی۔

آئنگر کے کارنامے:۔

گوپالا سوامی آئنگر چھ سال کشمیر کا وزیر اعظم رہا۔ یہ وہی آئنگر ہے جس کو انڈیا نے بعد میں مسئلہ کشمیر کے سلسلہ میں اقوام متحدہ کی انجمن میں اپنا بہترین نمائندہ سمجھ کر اپنے مقدمہ کی پیروی کیلئے لیک سیکسیس بھیجا تھا۔ آئنگر کی ذہنیت سے انڈیا کی ذہنیت کا پتہ چل سکتا ہے۔ آئنگر کی ذہنیت کشمیر میں اس چھ سالہ کارکردگی سے عیاں ہے۔ کشمیر میں آئنگر کے آنے پر انتخابات اسمبلی میں مسلم کانفرنس نے حکومت کی سرتوڑ مخالفت کے باوجود تمام کی تمام مسلم نشستیں جیت لی تھیں۔ مسلمانوں کی تنظیم اور طاقت کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کی حکومت کے تمام کل پرزے مسلم کانفرنس کی ہیبت سے سہمے رہتے تھے۔ لیکن آئنگر آیا تو اس نے سب سے پہلے گلانسی رپورٹ کو عملاً

کالعدم کردیا۔ اس رپورٹ کے ذریعے مسلمانوں کو ملازمت میں کچھ نہ کچھ نمائندگی میسر تھی اوراسی سے حکومت کے دوسرے شعبوں میں مسلمانوں کو تھوڑی بہت قومی حیثیت قائم تھی۔ مذہبی، سیاسی اور تعلیمی اعتبار سے بھی اسی رپورٹ کی وجہ سے مسلمان ایک نئی کروٹ لے رہے تھے۔

آئنگر کی حکومت ہی نے ایکٹ اسلحہ پاس کیا۔ اسی کی بدولت سرکاری ملازمت کیلئے ایسے قواعد مرتب کئے گئے جو مسلمانوں کے مفاد کے صریحاً منافی تھے۔ ہندی کی ترویج اور مسلمانوں کی مرضی کے خلاف اسکا ان پر ٹھونسا جانا بھی اس آئنگر کی بدولت تھا۔ اسکے عہد میں شہر جموں میں ایک ہندو راجپوت عورت مشرف بہ اسلام ہوئی ءاور ہندوؤں نے اعلانیہ دن دہاڑے سرکاری دفاتر کے پاس سے اس عورت کو سر بازار پکڑ کر پیٹا، گھسیٹا اور جب پولیس نے مداخلت کی تو اسکے مقابلہ پر آمادہ ہو گئے۔ پولیس کو منہ کی کھانی پڑی اور اس مظلوم عورت اور اسکے باپ کو جو خود بھی مسلمان ہو گیا تھا مسلمانوں کے احتجاج کے باوجود شہر سے غائب کر دیا گیا اور مسلسل دو ماہ تک اس عورت کو برآمد نہ کیا گیا۔ حالانکہ آئنگر کو علم تھا۔ اس عورت کے باپ کو آخر کار اس جرم کی پاداش میں مارڈالا گیا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ مہاراجہ سے لیکر معمولی ہندو چپراسی تک حکومت کی تمام ہندو برادری نے اعلانیہ اس معاملہ میں مظاہرے کئے۔ آئنگر کا سب سے زیادہ سیاہ کارنامہ یہ تھا کہ اس نے ایک متعصب ہندو کی حیثیت سے مسلمانوں کی حیات ملی اور شیرازہ بندی پر شب خون مارے۔ مسلم کانفرنس کے زعماء اور ان کی تمام پارٹی کو اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے مسلم کانفرنس میں شمولیت کی تھی اور مسلم کانفرنس کے ایما پر میرواعظ نے حکومت مقرری کو لات ماری تھی اس قدر رسوا کیا کہ الامان۔ حضرت بل جو کشمیر کے اجتماعات کا سب سے بڑا مرکز ہے صدیوں سے میرواعظ ہی یہاں وعظ کیا کرتے تھے۔ لیکن

آئنگر نے قانون اور آئین کی تمام قیود کو توڑ کر دوران وعظ میر واعظ پر نیشنل کانفرنسی غنڈوں کی جانب سے پولیس اور مجسٹریٹوں کی موجودگی میں حملہ کرا دیا اوراسطرح حضرت بل کے پلیٹ فارم کو نیشنل ازم کے پروپیگنڈے کیلئے عبداللہ پارٹی کے سپرد کر دیا۔ شہر سرینگر میں ہر دوسرے روز مسلم کانفرنسیوں پر نیشنلسٹ غنڈے مسلح اور منظم حملے کرتے تھے اور پولیس کے اعلیٰ حکام ساتھ ہو کر مسلمانوں کو پٹواتے تھے۔ جب آئنگر آیا تھا تو مسلمانان کشمیر کی طرف چشم فلک بھی خشمگیں نگاہ سے دیکھ نہ سکتی تھی۔ انکا ملی، قومی اور جماعتی نظام قابل رشک تھا۔ لیکن جب آئنگر کی ریاست سے مراجعت ہوئی تو مسلمانوں کی تنظیم کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ کہیں گوجر اور غیر گوجر کا سوال تھا، کہیں راجپوت اور جاٹ کا، کہیں شہری اور دیہاتی کا اور کہیں پنجابی اور کشمیر کا اور سب سے زیادہ حکومت کی جانب سے نیشنل کانفرنس کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا تھا۔ ۱۹۳۴ء کے بعد ہری سنگھ کے تعصب کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ لیکن ۱۹۴۳ کے بعد یہ فیصلہ کرنا کہ ہری سنگھ زیادہ مسلم کش انسان تھا یا آئینگر یا ان دونوں سے بڑھ کر خود شیخ عبداللہ بہت مشکل بات تھی۔

آغاز اپریل ۱۹۴۳ء میں آئنگر ریاست سے چلا گیا۔ اس کی جگہ عارضی طور پر کرنل ہکسر وزیر اعظم مقرر رہا۔ ہکسر اس زمانہ میں مہاراجہ کے بچے کا اتالیق تھا۔ اس کی آخری آرزو یہ تھی کہ وہ کسی طرح ریاستی کا مستقل پرائم منسٹر بن سکے۔ اسے کسی سیاسی پارٹی سے موافقت یا مخالفت نہ تھی۔ نہ وہ سیاسی دھڑا بازی کا حامی تھا۔ البتہ وہ اس پارٹی کا بندہ بننے کو تیار تھا جو کشمیر کی لیلائے وزارت سے اس کو ہمکنار کرا سکے۔

انیسواں باب

نواب بہادر یار جنگ مرحوم

اس سال مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس میری زیر صدارت سری نگر میں منعقد ہوا جس میں نواب بہادر یار جنگ مرحوم کو بھی شمولیت کی دعوت دی گئی تھی۔ جلسہ سے دو چار روز قبل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کشمیر نے ہمارے اجلاس پر بے حد ذلیل اور ناقابلِ برداشت پابندیاں عائد کر دیں۔ جن کے باعث اِجلاس کا اِنعقاد ہی خارج از بحث تھا۔ صدارتی جلوس کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ جلسہ رات کو شروع ہونے والا تھا اور نواب صاحب مرحوم قریب دن کے بارہ بجے سرینگر پہنچے۔ مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ اس وقت میر واعظ منزل میں جلسہ کے متعلق حکومت کی جانب سے عائد کردہ شرائط پر غور کر رہی تھی کہ نواب صاحب بھی وہاں تشریف لے آئے۔ میری ان کے ساتھ یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس سے قبل محترمی میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر "ہمایوں" کے توسل سے نواب صاحب سے صرف غائبانہ تعارف تھا۔ میاں صاحب مسلم کانفرنس کی نشاۃ ثانیہ کے بعد دو سال متواتر گرمیوں میں سرینگر آتے رہے اور اپنے قیام کے دوران انہوں نے مسلم کانفرنس کی تنظیم اور استحکام کے سلسلے میں بے حد دلچسپی لی اور دوڑ دھوپ کی۔ جماعتی مذاکرات کے سلسلہ میں ان سے ملاقاتیں ہوتی تھیں اور ان ملاقاتوں میں میاں صاحب اکثر نواب صاحب مرحوم کی تعریف کیا کرتے تھے۔ اس وجہ سے نواب صاحب کے ساتھ میرا اشتیاق ملاقات بہت بڑھ چکا تھا۔ میر واعظ منزل میں پہنچ کر نواب صاحب نے ابھی دم بھی نہ

لیا تھا اور صرف چند باتیں حضرت قائداعظم کی مدح میں بیان فرما رہے تھے کہ حکومت کی جانب سے سرینگر سے ان کے اِخراج کا حکم پہنچ گیا۔ اس خبر سے ہم سب گُم سُم ہو گئے۔ ہمارے سامنے دو ہی راستے تھے کہ نواب صاحب خلاف ورزی احکام کریں یا بہ مجبوری کشمیر سے واپس تشریف لے جائیں۔ مجلس عاملہ کے اکثر ممبروں کی خواہش تھی کہ نواب صاحب اس حکم کی خلاف ورزی کر کے قید ہو جائیں لیکن نواب صاحب کو یہ پوزیشن معقول وجوہ کی بنا پر منظور نہ تھی۔ مجھے بھی ان سے اتفاق تھا۔ کیونکہ نواب صاحب کی گرفتاری سے مسلم لیگ کی پوزیشن مخدوش ہونے کا احتمال تھا اور جیسا کہ بعد میں یہ احتمال صحیح ثابت ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ حضرت قائداعظم ہمارے اس فیصلہ پر کبھی صاد نہ کریں گے بلکہ ناراض ہو جائیں گے۔ اندریں حالات ہم نے بمصداق ''یار زندہ صحبت باقی'' نواب صاحب کو رخصت کیا۔ میر واعظ منزل سے باہر جامع مسجد تک زائرین کا جمِ غفیر تھا۔ جس نے ''نواب بہادر یار جنگ زندہ آباد'' کے نعروں سے فضائے آسمان میں اِرتعاش پیدا کر دیا۔ نواب صاحب کی بیگم صاحبہ بھی ان کے ہمراہ تشریف لائی تھیں۔ ان کے قیام کا انتظام ہم نے ہاؤس بوٹ میں بمقام ڈل گیٹ کر رکھا تھا۔ نواب صاحب سیدھے اپنی قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔ تا کہ وہاں سے بیگم صاحبہ کو ساتھ لے کر عازم راولپنڈی ہو جائیں۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ نواب صاحب کو پولیس افسروں نے نہایت توہین آمیز اور تحکمانہ انداز سے ہاؤس بوٹ سے نکالا اور سینئر سپرانٹنڈنٹ پولیس کے دفتر میں پہنچایا۔ ایس ایس پی کا سلوک اور زیادہ ذلت آمیز اور افسوس ناک تھا۔ باوجودیکہ بارش کی وجہ سے موسم کافی خنک تھا لیکن حکومت کشمیر نے اپنی روایتی بداخلاقی اور تعصب کا اس طرح ثبوت دیا کہ نواب صاحب اور بیگم

صاحبہ کو جن کی سرینگر میں کوئی پہچان نہ تھی بستر تک ساتھ لے جانے کی اجازت نہ دی اور رات کی تاریکی، خنکی اور موسلا دھار بارش میں ان کو کوہالہ پل کے پار چھوڑ دیا گیا۔ اسی رات میں نے بحیثیت صدر کھلے اجلاس میں نواب صاحب کیساتھ حکومت کے ناروا سلوک اور جلسے پر شدید پابندیوں کیخلاف بطور احتجاج سالانہ اجلاس کو ختم کر دیا۔ عوام کے جذبات چونکہ نواب صاحب کے بارے میں بہت مشتعل تھے اور لوگ بے قابو ہو رہے تھے۔ اس لئے میں نے مختصر سی تقریر میں ان کو صبر کی تلقین کی اور حکومت کشمیر کے متعصبانہ اور کمینہ سلوک کے خلاف شدید نکتہ چینی کی۔

میرے والد بزرگوار کا انتقال :-

مجھے اسی رات بانہال سے بذریعہ تار اطلاع موصول ہوئی کہ میرے والد محترم کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور تدفین میری آمد تک ملتوی رکھی گئی ہے۔

میرے والد محترم بے حد متشرع اور دیندار تھے۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ میں نے اپنی عمر میں ان کو ہمیشہ معمولاً اور التزاماً دو بجے صبح کے لگ بھگ بیدار ہوتے پایا۔ تہجد، نماز پنجگانہ اور روزہ سوائے علالت کے انہوں نے کبھی ناغہ نہ کیا۔ مجھے ان سے بعض مذہبی عقائد میں اختلاف تھا۔ لیکن میں جو کچھ بھی ہوں اور جو کچھ بھی میں نے اس دنیا میں حاصل کیا سب انکی بدولت ہے۔ یہاں تک کہ میری موجودہ زندگی بھی ان ہی کی مرہونِ منت ہے۔ ابتداء میں مہاراجہ ہری سنگھ اور ڈوگرہ حکومت کے خلاف لب کشائی کوئی آسان بات نہ تھی۔ چہ جائیکہ حکومت کے خلاف باغیانہ تحریک کی رہنمائی کی جاتی۔ اکثر گھر والے میری سیاسی سرگرمیوں کے مخالف تھے۔ لیکن والد محترم بالخصوص تخلیہ میں میری گرفتاری پر ہمیشہ خوش رہتے اور مجھے ہمت اور استقلال کا سبق دیتے۔ جب

میری غیر آئینی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو ایک دفعہ باوجود کسر نفسی کے خود بھی گرفتار ہو گئے ۔اب ان کے پاس مجھے دینے کیلئے کچھ نہ رہا تھا۔ لیکن ان کی زندگی اوران کی میرے حق میں دعائیں میرے لئے دنیا کی تمام نعمتوں اور ثروتوں سے زیادہ گرانقدراندوختہ اورزادحیات تھیں ۔ کاش وہ آج زندہ ہوتے اورمیری پریشانیٔ خاطر میں میرے دردِدل کا مداوا ہوسکتے ۔ان کی موت کی خبر میرے لئے ناقابل برداشت تھی اور گو سرینگر سے بانہال صرف دو اڑھائی گھنٹے کا سفر تھا لیکن ایک تو سالانہ اجلاس کے قضیہ نے صورت حالات پیچیدہ کردی تھی اور پھر نواب صاحب مرحوم کے ساتھ وحشیانہ اورانسانیت سوز سلوک نے عوام میں اس قدر رنج وغم اوراضطراب پیدا کردیا تھا کہ میرے لئے والد مرحوم کے تعلق میں آخری فرض کی بجا آوری ناممکن ہوگئی جس کا افسوس مجھے ہروقت رہتا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

نواب صاحب سے میں نے دوسرے روز راولپنڈی میں جا کر ملاقات کی ۔ان کے ساتھ ناروا سلوک اورذہنی اورجسمانی تکلیف اور پریشانی کیلئے اظہارِ افسوس کیا۔ لیکن وہ پیکر خلق وانکسار اور مجسمۂ انسانیت وبُردباری تھے۔ میرا تمام جسم ندامت کے باعث عرق عرق ہورہا تھا۔ لیکن انہوں نے نہایت خندہ پیشانی اورعالی حوصلگی سے میرے جذبات واحساسات کو نوازتے ہوئے معاملے کو ختم کردیا۔ کچھ عرصہ کے بعد میرے اوران کے مراسم بہت بڑھ گئے ۔ خداترسی یا خداپرستی ، دینداری وپرہیزگاری حق گوئی اور بے باکی متانت وسنجیدگی اور دل نوازی وبندہ پروری کے اعتبار سے دنیا میں ان کے مرتبے کے صرف چند نفوس ہی مل سکیں گے ۔میرے نزدیک اس چودھویں صدی میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی صفات کا صحیح نمونہ نواب مرحوم تھا۔ ان

کے پائے کا مقرر اردو میں آج تک پیدا نہیں ہوا۔

قائداعظم کا دربان :۔

حضرت قائداعظم کی ذات سے ان کو والہانہ عقیدت تھی۔ سرینگر میں آکر ہماری مجلس عاملہ میں شریک ہوئے تو بغیر تمہید کے حضرت قائداعظم کی مدح میں موتی بکھیرنے شروع کر دیئے اور فرمایا کہ جناح جناح نہیں خدا کی رحمت ہے۔ جو ہم گنہگار مسلمانوں پر آسمان سے نازل ہوئی۔

ایک دفعہ میں حضرت قائداعظم سے ملنے کیلئے دہلی گیا۔ نواب صاحب مرحوم ملاقات سے فارغ ہو کر باہر آئے تو حضرت قائداعظم کے دربان غلام محمد کو دس روپے کا نوٹ دینا چاہا اور اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ باوجود اِصرار اور تقاضا کے نواب صاحب اس کو مائل نہ کر سکے۔ پھر فرمایا دیکھو غلام محمد تم حضرت قائداعظم کے دربان ہو اسلئے تمہارا مقام اونچا ہے۔ جسے تم محسوس نہیں کرتے۔ خدا گواہ ہے کہ اگر حضرت قائداعظم قبول کر لیں تو تمہاری جگہ میں ان کی دربانی کو اپنے لئے سعادت دین و دنیا سمجھوں گا اور یہ کہہ کر کچھ آبدیدہ ہو گئے۔ مجھ پر بھی رقت طاری ہو گئی۔ میں نے بھی غلام محمد کو سمجھایا۔ اس پر اس نے وہ رقم قبول کر لی۔

کراچی میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر نہایت ہی موثر اور رُلا دینے والی تقریر کرنے کے بعد جب وہ بیٹھے تو میں ان کے ساتھ کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں انکی تقریر سے بے حد متاثر ہوا اور وارفتہ ہو گیا۔ میں نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دینا چاہا لیکن سادہ مزاجی اور انکساری کا یہ عالم تھا کہ اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر خود اسے چوما اور بعد میں میری پیشانی پر بوسہ دیا۔ اتنی عظیم المرتبت شخصیت اور لوگوں کے ساتھ یہ برتاؤ اور یہ اخلاق۔ یہ خدا کی دین ہے وہ جسے چاہے سرفراز کرے۔

قائد اعظم کا تکدر:۔

اسی تقریر کے دوران میں نواب صاحب مرحوم نے ایک ایسی بات کہہ دی جو قائداعظم کی طبیعت پر گراں گزری۔ آپ نے نیم سنجیدہ اور نیم مزاحیہ انداز میں فرمایا "نواب صاحب کیا یہ مسلم لیگ کو چیلنج ہے؟ نواب صاحب اداشناس تھے۔ فوراً سمجھ گئے کہ حضرت قائداعظم ناراض ہیں۔ جواب دیا کہ "ہرگز نہیں قائداعظم" اور پھر سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے حضرت قائداعظم کی شان میں نہایت برجستہ موثر اور دل ہلا دینے والی تقریر کی اور بیٹھ گئے۔ لیکن میں نے یہ محسوس کیا کہ قائداعظم کی ناراضی میں دراصل کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ دوسرے دن صبح میں نے قائداعظم سے اسی مقصد کے پیش نظر ملاقات کی نواب صاحب مرحوم کا میں دلدادا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ حضرت قائداعظم ان سے خفا رہیں۔ میں بھی حضرت قائداعظم کی طبیعت کو کچھ کچھ سمجھتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اگر ان کی طبیعت میں یہ تکدر رہا تو معاملہ طول کھینچ جائیگا۔

اس سلسلہ میں نواب صاحب کے ساتھ میرے جذبات عقیدت کے علاوہ میری پریشانی اور پشیمانی کی اور بھی وجہ تھی جس کا مجھے اب افسوس کے ساتھ اعتراف ہے وہ یہ کہ تقریر سے تقریباً دو گھنٹے قبل نواب صاحب مرحوم نے مجھ سے یوں ہی باتوں باتوں میں پوچھا کہ آج کی تقریر کا موضوع کیا ہونا چاہئے۔ اسلامیانِ ہند کے نمائندہ سالانہ اجلاس میں میری یہ پہلی شرکت تھی اور سچ تو یہ ہے کہ شوکت اسلام کے اعتبار سے پلیٹ فارم کا رنگ ڈھنگ میری عقل کیمطابق چند باتوں میں حوصلہ شکن تھا۔ میری طبیعت پر گزشتہ تین یوم سے اس چیز کا گہرا اثر تھا۔ چنانچہ میں نے نواب صاحب سے اسی بات کا ذکر دبی زبان میں کردیا۔ اسکے بعد نواب صاحب کی تقریر اسی موضوع کی حامل تھی

میں نے حضرت قائداعظم سے دوران ملاقات نواب صاحب کی کل والی تقریر کا ذکر چھیڑ دیا۔ ان کے ماتھے پر ہلکی سی شکن ظاہر ہوئی۔ ان کو یہ شبہ تھا کہ نواب صاحب مرحوم نے ایسی تقریر دیدہ دانستہ کی تھی۔ میرے دلائل حضرت قائداعظم کو مطمئن نہ کر سکے۔ آخر میں مَیں نے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو حقیقت حال کہوں۔ چنانچہ میں نے برملا کہہ دیا کہ اس تقریر کی ذمہ داری میرے کندھوں پر ہے۔ ورنہ نواب صاحب کے ذہن میں یہ موضوع تقریر نہ تھا۔ بہر حال حضرت قائداعظم کا غصہ فرو ہو گیا۔ اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن اس واقع کا ذکر میں نے نواب صاحب مرحوم سے نہیں کیا۔

۱۹۴۴ء میں حضرت قائداعظم سرینگر میں تھے نواب صاحب کی وفات ان ہی ایام میں ہوئی۔ ان دنوں حضرت قائداعظم ہاؤس بوٹ میں مقیم تھے۔ میں اس روز ان کی خدمت میں جایا کرتا تھا کہ حضرت قائداعظم اور محترمہ مس فاطمہ جناح مجھے بنڈ پر دریا کے اس طرف ملے۔ میں نے عرض کیا آپکی طرف جا رہا تھا۔ فرمایا میں اس وقت شاپنگ کے لئے گھر سے نکلا ہوں۔ میرے اِصرار پر کہ کام بہت ضروری ہے۔ انہوں نے مراجعت فرمائی اور ہم شکارے میں بیٹھ کر دریا کے پار ہاؤس بوٹ میں داخل ہوئے۔ جب حضرت قائداعظم آرام سے بیٹھ گئے اور سگریٹ سلگایا تو میں نے نواب صاحب کی وفات کی خبر ان کو سنائی۔ اس کے بعد کمرہ میں سُکوت طاری ہو گیا۔ مجھے خود انتہائی صدمہ تھا۔ لیکن فرطِ غم کے باوجود اس اثنا میں حضرت قائداعظم کے چہرے پر نظر ڈال دیتا تھا۔ رنج و غم آپ کے چہرے سے عیاں تھے۔ پانچ منٹ کے بعد قائداعظم نے فرمایا! غالباً پہلی دفعہ مجھے کسی موت سے اتنا شدید صدمہ ہوا ہے۔ پھر نواب صاحب کی خوبیاں بیان کیں اور کراچی والی تقریر کا واقع دہرایا۔ اس کے بعد مرحوم کی بیگم کو بذریعہ تار پیغام تعزیت بھجوایا۔

بیسواں باب

سر مہاراج سنگھ وزیر اعظم

سالانہ اجلاس کی ناکامی اور نواب صاحب مرحوم کے واقعہ نے سیاسیات ریاست میں ایک عجیب کشمکش پیدا کر دی۔ نیشنل کانفرنس نے اپنی پرانی روایتی تنگ نظری اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے نواب صاحب کے اخراج کے سلسلہ میں حکومت کی ''دور اندیشانہ'' اور ''مدبرانہ'' پالیسی کو اعلانیہ تقریروں اور اخباروں کے ذریعہ سراہا۔ ہندو جائز طور پر مطمئن تھے۔ البتہ پنڈت پریم ناتھ بزاز ایڈیٹر روزنامہ ''ہمدرد'' سرینگر نے ہمارے جلسے اور نواب صاحب کے ساتھ سلوک کے بارے میں حکومت کیخلاف مسلسل تین افتتاحیہ مضامین میں شدید اور کڑی نکتہ چینی کی اور مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے ساتھ حکومت کے جانبدارانہ سلوک کا مقابلہ کر کے بتلایا کہ حکومت محض نیشنلسٹ غنڈوں کو خوش کرنے کیلئے شہری آزادی اور آزادی تقریر کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ ان افتتاحیوں کی بنا پر ہمدرد سے بہت بھاری ضمانت طلب کی گئی۔ غیر مسلموں میں ''ہمدرد'' کے سوا اور کوئی اخبار ہمارے آڑے نہ آیا۔ حکومت اور مسلم کانفرنس کے درمیان عداوت اور اختلاف کی خلیج وسیع ہو گئی۔ اور اب حکومت نہایت ہی اوچھے اور کمینہ حربوں پر اتر آئی۔ قدم قدم پر ہمارے لئے مشکلات کا سامنا تھا۔ روزانہ درجنوں کارکنوں کے خلاف زبان بندی کے احکام جاری ہو رہے تھے۔ کہیں نیشنلسٹوں کو خوش کرنے کیلئے چوراہوں میں مسلمانوں کی بے آبروئی کی جا رہی تھی اور کہیں گرفتاریوں کا پریشان کن سلسلہ جاری تھا۔

اکثر بیچارے مسلمان ملازموں کو محض میرے ساتھ چلنے پھرنے کی پاداش میں معطل کیا جاتا تھا اور محض نیشنل کانفرنس کی مخالفت کی وجہ سے متعدد افسروں کی برطرفیاں عمل میں لائی جارہی تھیں۔ خدا کے فضل سے ہمارے پائے استقلال میں معمولی سی لغزش بھی پیدا نہ ہوئی بلکہ ان مشکلوں سے ہمارے عزائم اور بھی زیادہ مستحکم ہوتے چلے گئے۔ نیشنل کانفرنس کے غنڈوں کو ہمارے خلاف سرینگر میں اِذنِ عام دے کر حکومت نے بھی چین نہ پایا۔ نیشنل کانفرنس والوں کے حوصلے اب اتنے بڑھ گئے کہ انہوں نے معاملات حکومت میں مداخلت اور اعلانیہ لاقانونی کا سلسلہ شروع کردیا۔ حکومت اب پشیمان تھی لیکن مجبور تھی۔ ساتھ ہی ہماری ثابت قدمی نے حکومت کے دانت کھٹے کردئے تھے اور نیشنل کانفرنس کو فروغ دینے اور مسلم کانفرنس کو دبانے کی تمام تدبیریں بے سود ثابت ہوئیں۔ بلکہ مسلم کانفرنس کا حلقہ اثر بڑھتا گیا۔ اور جب بیج بہاڑہ، شوپیان، اور اننت ناگ بھی جو خالص نیشنل کانفرنسی علاقے تھے مسلم کانفرنس کے حامی ہوگئے تو حکومت اور شیخ عبداللہ دونوں سراسیمہ ہونے لگے۔ ادھر صوبہ جموں بالخصوص شہر جموں میں فرقہ وارانہ فساد کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا تاکہ یہاں کے مسلمان تنگ آکر کم از کم پاکستان کا نعرہ ترک کردیں۔ لیکن مسلمانان جموں اپنی قلت تعداد اور حکومت اور پولیس کی جانب داری کے باوجود فرقہ وارانہ فسادات میں ہندوؤں سے دو دو ہاتھ کرتے رہے۔ آئنگر کو اپنی شہرت کے تحفظ کا بہت احساس تھا۔ ہم نے اس کے خلاف ہندوستان اور اندرون ریاست میں شدید پروپیگنڈا شروع کردیا تھا۔ وہ متعصب اور فرقہ پرست ہونے کے باوجود فرقہ پرست کہلوانا نہیں چاہتا تھا۔ ہم نے اسکی اس دکھتی رگ کو پکڑ لیا تھا۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئنگر نے

اور اس کے بعد مہاراجہ کے دوسرے ایجنٹوں نے مسلم کانفرنس کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہا اور شرط پیش کی گئی کہ ہم ریاست میں پاکستان کا نعرہ ترک کر دیں۔ اس معاوضہ میں حکومت ہماری ہر بات ماننے کو تیار تھی۔ ہمیں یہ پیش کش کئی بار ہوئی لیکن ہماری طرف سے ہمیشہ یہی جواب دیا گیا کہ ہم سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں لیکن پاکستان کے نعرہ حق کو کبھی کسی قیمت پر بھی نہ چھوڑیں گے۔ یہ نعرہ ہمارا جزو ایمان بن چکا ہے۔ بس پھر کیا تھا ہمارے خلاف حکومت اور مہاراجہ کے غیض و غضب کی انتہا ہوگئی اور اب حکومت نے ہر وسیلہ اور حربہ سے مسلم کانفرنس کو کچلنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن ابھی اس نے اپنے آخری پروگرام کو شروع نہ کیا تھا کہ سر مہاراج سنگھ کا تقرر بحیثیت وزیر اعظم کشمیر عمل میں آیا۔

سر مہاراج سنگھ نہایت وسیع القلب اور ہمدرد آدمی تھا اور مساوات کا حامی۔ اس نے چند دنوں میں حق پرست اور منصف مزاج انسان کی حیثیت سے مسلم کانفرنس کے ساتھ عدل و انصاف کا تہیہ کر لیا۔ لیکن ریاست میں حالات دگرگوں تھے۔ کشمیر میں عدل و انصاف اور وہ بھی پاکستان نواز مسلمانوں سے ایک ان ہونی بات تھی۔ سر مہاراج سنگھ نے بالکل مختلف فضا اور آزاد ماحول میں اپنی تمام زندگی بسر کی تھی اسے کیا خبر تھی کہ کشمیر میں مسلمانوں کی بات بات پر زبان کاٹی جاتی ہے اور خواہ کوئی وزیر اعظم کی حیثیت کا انسان ہی کیوں نہ ہو مسلمانوں کے ساتھ صرف وعدہ انصاف بھی اس کا ایک ناقابل عفو جرم ہے۔ چنانچہ اس کی آمد کے چند ہفتوں بعد ریاست کے تمام رجعت پسند طبقے جن میں کشمیری پنڈت، ڈوگرے، نیشنل کانفرنسی اور حکومت کے تمام غیر مسلم افسر شامل تھے ایک ایک کر کے اسکے اعلانیہ مخالف ہو گئے اور ان سب کا سرغنہ خود مہاراجہ ہری سنگھ تھا۔ بے انصافی اور ظلم کا قلع قمع کرنے والا سر مہاراج سنگھ خود اس قدر مظلوم انسان بن گیا کہ اس کی حالت

قابلِ رحم ہوگئی۔ بالآخر رجعت پسند اور پست ذہنیت کے مقابلہ کی تاب نہ لاتے ہوئے اسے چھ ماہ کے اندر مجبوراً ریاست کی پرائم منسٹری کو خیر باد کہنا پڑا۔ ریاست چھوڑنے کے ساتھ ہی اس نے ریاست اور مہاراجہ کیخلاف ایک بیان بھی دیا لیکن لاتوں کے بھوت باتوں سے کب مانتے ہیں۔

سری این راؤ پرائم منسٹر:۔

سر مہاراج سنگھ کے بعد ایک مدراسی ہندو سر بی این راؤ پرائم منسٹر مقرر ہوا۔ بی این راؤ سر مہاراج سنگھ کی طرح شریف اور خلیق انسان اور ایک بے تعصب مزاج حاکم تھا۔ اس کی بھی یہی خواہش تھی کہ مسلمانوں کے ساتھ انصاف ہو۔ سر مہاراج سنگھ کے توہین آمیز اخراج کی وجہ اسے معلوم تھی۔ لیکن منصف مزاج اور حق پرستی کی وجہ سے سر راؤ بھی مصلحت اور احتیاط کو مدنظر نہ رکھ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کی بالائی فضا اس کی بھی مخالف ہوگئی۔ وہ سر مہاراج سنگھ کی طرح عجلت پسند اور جذباتی شخص نہ تھا۔ اور ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے ریٹائر ہوا تھا۔ اس لئے اس نے حالات کے مقابلہ میں جلد بازی سے کام نہ لیا۔ اس کے زمانہ وزارت میں مسلم کانفرنس کو سیاسی صورتحالات میں اصلاح اور بہتری کی توقع ہوگئی۔ اسی زمانہ میں شیخ عبداللہ نے مولانا ابوالکلام آزاد کا جلوس نکالا تھا۔ بات یوں ہوئی کہ مولانا ابوالکلام، سرحدی گاندھی اور پنڈت جواہرلال نہرو سرینگر میں شیخ عبداللہ کی دعوت پر آئے۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ دو سیاسی جماعتوں کی باہمی کشمکش اور چپقلش انتہائی صورت اختیار کر چکی تھی اور شیخ عبداللہ کا سیاسی، جماعتی اور ذاتی وقار خاک میں مل رہا تھا۔ مسلم کانفرنس شدید مصائب کے باوجود روز بروز شاہراہ مقبولیت و عروج پر گامزن تھی۔ شیخ عبداللہ کو اپنا مستقبل سامنے نظر آرہا تھا اور حکومت کشمیر کی سرپرستی اور کانگریس کا

سرمایہ اور پروپیگنڈا نیشنل کانفرنس کے تنِ مردہ میں جان پیدا کرنے سے قاصر رہا تھا۔ شیخ عبداللہ کا اب آخری حربہ یہ تھا کہ دو چوٹی کے کانگریسی مسلمانوں کے ذریعہ سے وادی کشمیر میں اپنی سیاسی بقاء کی آخری کوشش کرے۔ ان ایام میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان سردھڑ کی بازی لگی ہوئی تھی اور کانگریس مسلمانوں کیخلاف انتہائی ذلیل ہتھکنڈوں کا استعمال کر رہی تھی۔ نیشنل کانفرنس والے ہمیشہ ہنگامی طریقوں اور عارضی وسیلوں سے فضائے سیاست میں گھبراہٹ پیدا کر کے اپنے جماعتی مقاصد کے حصول کے قائل تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ انکی سیاسی حالت اب اتنی پتلی ہو چکی تھی کہ ان بیچاروں کے پاس ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے اور تنکوں کا سہارا لینے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ الغرض شیخ عبداللہ نے ان کانگریسی لیڈروں کی آمد پر دریائی جلوس نکالنے کا اعلان واہتمام کر دیا۔ مسلم کانفرنس یہ کس طرح گوارا کر سکتی کہ ہندوستان کے کسی اسلامی گوشہ میں تو کانگریسی لیڈر اپنے جھروکوں سے باہر سر بھی نہ نکال سکیں لیکن سرینگر میں ان کا دریائی جلوس نکلے۔

دریائی جلوس:۔

پنڈت جواہر لال نہرو کو تمام اختلافات کے باوجود ہم اپنا مہمان سمجھتے تھے اور پھر وہ زیادہ سے زیادہ ہندو کانگریس کا ایک بہت بڑا ہندو لیڈر تھا۔ لیکن خان عبدالغفار خان اور مولانا آزاد جن کیخلاف دس کروڑ اسلامیان ہند کا متفقہ فتویٰ تھا ہمارے لئے قابل عقیدت نہ تھے۔ اسلئے سرینگر کی مسلم کانفرنس نے شیخ عبداللہ کو پیغام بھیجا کہ اگر نیشنل کانفرنس والے پنڈت جواہر لال کا جلوس نکالیں تو ان کو کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن مولانا آزاد کو مسلمانان سرینگر کبھی برداشت نہ کریں گے۔ اسلئے بہتر ہوگا کہ وہ اپنی اور اپنے مہمانوں کی عزت

کے پیش نظر اپنے اس ارادہ سے باز آئے۔ لیکن شیخ عبداللہ کو نہرو وغیرہ کی موجودگی کا گھمنڈ تھا۔ اس لئے اس نے ہماری پیشکش کو رد کر دیا۔ مسلم کانفرنس نے حکومت کو بھی مطلع کر دیا کہ وہ شہر اور ریاست کے امن کے پیش نظر اس جلوس کو قانوناً بند کر دے ورنہ نتائج کی ذمہ دار خود حکومت ہوگی۔ حکومت ایسا کرنے کی کب جرات کر سکتی تھی۔ اس نے اپنے مقدور بھر ذرائع کے مطابق پولیس وغیرہ کے وسیع انتظامات کر دئے تھے۔ ویسے بھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور پولیس اور عدالتی محکمہ کے تمام ہندو افسر کٹر کانگرسی تھے۔ اسلئے شیخ عبداللہ کو جلوس کی کامیابی اور سلامتی کا پورا پورا یقین تھا۔

دریائی جلوس کا راستہ تقریباً دو میل لمبا ہوگا۔ لیکن نہرو وغفار اور آزاد کی اس جلوس میں جو آؤ بھگت ہوئی اور مسلمانوں نے کانگرسی لیڈروں کیخلاف جو مظاہرے کئے ان کی مثال ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ اسلام زندہ باد، قائداعظم زندہ باد اور پاکستانی زندہ باد کے فلک شگاف نعروں نے ایک خاص کیفیت پیدا کر دی تھی۔ سفر کے پونے دو میل کے حصے تک مظاہرہ کرنے والوں کا زور اور جوش اتنا تھا کہ حکومت کی تمام قوت ان پر لاٹھی چارج کرتے کرتے تھک گئی۔ موقع پر مسلمانوں کی درجنوں گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں اور دوسری طرف نیشنل کانفرنس کے رضاکاروں نے ہندو پولیس اور مجسٹریٹ کی شہ پر بھی ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ لیکن بایں ہمہ شیخ عبداللہ اور اسکے مہمانوں کیلئے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ تھا۔ نہ وہ کشتی سے باہر نکل سکتے تھے کیونکہ دریا کے دونوں کنارے مظاہرین سے بھرے ہوئے تھے اور نہ وہ سفر جاری رکھنے کے قابل تھے۔

اس روز دو صد کے قریب مسلم کانفرنس کے کارکن اور رضاکار گرفتار

کر لئے گئے۔ علاوہ بریں ایک نیشنل کانفرنسی اس تصادم میں مارا گیا۔ اس کے قتل میں تقریباً دس مسلمانوں کو دھر لیا گیا۔ جس میں سیکرٹری سرینگر مسلم کانفرنس بھی بحیثیت ملزم شامل تھا۔ اس واقعہ سے سرینگر کے گلی کوچوں میں شیخ عبداللہ کی خاک اڑ گئی۔ نیشنل کانفرنس کی نخوت اور پندار کے بت ایک ایک کر کے اوندھے ہو گئے۔ حکومت نے یہ جان لیا کہ مسلم کانفرنس کی تنظیم کا یہ سیلاب اب روکے سے نہیں رک سکتا۔ کیونکہ تمام طاقتور مخالف عناصر کے مقابلہ پر مسلم کانفرنس والوں نے آج اپنی جماعتی طاقت کا ثبوت دیدیا تھا۔

اکیسواں باب

قائد اعظم کا ورود سرینگر

میں ایک عرصہ سے حضرت قائد اعظم کی خدمت میں سرینگر تشریف لانے کی اِستدعا کررہا تھا۔ لیکن سیاسیات ہند کے اُلجھاؤ کی وجہ سے وہ مجبور تھے۔ صرف ایک ناخدا اور دس کروڑ مسلمانوں کی شکستہ کشتی کو بلاخیز طوفان سے نکال کر ساحلِ مراد تک لانے کا کام دشوار۔ واقعی حضرت قائد اعظم کو اتنی فرصت کہاں میسر تھی کہ وہ ہم نیم بسمل سوختہ جان اور عصر حاضر کی تہذیب وتمدن سے دور پہاڑوں میں بسنے والے مسلمانوں کی طرف توجہ مبذول کرسکتے لیکن پھر بھی چونکہ آپ سب مسلمانوں کے قائد تھے۔ اس لئے آخر انہوں نے کشمیر کے غریب مسلمانوں کے جذبہ محبت وعقیدت کی وجہ سے ہماری دعوت منظور کرلی۔ ماہ مئی ۱۹۴۴ء میں وہ قائد مسلمانان ہند اور صدر آل انڈیا مسلم لیگ کی حیثیت سے کشمیر میں وارد ہوئے۔ سوچیت گڑھ کی سرحد پر ان کا ابتدائی استقبال کیا گیا۔ سوچیت گڑھ سے جموں ۱۸ ر میل کے فاصلہ تک سڑک کے دونوں کناروں پر عقیدت مندوں کی مسلسل قطاریں فرش راہ بنی ہوئی تھیں۔ شہر جموں میں مسلمان بوڑھے اور جوان عورتیں اور لڑکیاں غریب اور امیر دیہاتی اور شہری سب قائد اعظم اور اپنے محبوب راہنما کیلئے چشم براہ تھے۔ جلوس کے راستوں کو اس آب وتاب، سج دھج اور اہتمام سے آراستہ کیا گیا تھا کہ خود ہندوؤں کا بیان تھا کہ مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کے باپ داداؤں کی رسم تاجپوشی پر بھی نہ

کبھی یہ آرائش وزیبائش مشاہدہ میں آئی تھی اور نہ کبھی انسانوں کا اتنا جم غفیر شہر میں دیکھا گیا تھا۔ رات کے وقت جلسہ میں صوبائی مسلم کانفرنس جموں کی طرف سے ان کی خدمت میں سپاسنامہ عقیدت پیش کیا گیا ور دوسری روز صبح حضرت قائداعظم عازم سرینگر ہوئے۔

قائداعظم کی سرینگر میں آمد آمد کی خبر پا کر شیخ عبداللہ نے بھی بہ حیثیت صدر نیشنل کانفرنس ان کی خدمت میں استقبال کیلئے خط لکھ رکھا تھا۔ قائداعظم سرینگر تشریف لانے سے چند دن پیشتر سیالکوٹ میں پنجاب پراونشل لیگ کے سالانہ اجلاس میں آئے ہوئے تھے اسی تاریخی اجلاس میں ملک خضر حیات خان کو مسلم لیگ سے خارج کیا گیا تھا۔

سیالکوٹ میں ملاقات کے دوران انہوں نے شیخ عبداللہ کا خط مجھے پڑھوایا اور فرمایا میں نے شیخ عبداللہ کی دعوت مشروط طور سے منظور کی ہے۔ تمہاری کیا مرضی ہے۔ میں نے کہا مجھے کوئی اعتراض نہیں بلکہ ہماری سب کی انتہائی خوش قسمتی ہوگی اگر شیخ عبداللہ وغیرہ آپ کی وجہ سے راہ راست پر آجائیں اور کشمیر کا قضیہ طے ہوجائے۔ چنانچہ حضرت قائداعظم نے شیخ عبداللہ کو دوبارہ خط لکھ کر اپنے پہلے فیصلے کی توثیق کردی۔

حضرت قائداعظم شیخ عبداللہ کو اچھی طرح جانتے تھے۔ بایں ہمہ انہوں نے اصلاح حال کا پھر موقع دیا۔ شیخ عبداللہ اور اسکے حواریوں اور معذرت خواہوں کا یہ کہنا کہ حضرت قائداعظم نے شیخ عبداللہ کو کبھی بنظر التفات نہیں دیکھا سراسر لغو ہے۔ سرینگر پہنچ کر بھی حضرت قائداعظم نے جو جدوجہد شیخ عبداللہ کو راہ پر لانے اور نیک وبد سمجھانے کیلئے کی وہ سب سے زیادہ شیخ عبداللہ کے معذرت خواہوں کے علم میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ عبداللہ

دل سے حضرت قائداعظم کا استقبال ہر گز نہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ حالات سے مجبور تھا کیونکہ اس کو اور اس کے مشیروں کو یقین تھا کہ اگر حضرت قائداعظم کا استقبال نہ کیا بلکہ مسلم کانفرنس کے استقبال سے اعلانیہ عدم تعاون بھی کیا تو اس صورت میں بھی ایک تو عوام کے جذبہ ولولہ میں سر مو فرق نہ آئے گا دوسرا الگ رہنے اور عدمِ تعاون سے اس کی اور اس کی جماعت کی اصل پوزیشن بالکل بے نقاب ہو جائے گی۔ اسلئے اس کا یہ اقدام محض ریاکاری اور دفع الوقتی اور مصلحت کوشی پر مبنی تھا۔ مجھے اس بات کا پہلے ہی احساس تھا لیکن میری خواہش تھی کہ شیخ عبداللہ پھر راہ حق قبول کرلے تاکہ روزمرہ کی باہمی رسہ کشی ختم ہو جائے۔ بصورت دیگر کشمیر کے سیاسی مستقبل کے متعلق کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے۔

جموں سے چل کر حضرت قائداعظم بانہال میں فروکش ہوئے اور دوسرے روز ۵ بجے شام سرینگر پہنچے۔ میں انکے ہمراہ تھا۔ راستہ میں جا بجا ہزاروں کی تعداد میں مسلمان چالیس چالیس اور پچاس پچاس کوس کا پہاڑی سفر طے کر کے حضرت قائداعظم کی زیارت کیلئے پہنچے ہوئے تھے اور چپہ چپہ پر ان کا پر خلوص خیر مقدم ہو رہا تھا۔ حضرت قائداعظم کا پروگرام ایک ہی دن میں جموں سے سرینگر پہنچنے کا تھا لیکن تمام راستہ مشتاقان دید سے بھرا ہوا تھا۔ اس لئے پروگرام میں ترمیم ناگزیر ہو گئی۔ بانہال پاس سے کشمیر کی طرف قاضی گنڈ سے لیکر سرینگر تک جس طرف نظر اٹھتی تھی، سڑک پر لوگ قطار اندر قطار استقبال کیلئے کھڑے نظر آتے تھے۔ سرینگر میں نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس نے استقبال کا الگ الگ انتظام کر رکھا تھا۔ پہلے حضرت قائداعظم میونسپل پارک میں تشریف فرما ہوئے، جہاں نیشنل کانفرنس کی طرف سے شیخ عبداللہ نے ایڈریس پیش کیا۔ ایڈریس کم وبیش رسمی تھا۔ اس سے شیخ عبداللہ کا عندیہ

ظاہر ہو رہا تھا۔ حضرت قائداعظم نے جواباً ایک ہی فقرہ میں شیخ عبداللہ کی منافقانہ تقریر پر پانی پھیر دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ نیشنل کانفرنس نے میرا بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم لیگ جو شاہانہ استقبال کیا ہے۔ اس کیلئے سرینگر کے مسلمانوں اور خاص طور ہندوؤں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ یاد رہے کہ اس اجتماع میں مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں کے مقابلے میں پانچ فیصد ہوگی۔ اس تقریب میں فارغ ہوکر حضرت قائداعظم مسلم کانفرنس کے جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔

شہر میں داخل ہونے کے بعد مسلمانوں کا اصلی جوشِ عقیدت نیشنل کانفرنس کی کاروائی پر اب شروع ہوا۔ مسلم کانفرنس کے رضا کاروں نے عوام کو روکے رکھنے کا کافی انتظام کر رکھا تھا۔ لیکن مجمع چالیس پچاس ہزار سے اوپر تھا اور بالکل قابو سے باہر جلوس کی شکل میں کار کے ہمراہ جا رہا تھا۔ چنانچہ جلسہ گاہ کے قریب موٹر کار پر اتنا ہجوم ہو گیا کہ میں خود گھبرا گیا۔ لوگوں کو سمجھایا بھی گیا۔ لیکن ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ حضرت قائداعظم سے مصافحہ نہیں تو سلام ہی ہو جائے۔ اس موقعہ پر قائداعظم غُصہ سے لال پیلے ہوگئے۔ آپ کو غُصے کی حالت میں دیکھنے کا میرا یہ پہلا اور آخری موقع تھا۔ مجھے فرمایا کہ تمہارا ڈسپلن خراب ہے۔ حضرت قائداعظم کی نظر خشمگیں کا تصور ہی میری کمر ہمت توڑ ڈالنے کیلئے کافی تھا۔ اور میں ہمیشہ ان کے ساتھ ملاقات سے پہلے اور درمیان میں اس بات کے نشہ سے سہار رہا تھا اور اب تو وہ سچ مچ ناراض ہی ہوگئے تھے۔ نزلہ بر عضو ضعیف! میں نے قائداعظم کے اردلی کا ہنٹر لے کر اور کار پر کھڑے ہوکر لوگوں کو بے دریغ مارنا شروع کر دیا۔ دو چار منٹ کے بعد کار کے نزدیک ہجوم بہت کم ہو گیا لیکن میں نے ہنٹر چلانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس وقت

حضرت قائداعظمؒ نے مسکرا کر انگریزی میں فرمایا۔ یہ سلسلہ بند کرو اب معاملہ ٹھیک ہے۔ میں نے عرض کیا ڈسپلن تو درست تھا لیکن عوام کو آپ کی ذات گرامی سے والہانہ عقیدت ہے اسلئے انکے دلی جذبات کو کون روک سکتا ہے۔

مسلم کانفرنس کی جانب سے جلسہ گاہ میں حضرت قائداعظم کا استقبال شاہانہ انداز میں کیا گیا۔ تقریباً پچاس ساٹھ ہزار مسلمانوں نے اس جلسہ میں شمولیت کی۔

مسلم کانفرنس کے اِجلاس کی تیاریاں:۔

اس سال مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس پہلے راولاکوٹ (پونچھ) میں منعقد ہونا قرار پایا۔ اور ہم نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر حکومت اجلاس پر یا پونچھ میں میرے داخلہ پر پالیسی کے تحت کسی قسم کی پابندی عائد کرے گی تو اسے توڑا جائے۔ حضرت قائداعظم کی ریاست میں تشریف آوری سے قبل سر بی۔ این۔ راؤ مجھے مقام اجلاس کی تبدیلی کیلئے کئی بار پیغام بھیج چکا تھا۔ لیکن ہمارا اِصرار تھا اس سال جاگیر پونچھ سے باہر مسلم کانفرنس کا اجلاس نہیں ہوگا۔ سر بی۔ این۔ راؤ کے آنے پر میرے داخلہ پونچھ پر بندش کی معیاد ختم ہو چکی تھی اور حضرت قائداعظم کے ریاست میں ورود سے پہلے میں تقریباً تمام پونچھ کا دورہ کر چکا تھا۔

بی۔ این۔ راؤ نے اپنے عہدِ وزارت میں مجبوریوں کے باوجود پریس، پلیٹ فارم اور شہری آزادی کا پورا احترام کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس لئے اس دفعہ میرے داخلہ پونچھ پر کوئی پابندی عائد نہ کی گئی تھی۔ یہ دورہ سیاسی نوعیت سے نہایت اہم اور نتائج خیز تھا۔ پونچھ کے زندہ دل مسلمانوں نے مسلم کانفرنس اور میرے ساتھ ہر مقام پر والہانہ عقیدت کا ثبوت پیش کیا۔ چار لاکھ اسلامیان پونچھ نے انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے اعلانیہ مسلم کانفرنس کے ساتھ اپنی وابستگی کا مظاہرہ کیا۔ مہاراجہ اور حکومت کشمیر کے خلاف مسلم کانفرنس کے ہر حکم

کی تعمیل کا اور حصولِ پاکستان کیلئے مر مٹنے کا عہد کیا۔

سر بی۔ این۔ راؤ کے پیغامات کے باوجود ہمارا مصمم ارادہ تھا کہ اس سال سالانہ اجلاس پونچھ (راولاکوٹ) میں ہی منعقد ہوگا۔ لیکن حضرت قائداعظم کی تشریف آوری کی وجہ سے نئی سیاسی صورتحال پیدا ہوگئی اور ہم نے اپنی جگہ فیصلہ کرلیا کہ کانفرنس کا سالانہ اجلاس اس دفعہ حضرت قائداعظم کی موجودگی میں سرینگر میں ہونا ضروری ہے۔ اس میں متعدد سیاسی اور جماعتی مصلحتیں اور فائدے پنہاں تھے۔

حضرت قائداعظم نے میری استدعا پر اجلاس میں شمولیت کی درخواست منظور کرلی اور اجلاس کی تاریخیں ان کے ارشاد کے مطابق مقرر کی گئیں۔ اس دفعہ بی۔ این۔ راؤ کا پھر تاکیدی پیغام آیا۔ وہ چاہتا تو بذریعہ حکم ہمارا جلسہ پونچھ بھی بند کرسکتا تھا لیکن وہ خود مجبور تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔ چنانچہ میں نے راؤ کو پیغام بھیجا کہ آپ کی مجبوری کی وجہ سے ہم نے پونچھ کے بجائے سرینگر میں اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

جون ۱۹۴۴ء میں مسلم کانفرنس کا اجلاس سرینگر میں :-

یہ اجلاس بھی میری مرضی کے خلاف میری ہی صدارت میں ہوا۔ بی۔ این۔ راؤ کی وجہ سے جلسے پر کوئی پابندی عائد نہ ہوئی لیکن صدارتی اجلاس کی اجازت نہ دی گئی۔ شائد پرائم منسٹر کو جلوس میں نیشنل کانفرنس کیساتھ تصادم کا احتمال تھا۔ حالانکہ اس سے چند ماہ قبل مسلم کانفرنس کی جانب سے عید میلاد پر ایک بہت بڑا جلوس نکل چکا تھا۔ کسی شخص کو اس میں مداخلت کی جرات نہ ہوئی بلکہ جلوس کے انتظام اور تعداد دیکھ کر تمام نیشنل کانفرنسی گھروں میں گھس گئے تھے

اجلاس میں حضرت قائداعظم کی شمولیت کا اعلان پہلے ہی ہوچکا تھا اس

لئے مندوبین میں سے غالباً کوئی بھی غیر حاضر نہ رہا بلکہ مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں پہلی مرتبہ کشمیر کے سرحدی علاقہ سے کافی نمائندے شامل ہوئے۔ جلسہ گاہ کو اپنے محبوب ترین قائد کی شمولیت کی وجہ سے خاص اہتمام سے سجایا گیا تھا۔

حضرت قائداعظم جب جلسہ گاہ میں رونق افروز ہوئے تو لوگوں کا جوشِ عقیدت، شوقِ نیاز، طرزِ خیر مقدم، اپنے قائد کے لئے جذبات جان نثاری اور وفاداری کے اظہار کا انداز دیدنی تھا۔ تمام فضائے آسمانی قائداعظم کے نعروں سے معمور و متلاطم تھی۔ سرزمین کشمیر میں اس سے پہلے اسلامی ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کا روح پرور نظارا یقیناً کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔

پہلی رات کی کاروائی پروگرام کیمطابق میری صدارتی تقریر اور سبجیکٹس کمیٹی کے انتخاب تک محدود رہی۔ جلسہ کے اختتام پر جب حضرت قائدِ اعظم موٹر پر سوار ہو گئے تو فرمایا کہ تمہاری صدارتی تقریروں پر میں تم کو مُبارک باد دیتا ہوں۔ یہ تقریر بہت اچھی تھی۔ (I congratulate you on your presidential speech. It was excellent) یہ کہہ کر وہ روانہ ہو گئے

دوسری شب جلسے کی رسمی کاروائی سے قبل آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی وساطت سے اسلامیانِ ریاست کی جانب سے قائداعظم کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ یاد رہے ۱۹۳۶ء میں بھی جب ابھی میں اور شیخ عبداللہ اکٹھے تھے، میں نے ہی ان کی خدمت میں پہلی مرتبہ سپاسنامہ پیش کیا تھا۔ گویا قدرت کو یہ قطعاً منظور نہ تھا کہ حضرت قائداعظم کو کسی حالت میں شیخ عبداللہ کا شکر گذار ہونا پڑتا۔ خواہ رسمی طور پر سہی۔ سپاسنامہ کے جواب میں حضرت قائداعظم نے شیخ عبداللہ سے متعلق ایک فقرہ کہہ کر اسے اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے ختم کر دیا۔ فرمایا کہ "شیخ عبداللہ نے حال ہی میں ملاقات

کے دوران مجھے بتایا تھا کہ نیشنل کانفرنس کا نیشنلزم محض ہندوؤں کو دھوکا دینے کیلئے ہے ورنہ وہ اور اس کی پارٹی قومیت پرستی کی حامی نہیں"۔ میں نے شیخ عبداللہ کو اسی وقت جواب دیا تھا کہ اقلیتوں کو صریحاً دھوکہ دینے والی بات ہے جو کسی طرح جائز نہیں۔

شیخ عبداللہ کے قومی کریکٹر کا اندازہ اسی ایک بات سے ہو سکتا ہے۔ شیخ عبداللہ یا تو اس وقت قوم پرست تھا یا کٹر فرقہ پرست۔ اگر قوم پرست تھا تو اس نے حضرت قائداعظم کو خوش کرنے یا غالباً دھوکہ دینے کیلئے غلط بیانی کی اور اگر وہ فرقہ پرست تھا تو اس نے اپنے آقاؤں اور اقلیتوں کے ساتھ صریحاً فریب کاری کی۔ لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ مسلم کانفرنس اور اسلامی سواد اعظم سے کٹ جانے کے بعد وہ کبھی قوم پرست تھا نہ فرقہ پرست بلکہ وہ قطعی طور پر جاہ پرست اور مطلب پرست ہو چکا تھا۔

حضرت قائداعظم نے یہ بھی فرمایا "میں چودھری صاحب اور مسلمانانِ ریاست کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلم لیگ اور ہندوستان کے مسلمانوں کی خدمات ان کے قدموں میں ہیں۔" اگر خط کشیدہ فقرہ کا صحیح مفہوم حضرت قائداعظم سمجھتے تھے (یاد رہے کہ حضرت قائداعظم نے تقریر اردو زبان میں کی تھی) اور میں سمجھتا ہوں وہ یقیناً اسکا مفہوم اچھی طرح سمجھتے تھے۔ تو پھر یہ بات کسی تشریح کی محتاج نہیں کہ حضرت قائداعظم کے دل میں کشمیر اور اسلامیانِ جموں وکشمیر کیلئے کتنی تڑپ موجود تھی۔ حضرت قائداعظم جذباتی تو تھے نہیں کہ وہ جذبات کی رو میں ایسا اہم فقرہ کہہ ڈالتے۔ لیکن ان کو کیا کہئے جن کا ایمان سلامت نہیں اور جو بایں ہمہ پٹیل اور بلدیو سنگھ کو مسلمانانِ ریاست کا یار و مددگار سمجھے بیٹھے ہیں۔

حضرت قائداعظم نے اپنی تقریر ختم کر ڈالی۔ لیکن مسلمانوں کے قلب و

جگر اپنے اس محسن حقیقی کے اس ایک فقرہ سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ راسخ مذہبی اعتقادات کی وجہ سے کشمیری بے حد رقیق القلب ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جلسہ گاہ میں کئی اطراف سے چیخوں کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ سینکڑوں لوگ کھڑے ہو گئے اور آسمان کی طرف جھولیاں اُٹھا اُٹھا کر کشمیری زبان میں حضرت قائداعظم اور پاکستان کے حق میں مصروف مناجات ہو گئے۔ میں بے خود بھی تھا اور شرمندہ بھی۔ اسی حالت میں میں اٹھا اور اسی فقرہ کو سامنے رکھ کر پھر سے تقریر شروع کر دی اور حضرت قائداعظم کی نصب گھنٹے تک بلائیں لیتا رہا۔

جلسہ کے اختتام پر حضرت قائداعظم نے مجھ سے دریافت فرمایا "جلسے کی حاضری کتنی ہے"۔ میں نے جواب دیا آپ کا کیا اندازہ ہے۔ فرمایا کہ ستّر اسّی ہزار کے درمیان لوگ ہوں گے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس اجتماع میں صرف مسلمان شامل تھے۔ سرینگر شہر کی آبادی اڑھائی لاکھ ہے۔ جس میں چالیس ہزار کے قریب غیر مسلم ہیں۔ جلسہ میں شامل ہونے والے سیاحوں کی تعداد کو اگر الگ بھی کر دیا جائے تو عام اوسط سے غالباً شہر کا کوئی بالغ مسلمان اس جلسہ میں شامل ہوئے بغیر نہ رہا ہوگا۔ عورتوں کی تعداد اس کے علاوہ تھی جو پس پردہ تھیں۔

بائیسواں باب

قائداعظم اور شیخ عبداللہ

حضرت قائداعظم نے سرینگر میں پہنچنے کے بعد ہی شیخ عبداللہ کو سمجھانے بجھانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ گفتگو کوئی دو ہفتے جاری رہی ہوگی۔ اس عرصہ میں حضرت قائداعظم نے تمام چیدہ نیشنل کانفرنسی کارکنوں کو ملاقات کا موقع دیا۔ ان کے حالات سنے اور سیاسیات ہند اور ہندو کانگریس کے متحدہ قومیت کے ڈھونگ کی حقیقت ان پر واضح کی۔ لیکن ان میں سے صرف چند تھے جو حضرت قائداعظم کے سرچشمہ فیض وہدایت سے بہرہ اندوز ہوسکے اور باقی جن کی آنکھوں، کانوں اور دلوں پر گمراہی اور ذلالت کی مہر لگ چکی تھی ان کا دامن اصلاح وفلاح سے تہی رہا۔

مجھے شیخ عبداللہ کی نیت اور عندیہ کا علم ہو چکا تھا۔ وہ خود اپنے حال پر رہتا تو شائد صورت مختلف ہوتی لیکن یہ اسکی بدقسمتی تھی وہ کبھی ایک حال پر قائم نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس وقت بھی نیشنل کانفرنس کے بائیں بازو نے اسے بہت حد تک گمراہ کیا۔ ساتھ ہی کانگریس کے خاص ایلچی بھی موقع پر آدھمکے۔ شیخ عبداللہ اس معاملہ میں خود حیلہ جوئی کر رہا تھا۔ اس کی حضرت قائداعظم سے آخری اور قطعی ملاقات سے قبل نیشنل کانفرنس کی خاص مجلس مشاورت حضرت قائداعظم کے سیاسی عقائد کو اپنانے کیخلاف فیصلہ کر چکی تھی۔ اس سلسلہ میں میری حضرت قائداعظم سے کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ جن میں مسلم کانفرنس کا

زاویۂ نگاہ ان کی خدمت میں پیش کرتا رہا اور حضرت قائداعظم مجھے شیخ عبداللہ کے ساتھ گفتگو کے بارے میں باخبر رکھتے رہے۔ ایک دن میں انکی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے فرمایا کہ میں نے پرسوں تمہاری اور شیخ عبداللہ کی ملاقات اپنی کوٹھی پر مقرر کی ہے اور باہمی سیاسی اختلافات کے معاملہ میں اس دن آخری کوشش کروں گا کیونکہ اس مسئلہ میں پہلے ہی بہت سا وقت ضائع ہو چکا ہے۔ میری اس سے قبل شیخ عبداللہ سے کوئی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ میں نے حضرت قائداعظم سے کہا کہ اگر آپ ہمارے سیاسی اختلافات مٹانے میں کامیاب نہ ہوئے بالفاظ دیگر شیخ عبداللہ کو نیشنل اِزم سے دستکش ہونے پر مائل نہ کر سکے تو پھر کیا ہوگا۔ میں نے ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ اس سے چند ہفتے قبل خضر حیات کی علیحدگی کا واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ اب اگر آپ کی مداخلت کے باوجود بھی ہماری ملاقات ناکام رہی تو مخالفین اس بات کو لے اڑیں گے۔ آخر میری تجویز پر بات ٹھہری کہ میں اور شیخ عبداللہ پہلے الگ ملاقات کریں۔ اگر اس میں حق پرستی کا کوئی شائبہ نظر آسکے تو پھر حضرت قائداعظم کی مجوزہ ملاقات عمل میں لائی جائیگی۔ حضرت قائداعظم نے شیخ عبداللہ کو اطلاع بھیجی کہ وہ اور میں خود آپس میں ملیں۔ چنانچہ دوسرے دن میری اور شیخ عبداللہ کی ملاقات ہوئی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے اصل موضوع کے متعلق سلسلہ چھیڑا لیکن شیخ عبداللہ پہلے ہی ادھار کھائے بیٹھے تھے، ان دنوں اس کا "رِنگ ماسٹر" مولوی سعید تھا۔ بدقسمتی سے وہ بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے میری باتوں کا جواب دینا شروع کر دیا۔ شیخ عبداللہ نے اس کی باتوں کو دہراتے ہوئے مجھے دوٹوک بات کہہ دی کہ دیکھئے چوہدری صاحب! آپ کے سیاسی عقیدہ کو میں اچھی طرح جانتا ہوں اور میرے عقیدہ کو آپ۔ میرے خیال میں دونوں کے

عقیدوں میں کسی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں نے کہا کہ مجھ سے آپ گفتگو کرلیں۔ اگر آپ مجھے قائل کرلیں گے تو میں اپنا عقیدہ تبدیل کرنے کیلئے تیار ہوجاؤں گا۔ اسی طرح آپ کی بھی یہی روش ہونی چاہئے۔ اس پر اس نے صاف کہہ دیا کہ ہمارے سیاسی راستے الگ ہوچکے ہیں۔ اس لئے میں بحث کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اس کے بعد پون گھنٹے کے قریب غیر سیاسی بات چیت ہوتی رہی۔ حضرت قائداعظم کو اسی روز حقیقت حال کا علم ہوگیا۔ شیخ عبداللہ کے لئے یہی ایک آخری موقع ہدایت کا تھا جو اس نے کھودیا۔ کہتے ہیں کہ انسان کو دنیا میں اپنے مستقبل کے متعلق ایک آدھ موقع ہی ملتا ہے۔ اب نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ عبداللہ دنیائے اسلام میں رسوا اور ذلیل ہے اتنا کہ اس سے پہلے کوئی بھی اس قدر ذلیل ورسوا نہ ہوا ہوگا۔

حضرت قائداعظم کی مُصروفیات:۔

حضرت قائداعظم کئی سال کی متواتر کوفت کے بعد ہمارے ہاں تشریف لائے تھے کہ ان کو چند دن کیلئے دماغی اور جسمانی آرام کا موقع مل سکے گا۔ لیکن جن ہستیوں کے ساتھ قوم کی تاریخ اور مستقبل وابستہ ہو ان کو آرام کہاں نصیب ہوسکتا ہے۔ یا وہ خود آرام کریں یا قوم مرفہ الحال ہو اور یہاں تو معاملہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے مستقبل کا تھا۔ جو صدیوں سے ذہنی، اقتصادی اور ثقافتی طور پر غلام تھے۔ جنکی نہ اپنی خودداری قائم رہی تھی اور نہ دنیا کی قوموں میں کوئی سیاسی اور قومی ساکھ تھی۔ عام حالات میں اس قوم کو اپنے پر پرزے سنبھالنے ابھرنے اور غلامی کا جوا اپنے کندھے سے اتار پھینکنے کے لئے قرنوں کی ضرورت تھی اور ہمسایہ قوم کے ساتھ عہدہ برا ہونے کیلئے برابر کی دوڑ ہی مسلمانوں کا کچھ سنوار سکتی تھی۔ لیکن صدائے جرس سے بیگانہ

مسلمان خواب خرگوش میں گم رہ کر کوسوں پیچھے رہ چکے تھے اور ادھر منزلِ مقصد پر پہنچنے کیلئے وقت بے حد کم تھا۔ ان حالات میں ایک ایسی پسماندہ قوم کا لیڈر جبھی بجا طور پر قائداعظم کہلانے کا مستحق ہو سکتا تھا کہ وہ قوم کے ابدی آرام و آسائش کے لئے خود بے آرام رہے۔ ہمارا قائداعظم اگر آرام کی زندگی بسر کرتا تو شائد آج زندہ ہوتا۔ لیکن قوم کب کی زندہ در گور ہو گئی ہوتی۔ واقعہ یہ ہے کہ گو آج ہمارا قائداعظم ہمارے پاس موجود نہیں لیکن ہماری قوم زندہ ہے۔ دنیا میں قومیں بے معجزہ ابھر نہیں سکتیں۔ قوموں کو زندہ جاوید کرنے والی ضرب کلیمی صرف ایک ہمہ صفت موصوف رہنما ہی لگا سکتا ہے۔ بیسویں صدی بلکہ اس سے بہت پہلے کی تاریخ عالم کو اٹھا کر دیکھ لو اور اس کے ایک ایک ورق کو پڑھ جاؤ تو یہ حقیقت بالکل واضح طور پر نظر آئے گی کہ قائداعظم کی سی معجز نما شخصیت دینائے سیاست میں کہیں نہیں۔ حضرت قائداعظم کی ضربِ کلیمی کا اس سے زیادہ بین ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ صرف چھ سال کے قلیل ترین عرصہ میں (اور غور کرو کہ قوموں کی تاریخ میں اس عرصہ کی کیا حیثیت ہے۔ اس عرصہ میں تو ایک طفلِ نوزائدہ بھی چلنے پھرنے اور کھانے پینے کے قابل نہیں ہو سکتا) اس مردِ حق کی نگاہ دوررس نے بے حس اور غلام قوم کو ہمدوشِ ثریا کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے اور باتوں باتوں میں ایک آزاد ملک کی طرح ڈال دی جو دنیا کے ملکوں میں پانچواں بڑا ملک اور دنیائے اسلام میں سب سے بڑا ملک ہے۔ یہی وہ ملک ہے جسے دولت خداداد پاکستان کہتے ہیں اور بیگانے تو بیگانے اپنوں میں سے بہت کم لوگوں کو اس کے قیام کا یقین تھا۔ ماضی قریب میں آزادی کی سب سے بڑی تین لڑائیں امریکہ، فرانس اور آئیر لینڈ میں لڑی گئی ہیں۔ لیکن غور کرو کہ ان لڑائیوں کی مدت اور قیمت کیا تھی اور پھر پاکستان ایسی وسیع مملکت کے حصول

تک کتنی انسانی جانیں تلف ہوئیں۔

حال ہی میں مشرق قریب اور بعید میں ہندوستان اور بالشویک روس نے بھی آزادی کیلئے کشمکش کی ہے۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہندو کانگریس کو حصول مقصد تک پہنچنے کیلئے پچاس سال صرف کرنے پڑے اور کس قدر قیمت ادا کرنا پڑی۔ اگر پاکستان کا قیام ممکن نہ ہوتا انڈیا کا قیام بھی ناممکن ہوتا۔ اور روس میں بالشوزم کے نئے سیاسی اور اقتصادی نظریئے کیلئے ۲۰، ۱۹۱۷ء میں جو ہنگامہ ہوا اور انسانی خون کی ندیاں بہ نکلیں ان کو سامنے رکھو تو پھر معلوم ہوگا کہ ہمارا قائداعظم فی الواقع دنیا میں سب سے بڑا قائد تھا۔

ایسے قائداعظم کو سرزمین کشمیر میں بھی آرام کہاں نصیب ہو سکتا تھا۔ ان کو پاکستان کے قیام کا یقین تھا۔ اسی روز جس روز ۱۹۴۰ء میں انہوں نے اس کا نعرہ بلند کیا تھا۔ بلکہ اس سے بھی پہلے مسلمانوں کو آنے والے حالات کیلئے تیار کرنا چاہتے تھے۔ بعض کور باطن خودغرض اور کوتاہ بین افراد نے حضرت قائداعظم کی موجودگی سے فائدہ نہیں اٹھایا تو یہ ان کی سیاہ بختی تھی اور دنیا میں یہ ہوتا ہی آیا ہے کہ خودغرض انسانوں کی بدولت بعض دفعہ پوری قوم کو نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

کشمیر میں اڑھائی ماہ کے عرصہ میں حضرت قائداعظم کو ہر طبقہ ملت اور ہر سیاسی جماعت کے افراد سے ملاقات کا موقع ملا۔ مسلمان تو ایک ایک کر کے ان کو ہزاروں کی تعداد میں ملے ہوں گے۔ نیشنلسٹ مسلمان بھی کئی کئی گھنٹے بحث کرتے رہے اور قائداعظم مسلم کانفرنسیوں کو ایک شفیق باپ کی طرح ان کے فرائض اور طریق کار سمجھاتے رہے۔

خداوند کریم کبھی کبھی دجل وفریب اور طغیان وباطل کی طاقتوں کی رسی

دراز کردیتا ہے۔ کہ دنیاوالوں کیلئے مقام عبرت ہواور جب ان طاقتوں کا انتہائی بداعمالیوں کی وجہ سے خاتمہ ہوتو وہ نہایت عبرت ناک اور ہولناک ہو۔ شیخ عبداللہ اوراس کی نیشنل کانفرنس کا شمار بھی انہی طاقتوں میں ہوتا ہے۔ ورنہ مسلم کانفرنس نے ''نئی کشمکش'' میں گزشتہ چار برس کے اندر اپنے طور پر اپنی بساط کے مطابق شیخ عبداللہ کے نیشنلزم اور غنڈہ ازم کو ختم کرنے کیلئے جو کچھ کیا تھا وہ تو کیا ہی تھا۔ لیکن حضرت قائداعظم کی نگاہ دور بین نے چند دنوں میں شیخ عبداللہ کی غنڈہ گردی اور شخصیت کو رسوائے عالم کردیا۔ مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ سو فی صد راہ راست پر آگیا اور عوام کی بے پناہ اکثریت شیخ عبداللہ کے سیاسی عقیدہ سے تائب ہوگئی۔ اس کے بعد شیخ عبداللہ سرینگر سے باہر جا کر تقریر کرنے کے قابل نہ رہا اور شہر سرینگر میں نیشنل کانفرنس کے جلسوں کی حاضری اب نہایت کم اور معمولی ہونے لگی۔ اور اس کا بھی اکثر حصہ ہندوؤں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ سرینگر میں حضرت قائداعظم کے قیام کی وجہ سے نیشنل ازم شیخ عبداللہ اور اسکے ساتھیوں کی سیاسی اور جماعتی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ البتہ چند قومی غدار باقی رہ گئے۔ جن کا راہ راست پر لانا قائداعظم کے بس کی بات نہ تھی۔

قائد اعظم کی مصروفیات:۔

حضرت قائداعظم سرینگر میں سیاسی حالات اور سیاسی پارٹیوں کا جائزہ لینے اور مسلم کانفرنس کے استحکام کے سلسلہ میں ساعی رہے۔ جب شیخ عبداللہ کے راہ پر آنے کی تمام امیدیں ٹوٹ گئیں تو قائداعظم کا سیاسی پروگرام اور زیادہ مصروف اور پیچیدہ ہوگیا۔ اس طویل قیام کے دوران ان سے بے شمار چھوٹے بڑے سرکاری افسروں، ہر سیاسی پارٹی کے کارکنوں اور وفود نے ہزاروں کی تعداد میں ملاقاتیں کیں، ان سرکاری اور سیاسی پارٹیوں کے

افراد میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل تھے۔

ایک دن مجھے بلوا کر فرمایا "کل دس بجے میر واعظ کو اپنے ساتھ میرے پاس لاؤ" چنانچہ دوسرے روز میر واعظ ان کے دو ساتھی اور میں قائداعظم کی اقامت گاہ پر پہنچے۔ رسمی گفتگو کے فوراً بغیر کسی تمہید کے انہوں نے میر واعظ کو اردو میں مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ کو میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ سیاسیات سے کنارہ کش رہیں۔ آپ کی حیثیت مذہبی ہے اور اس حیثیت میں ہم آپ کی عزت اسی طرح کرنے کو تیار ہیں جس طرح انگریز آرچ بشپ آف کنٹربری کی عزت کرتے ہیں لیکن جس طرح آرچ بشپ سیاسیات سے الگ تھلگ رہتا ہے، آپ کو بھی رہنا چاہئے۔ میر واعظ اور ان کے ساتھیوں کو تولا جواب ہونا ہی تھا میں بھی اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ یہ بات قطعاً میرے ذہن میں نہ آسکتی تھی کہ قائداعظم ایسا سوال اٹھائیں گے۔ چونکہ وہ یونہی کوئی رائے قائم نہیں کرتے تھے اور ایک دفعہ قائم کرنے کے بعد اسے تبدیل کرنا ان کی افتاد طبیعت جوہر مردم شناسی اور اصول سیاست کے خلاف تھا۔ میں نے معاملہ کو ٹالنا چاہا لیکن میری کوشش بے فائدہ تھی۔ اس لئے ہم مصلحتاً خاموش رہے اور ادھر ادھر کی دو چار رسمی اور اکھڑی ہوئی باتیں کر کے واپس آگئے۔ میر واعظ نے تو اس واقعہ کا مجھ سے پھر کبھی ذکر نہ کیا۔ لیکن میں پریشان سا ہو گیا۔ کیونکہ قائداعظم کی قطعی رائے کے باوجود میں متعدد ذاتی اور سیاسی وجوہ کی بنا پر یہ نہیں چاہتا تھا کہ میر واعظ یونہی اچانک سیاسی اعتبار سے بالکل ختم ہو جائیں۔ اسلئے میں نے دوسرے دن قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسی موضوع کو چھیڑ دیا۔ مجھے ان کے رد عمل کا علم تھا۔ کیونکہ اب میں ان کے مزاج کو اچھی طرح اور اکثر بزرگوں کی نسبت بہت زیادہ سمجھتا تھا۔ میری توقع کے عین

مطابق انہوں نے پہلے تو بات کو ٹال دیا لیکن آخر کار میں نے ان کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ ان کے ارشاد کی تعمیل کچھ عرصے کیلئے میری ذمہ داری پر ملتوی کی جائے اور یہ معاملہ اس طرح ٹل گیا۔ لیکن بعد میں اس ضمن میں کیا صورت حالات پیدا ہوئی اور قائداعظم پر کیا اثرات مترتب ہوئے اس کا جواب سردست مسلم کانفرنس کا وہ وفد ہی دے سکتا ہے جو میرے ۱۹۴۶ء میں گرفتار ہونے کے بعد ان کو دہلی میں چودھری حمید اللہ خان صاحب قائمقام صدر مسلم کانفرنس کی قیادت میں ملا۔ اس سلسلہ میں مجھے خود قائداعظم نے ۱۹۴۸ء میں جو کچھ فرمایا اس کا ذکر اپنے صحیح مقام پر آجائے گا۔

مسٹر پریم ناتھ بزاز کیساتھ میرے دوستانہ تعلقات تھے ۔ اور ایک وقت وہ میرے رفیق بھی رہے تھے۔ گلانسی کمیشن میں ہم نے اکٹھے کام کیا تھا۔ ان دنوں وہ خالص فرقہ پرست تھے اور ہندو یوک سبھا سرینگر کے صدر۔ لیکن اسکے بعد وہ نیشنلسٹ اور آخر میں ریڈیکل ڈیموکریٹ ہو گئے تھے۔

ایک زمانہ میں شیخ صاحب اور مسٹر بزاز بھی پکے دوست تھے اور دونوں نے غالباً ۱۹۳۵ء میں ہفتہ وار "ہمدرد" بھی جاری کیا تھا۔ نیشنل ازم کا اولیں پروپیگنڈا اسی اخبار کے توسل سے ریاست میں شروع ہوا۔ مسٹر بزاز ہی کی وجہ سے شیخ عبداللہ نے کانگریسی نیشنلزم کی طرف رخ کیا اور پنڈت جواہر لال نہرو اور خان عبدالغفار خان صاحب سے ابتدائی ملاقاتیں کیں ۔ شروع شروع میں نیشنل کانفرنس کے نفس ناطقہ بھی مسٹر بزاز ہی تھے۔ لیکن جب ان دونوں کی آپس میں ٹھن گئی تو ایسی ٹھنی کی حد ہو گئی۔ انکی باہمی مخالفت کی ابتدا زیادہ تر ان کے نئے متضاد سیاسی نظریات سے ہوئی۔ لیکن بعد میں اس نے اس حد تک طول کھینچا کہ شیخ عبداللہ اور ان کے رفقاء مسٹر بزاز کے خلاف

اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے۔ مسٹر بزاز پر بندوق سے قاتلانہ حملہ بھی ہوا۔ جس کی وجہ سے وہ کافی عرصہ تک موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ مسٹر بزاز ریاست کے ممتاز ترین اخبار نویسوں میں سے تھے اور صحافتی نقطہ نگاہ سے جرأت اظہار، آزادی رائے، اور اصول پرستی کے اعتبار سے کوئی انکا مدمقابل نہ تھا۔ وہ صاحب فراست، معاملہ فہم اور حقیقت میں سیاست دان بھی تھے۔ چنانچہ اسی لئے انہوں نے آخری مرحلہ پر علانیہ پاکستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی حمایت کی۔ جس پر وہ جیل میں ٹھونس دیئے گئے۔ اور ۱۹۵۱ء میں جلاوطن کر کے دہلی بھیج دیئے گئے۔ جہاں وہ آج کل بھی شیخ عبداللہ کے خلاف اور پاکستان کے حق میں مصروف کار ہیں۔

سیاسی اصولوں میں شدید اختلاف کے باوجود مسٹر بزاز اور ہم شیخ عبداللہ کی مخالفت پر متفق تھے۔ قائداعظم اکثر "ہمدرد" کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ سرینگر سے روانگی کے ایک دن قبل قائداعظم نے مسٹر بزاز کے اخبار کے حق میں ایک بیان دیا۔ جس میں انہوں نے ہمدرد کی تعریف کی جو نیشنل کانفرنس والوں کیلئے کسی صورت بھی قابل برداشت نہ ہوسکتی تھی۔ اس لئے وہ بزاز کے خلاف زیادہ غنڈے پن پر اتر آئے۔ لیکن اس طرح میں اور مسٹر بزاز آپس میں اور زیادہ قریب ہوگئے۔

جب قائداعظم ریاست میں تشریف لائے تو مہاراجہ ہری سنگھ لندن میں تھے۔ اور سرینگر سے قائداعظم کی واپسی کے ایک ہفتہ قبل واپس آئے۔ قائداعظم نے رسمی اور اخلاقی طور پر مہاراجہ کو اسی دن خط لکھا اور ملاقات کیلئے بھی خواہش ظاہر کی۔ اس سے بیشتر قائداعظم کی آمد پر سر بی۔ این۔ راؤ نے قائداعظم کو جموں میں تار بھیجا تھا کہ وہ سرینگر میں ریاست کی مہمانی قبول

فرمائیں۔ قائداعظم نے مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے عرض کیا کہ سرینگر میں قیام کے درمیانی عرصہ میں آپ دو ہفتہ کیلئے یہ دعوت منظور کرلیں۔ لیکن آغاز ہی میں ایسا کرنے سے سیاسی ردعمل ٹھیک نہیں ہوگا۔ چنانچہ قائداعظم نے اسی مضمون کا تار پرائم منسٹر کو ارسال کر دیا۔ ایک ماہ بعد وہ نصف ماہ کیلئے سرکاری مہمان ہوگئے۔ لیکن حکام ریاست کا چھچھوراپن ملاحظہ ہو کہ اس عرصہ میں ان میں سے کوئی بھی ملازم بحیثیت میزبان قائداعظم کو ملنے کیلئے نہیں آیا۔ یہاں تک کہ بزدلی کی وجہ سے جو شائد شرافت کا ایک جزو ہوتی ہے، خود راؤ بھی قائداعظم کے معترف ہونے کے باوجود ان سے ملاقات کیلئے ایک دفعہ بھی مہمان خانہ سرکاری میں نہ آئے اور غالباً اسی لئے قائداعظم میعاد مہمانی کے اختتام سے چند یوم قبل ہی اپنے ہاؤس بوٹ چلے آئے۔

قائداعظم نے سرینگر میں اپنی سیاسی مصروفیت کو ایک دن کیلئے بھی نہ چھوڑا اور کسی قسم کی تھکن کا اظہار بھی نہ کیا۔ سیاسی مخالفوں کی کج بحثی اور گستاخی کے باوجود انکے ماتھے پر کبھی شکن نہ آئی۔ میں نے اس دفعہ یہ بات خصوصیت سے دیکھی کہ قائداعظم نے اپنی عام سیاسی طبیعت کے برعکس مخالفوں کے ساتھ سیاسی گفتگو میں وکیلانہ تحمل اور بُردباری سے زیادہ کام لیا۔ ہماری سیاسیات کے ساتھ ان کی گہری دلچسپی کا یہ بھی ایک ثبوت تھا کہ اب ان کو ریاستی حالات وکوائف سے ہم سے بھی زیادہ معلومات تھیں۔

میں قائداعظم کو دوسرے تیسرے دن ملا کرتا تھا اور گھنٹوں ان سے سیاسی مذاکرات ہوا کرتے تھے۔ ایک دن جب حسب معمول ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے دیکھ کر فرمایا کہ میں بے حد مصروف ہوں اور دو گھنٹوں تک فارغ ہوسکوں گا۔ تم چاہو تو میرے پاس بیٹھ سکتے ہو۔ وہ اپنے ٹائپسٹ کو کچھ

لکھوا رہے تھے۔ میں نے بیٹھنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ آدھ گھنٹہ تک کام کرتے رہے اور اپنے ٹائپسٹ کو فارغ کر کے مجھ سے مخاطب ہوئے۔ اس زمانہ میں ملک خضر حیات لیگ سے علیحدہ ہو گئے تھے اور قائداعظم کی واپسی پر لاہور میں لیگ کا جنرل اجلاس ہونے والا تھا۔ انہی ایام میں مسٹر گاندھی کی جانب سے قائداعظم کو دیسی کاغذ پر ہندوستانی میں ایک چٹھی بھی موصول ہوئی تھی۔ جس میں انہوں نے قائداعظم کو یہ پیش کش کی تھی کہ تقسیم ہند کا معاملہ بھائیوں کی طرح باہمی طور پر نمٹا لیا جائے۔ قائداعظم اس وقت لیگ کونسل کے اِجلاس کیلئے تقریر لکھوا رہے تھے۔ اور گاندھی جی کے خط کا جواب بھی زیر تحریر تھا۔ جس کا لُبِ لُباب یہ تھا کہ گاندھی کی یہ پیشکش مکارانہ اور عیارانہ ہے۔ اسلئے لیگ اس کو ٹھکراتی ہے۔ دورانِ گفتگو میں نے عرض کیا کہ میرے ناقص خیال میں مسٹر گاندھی کی اس پیشکش کو، خواہ بدنیتی ہی پر مبنی کیوں نہ ہو اس طریقے سے ٹھکرانا مناسب نہیں ہوگا۔ انہوں نے فرمایا کہ تم اس کی بجائے کیا چاہتے ہو اور کیوں؟ میں نے عرض کیا کہ بجائے اس پیشکش کو مکارانہ اور عیارانہ کہنے کے یہ کہا جائے کہ ہم خوش ہیں کہ آخر گاندھی جی نے بھی ایک طرح اپنی چٹھی کے ذریعہ پاکستان کے جائز اصول کو تسلیم کر لیا ہے اور ہم اس کیلئے ان کے شکر گذار ہیں وغیرہ۔ میں نے چند دلائل بھی پیش کیے قائداعظم کی یہ عادت تھی کہ جب وہ کسی تجویز یا بحث کی روشنی میں کوئی فیصلہ کرنا چاہتے تھے تو بحث و تمحیص کے بعد خاموشی سے معاملہ کے مالہ، وماعلیہ پر گہرا غور کرتے اور معاملہ کی اہمیت کے مطابق اس پر وقت صرف کرتے اور پھر ان کا فیصلہ اٹل ہوتا۔ چنانچہ وہ اب کے بھی غور و فکر میں مصروف ہو گئے اور قریباً دس منٹ کے بعد مجھ سے فرمایا کہ میں تمہاری تجویز سے متفق ہوں۔ اسی وقت اپنے سٹینو کو بلوایا اور وہ تمام حصہ کٹوا ڈالا۔ اسی نشست میں میں نے جھجکتے جھجکتے ملک خضر حیات ٹوانہ کے بارے میں بھی تذکرہ چھیڑا۔ ان کے چہرے کا رنگ کسی حد تک متغیر ہو گیا۔

لیکن میں نے فوریہ اً فیصلہ کرلیا کہ منہ سے نکالی ہوئی بات ختم کر کے ہی رہوں گا۔ یہاں اس بات کا اظہار مناسب سمجھتا ہوں کہ قائداعظم مجھ پر بے حد مہربانی توجہ فرماتے تھے اوران کو مجھ پر بے حد اعتماد تھا۔ میری ان سے تین تین چار چار گھنٹے مسلسل ملاقاتیں ہوتی تھیں اوران ملاقاتوں میں عام طور پر ہندوستانی بالخصوص لیگ کی سیاست زیر بحث ہوتی تھی۔ لیکن قائداعظم نے کبھی ماتھے پر شکن نہیں آنے دی اور نہ کبھی مجھے ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں بہت حد تک ان کے مزاج اوران کی طبیعت کا واقف ہوگیا تھا۔ صرف دو دفعہ ذرا ترش لہجہ میں مجھ سے وہ مخاطب ہوئے۔ ایک دفعہ ۱۹۴۳ء میں جب میں نے دہلی میں ان کی خدمت میں عرض کیا کہ ہماری دلی دُعا تو یہ ہے کہ خدا آپ کو زیادہ سے زیادہ عمر عطا کرے۔ لیکن اگر آپ اپنے سامنے ہی کسی کو اپنا جانشین مقرر کر کے اسے دو چار سال لگاتار لیگ کا صدر منتخب کرادیں تو اس کی حیثیت قائم ہو جائیگی۔ انہوں نے فوراً تیز لہجہ میں فرمایا "کوئی نام تم ہی تجویز کرو"۔ پھر انہوں نے خود ہی ایک ایک لیڈر کا سیاسی تجزیہ کرنا شروع کردیا اور اور کہا کہ اب تمہاری کیا رائے ہے۔ میں خاموش ہوگیا تو فرمایا کہ واقعہ اصل میں یہ ہے کہ مسلم لیگ میرے نزدیک میری بہن، میرے سٹینو اور مجھ پر مشتمل ہے اور یہ خدا کی مہربانی ہے کہ ہمارا اجماعتی ڈھانچہ قائم اور ترقی پر ہے۔ پھر ۱۹۴۴ء میں کراچی کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر میں نے لیگ کے ہائی کمان اور دوسرے مندوبین کے قیام وطعام کے معاملہ میں نمایاں فرق دیکھا تو اپنے خیال کے مطابق مجھے دکھ ہوا۔ کیونکہ وہاں مجھے اسلامی مساوات کے اصول کے نقیض صورتحال نظر آئی۔ جلسہ کے اختتام پر میں ان سے ملا تو اس بات کا تذکرہ بھی عمداً چھیڑ دیا اور اپنی رائے کا برملا اظہار کردیا۔ قائداعظم قریباً ناراض ہوگئے لیکن میں نے اپنی بات کو نہیں چھوڑا۔ سلسلہ بحث لمبا ہوگیا تو میں نے خود ہی ادب واحترام کے پیش نظر معاملہ کو کسی آئندہ

ملاقات پر ٹال دیا۔ جہاں تک مجھ پر بھروسہ اور اعتماد کا تعلق تھا، وہ صرف اسی ایک واقعہ سے ظاہر ہے کہ عبوری حکومت کے متعلق مذاکرات آخری منزل پر تھے کہ مجھے قائداعظم کے پاس کسی ضروری معاملہ میں دہلی جانا پڑا۔ میں نے عبوری حکومت کے بارے میں ایک اہم سوال پوچھنا چاہا، جس سے میرا مدعا بھی ظاہر تھا۔ قائداعظم تین دفعہ معاملہ کو ٹال گئے۔ لیکن وقفوں کے بعد چوتھی دفعہ پھر میں نے سوال کو دہرایا تو مسکرائے اور فرمایا کہ یہ ایک ایسا اہم اور نازک معاملہ ہے کہ میں نے اپنی مجلس عاملہ کو بھی اس وقت تک اپنے اعتماد میں نہیں لیا۔ مجھے تمہاری بات سے پورا اتفاق ہے اور ایسا ہی ہوگا۔ لیکن ابھی تذکرہ کسی سے ہرگز ہرگز نہ کیا جائے۔ اسی ملاقات کے دوران میں مجھے قائداعظم نے کشمیر سے دہلی آنے کیلئے کہا اور بے حد اصرار کیا۔ یہاں تک کہ میرے اخراجات کی مستقل ذمہ داری کا وعدہ بھی فرمایا۔ لیکن میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جہاں بھی ہوں آپ کا ادنیٰ خادم رہوں گا اور اگر میں نے ریاست کو چھوڑ دیا تو وہاں کے مشکل اور مخدوش حالات کا سامنا مشکل ہو جائیگا۔

بہرحال جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے میں نے ملک خضر حیات کی علیحدگی کے متعلق مسلم لیگ کے فیصلہ سے سوفی صدی اتفاق کرتے ہوئے قائداعظم سے عرض کی کہ معلوم نہیں کل سیاسیات ہند کا کیا نقشہ ہوگا۔ لیکن چونکہ پنجاب ہماری بساط سیاست کا سب سے بڑا مہرہ ہے۔ اس لئے کل کی فکر آج کر کے اگر ملک صاحب کو راہ پر لایا جا سکے تو قومی نقطۂ نگاہ سے یہ اقدام مفید ہوگا۔ اس لئے آپ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کریں اور لاہور جاتے ہی اصلاح کیلئے کوئی کوشش کریں۔ قائداعظم نے بِلا تامل وعدہ فرمایا۔ معلوم نہیں بعد میں کیا ہوا لیکن ان کی فوری آمادگی میرے لئے بے حد مسرت اور حوصلہ افزائی کا باعث تھی۔ حالانکہ یہ معاملہ بہت ٹیڑھا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ قائداعظم کسی کے حق میں یا خلاف یونہی سنی سنائی باتوں پر یا جذبات سے متاثر ہو کر فیصلہ نہیں

کرتے تھے بلکہ پورے غور فکر کے بعد۔ لیکن پھر ان کا فیصلہ قطعی اور اٹل ہوا کرتا تھا اور بلاشبہ عام طور پر صحیح اور صائب بھی ہوتا تھا۔

سرینگر سے لاہور روانہ ہونے سے ایک دن پہلے انہوں نے مجھے کھانے پر بلایا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میں جب بھی اور جہاں کہیں ان کی ملاقات کیلئے جاتا وہ اکثر مجھے کھانے پر بلایا کرتے اور کبھی مجھے اس کی اجازت نہ دیتے تھے کہ میں اپنی جیب سے سگریٹ نکال کر پیوں۔ خود بڑے سگریٹ نوش تھے۔ لیکن یہ ان کی عادت تھی کہ سگریٹ صرف ایک تہائی یا زیادہ سے زیادہ نصف پیتے اور سگریٹ سلگانے کے بعد اگر کسی وجہ سے ایش ٹرے میں رکھ دیتے تو پھر اسے حتی الوسع نہیں اٹھاتے تھے۔ بہر حال کھانے کے دوران میں نے ان سے دریافت کیا کہ مہاراجہ نے آپ کی چٹھی کا جواب دیا ہے لیکن وہ خاموش رہے اور پھر بات کاٹ کر سیاسیات کشمیر کا ذکر چھیڑ دیا ور اچانک فرمایا "چودھری صاحب میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں" یہ فقرہ کھانے کے درمیان وقفوں میں انہوں نے تین دفعہ کہا۔ میں دل ہی دل میں خوش ہوا کہ شائد وائسرائے کی جانب سے ہمارے معاملات کے متعلق کوئی خاطر خواہ جواب موصول ہوا ہے۔ لیکن انہوں نے فرمایا کہ میرے پاس اس اڑھائی ماہ کے قیام میں ہر قسم کے لوگ انفرادی اور وفود کی صورت میں ہزاروں کی تعداد میں ملنے کیلئے آئے۔ ان میں ہندو، مسلم، سکھ، ملازم اور غیر ملازم، نیشنلسٹ اور مہاسبھائی بھی شامل تھے اور میں ہر ایک سے یہی سوال کرتا تھا کہ آپ کی غلام عباس کے متعلق کیا رائے ہے۔ مجھے دلی خوشی ہوئی کہ تمام ملنے والوں میں سے کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جس نے سیاسی اور ذاتی دونوں حیثیتوں میں تمہاری تعریف نہ کی ہو۔ حتیٰ کہ خود عبداللہ اور اسکے ساتھی سب سے زیادہ تمہارے معترف اور مداح تھے.........

اس سلسلہ میں مجھے ایک حقیقت یاد آ گئی کہ ریاست میں میرے سب سے بڑے سیاسی حریف اور دشمن ہندو مہاسبھائی اور نیشنلسٹ تھے۔ ان لوگوں کے

تمام سابقہ بیانات، تقریریں اور اخبارات اب بھی اٹھا کر دیکھ لیجئے، اس سے قائداعظم کے متذکرہ صدر تجربہ کی سو فی صد تائید ہوگی۔ مگر وہ کشمیر تھا، ریاستی سیاست اور غلامی کا ماحول "آزادی کی فضا" میں سب کچھ روا ہے اور سب کچھ ممکن ہے!

مجھے افسوس ہے کہ اوپر ایک آدھ ایسا واقعہ بطور جملہ معترضہ درج ہو گیا ہے۔ جو براہ راست میری ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اسے لکھنا میں نے عمداً جائز سمجھا ہے۔

حضرت قائداعظم دوسرے دن سرینگر سے روانہ ہوئے تو کوہالہ تک مسلمانان ریاست نے بیسیوں مقامات پر دیدہ و دل فرش راہ کر کے ان کا استقبال کیا۔ خاتون پاکستان اور میں ان کے ہمراہ تھے۔ رات دومیل قیام ہوا۔ کھانے سے فارغ ہو کر قائداعظم خاتون پاکستان اور میں یونہی مصروف گفتگو تھے کہ اسی دوران میں قائداعظم نے اپنی کانفی ڈنشل ٹرے کھول کر ایک خط مجھے دیا۔ یہ خط مہاراجہ ہری سنگھ کی طرف سے قائداعظم کے خط کے جواب میں آیا تھا اور بالکل رسمی تھا۔ ناسازی طبع کی بنا پر رسمی ملاقات سے معذرت ظاہر کی تھی۔ قائداعظم کی گفتگو سے صاف عیاں تھا کہ ان کو مہاراجہ کی اس بداخلاقی سے بے حد صدمہ پہنچا ہے۔ میرے دل میں اس واقعہ سے مہاراجہ کے خلاف نفرت کے جذبات اور بڑھ گئے۔

میں نے قائداعظم میں جو سب سے انوکھی اور دنیا کے تمام سیاسی راہنماؤں سے ممتاز چیز دیکھی وہ یہ تھی کہ وہ بحیثیت سیاستدان "نقص" کی حد تک صاف گو اور بے باک تھے اور دوست ہو یا دشمن کسی سے دل کی بات کہنے میں تامل نہیں کرتے تھے۔ میرے خیال میں یہ ان کی بڑائی تھی۔ اسی چیز کی بدولت ہم نے پاکستان حاصل کیا اور اسی کے فقدان سے آج بحیثیت مسلمان پریشان ہیں۔

میرا ایمان ہے کہ اگر قائداعظم دس سال اور زندہ رہتے، یا پاکستان دس سال پہلے قائم ہو گیا ہوتا تو موجودہ پاکستان سے مختلف ہوتا کیونکہ ان کا دل اور ان کی نظر دونوں مسلمان تھے۔

تیسواں باب

حضرت قائداعظم کی آمد کا ردعمل

ریاست میں قائداعظم کی آمد مسلمانوں کی جماعتی تنظیم اوران کے سیاسی مستقبل کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ مسلم کانفرنس طاقت وسیاست کے لحاظ سے بڑی بلندیوں پر پہنچ گئی اور شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کا رہا سہا وقار بھی خاک میں مل گیا۔ مہاراجہ، ریاستی حکومت اور ہندو قوم پر ان کی ذہنیت کے پیش نظر اس کا وہی کچھ ردعمل ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ ان کے سینوں میں بغض اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ ہندوؤں اور سکھوں کے ماتھوں پر بل پڑ گئے۔ ان کی نظریں یک لخت بدل گئیں۔ یہاں تک کہ میرے اکثر غیر مسلم دوستوں کا، جو ہمیشہ رواداری اور وسعت قلبی کا دم بھرا کرتے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے بھرم ٹوٹ گیا۔ ابتداء میں چونکہ حکومت اور ہندوؤں کیلئے یہ صدمہ شدید تھا اس لئے کچھ عرصہ کیلئے تو ان کے اوسان خطا رہے اور ہمیں کسی فوری ردِعمل سے دوچار نہ ہونا پڑا۔ شائد اس کی یہ وجہ تھی کہ وہ جوابی کارروائیوں کی ادھیڑ بن میں مصروف تھے۔ بہرحال جب کٹر ہندو ذہنیت کے پرنالوں کے منہ کھلے تو حکومت کی اعلانیہ جانبداری سے ریاست میں سیاسی اور فرقہ وارانہ کشمکش اور تصادم کا ایسا خوفناک سیلاب آیا کہ اگر مسلمانوں کا ایمان سلامت اور ان کے سیاسی عقیدے پکے نہ ہوتے تو ان کا اس سیلاب میں بہہ جانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ چنانچہ جن علاقوں میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی وہاں شدید قسم کے فرقہ وارانہ

فساد شروع ہو گئے۔ قائداعظم کی واپسی کے بعد شہر جموں میں جو پاکستانی مرکز سمجھا جاتا تھا اور جس جگہ کے مسلمان ''اورنگ زیبی'' مسلمان گنے جاتے تھے اس دفعہ تقریب عید میلاد النبی فرقہ وارانہ ہنگامہ کے اعتبار سے تاریخی تھی۔ اگلے پچھلے درجنوں شدید قسم کے لڑائی جھگڑوں کا اس سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ شہر کے چیدہ چیدہ ہندوؤں نے جن میں وکیل، سیاسی کارکن اور سرکاری ملازم بھی شامل تھے، عید میلاد کے جلوس سے چند یوم قبل از راہ ہمدردی و رازداری مجھے یہ مشورہ دیا کہ اول تو یہ جلوس نکالا ہی نہ جائے یا کم از کم اس کا راستہ تبدیل کیا جائے اور اس میں پاکستان اور قائداعظم کے نعروں سے احتراز کیا جائے۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کے اس جلوس کو ایک تو سیاسی لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل ہو چکی تھی، دوسرے اس کا چار میل لمبا راستہ خالص ہندو علاقوں اور بعض مقامات پر تنگ و تاریک کوچوں سے گزرتا تھا۔ میں نے اپنے دوستوں کو کورا جواب دے دیا لیکن وہ آخری دن تک مجھے سمجھاتے رہے۔

میں نے ان حالات کی وجہ سے مسلم کانفرنس کے تمام چیدہ کارکنوں کا اجلاس منعقد کر کے ہندوؤں کے مشکوک عزائم کے پیش نظر جلوس کے متعلق مشورہ طلب کیا۔ میرا مطلب صرف اتنا تھا کہ ایک تو وہ آنے والی صورت حالات سے باخبر ہو جائیں۔ دوسرے انکی موقع کی نزاکت کے مدنظر تیار کیا جاسکے۔ بہرحال جلوس پورے اہتمام سے راستے یا نعروں کی تبدیلی کے بغیر وقت مقررہ پر نکلا اور یہ جانتے ہوئے کہ شدید قسم کا تصادم ناگزیر ہے ہم نے سکولوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو حسب معمول سب سے آگے رکھا۔ اس دن مسلمانوں کے گھروں میں عورتوں کے سوا کوئی فرد نہ رہا تھا۔ حتیٰ کہ تمام سرکاری ملازم بھی جلوس میں شامل تھے۔ جن میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

ڈائریکٹر تعلیم خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو آج کل پاکستان کی زکوٰۃ کمیٹی کے چیرمین ہیں۔ جلوس جب عین ہندو محلّہ اور ایک تنگ بازار میں پہنچا تو یک دم مکانوں کی چھتوں سے پتھروں اور اینٹوں کی بارش شروع ہوگئی اور کئی جگہوں سے فائرنگ کی آوازیں بھی شروع ہوگئیں۔ مسلمان بالکل نہتے تھے لیکن انہوں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق جلوس کے نظم و نسق کو قائم رکھا۔ صرف تین چار مسلمان اِضطرار کے عالم میں گلیوں میں گھس جانے کی وجہ سے شہید ہوگئے۔ لیکن یہ ایک الٰہی معجزہ تھا کہ اس دن مسلسل خشت باری کے باوجود کسی ایک مسلمان کو بھی ضربِ شدید نہ آئی۔ میرے اپنے اردگرد صرف ایک ایک فٹ کے فاصلے پر متعدد اینٹیں اور پتھر گرے لیکن میں براہ راست ضرب سے بالکل محفوظ رہا۔

لیکن دیکھتے ہی دیکھتے مسلمان نوجوان دکانوں کے اوپر چڑھ گئے۔ اور آدھ گھنٹے کی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ تمام ہندو علاقہ اور بازار ہمارے قبضہ میں ہوگیا۔ یہ صرافوں کا بازار تھا مگر مسلمانوں نے ہندوؤں کی پھوٹی کوڑی کو بھی ہاتھ نہ لگایا۔ ہندو پولیس بھی مقابلہ کی تاب نہ لا کر فرار ہوگئی اور بعد میں ہندو فوج بھی موقعہ پر بُلائی گئی جس نے ایک مقام پر مسلمانوں کو آگے روکنا چاہا۔ لیکن مسلمانوں نے فوجی حلقہ توڑ دیا اور اعلان کردیا کہ اگر ہم پر فائر کیے گئے تو ہم نہتے ہی اُلجھ جائیں گے۔ مسلمانوں کی تعداد قریباً تیس ہزار تھی۔ کیونکہ اس دن جموں کے اردگرد سے بھی ہزاروں کی تعداد میں مسلمان شامل جلوس تھے اور ان کا جذبہ اس قدر زیادہ تھا کہ فوجی بھی شکست مان کر ایک طرف ہٹ گئے۔ اس کامیابی نے ہندوؤں کے دانت ہمیشہ کیلئے کھٹے کردیئے اور جب تک مسلمان وہاں زندہ رہے ہندوؤں نے مقابلہ کی جرات نہ کی بلکہ انکی نگاہیں ہمیشہ کیلئے نیچی ہوگئیں۔

سیاسی دوروں کا پروگرام :۔

قائداعظم کی واپسی کے بعد ہم نے سیاسی دوروں کے پروگرام پر وسیع پیمانے پر عمل شروع کر دیا اور ہمارے تمام کارکن جذبہ صادق سے مصروفِ عمل ہو گئے۔ حکومت نے اپنی طرف سے مسلم کانفرنس کو کمزور کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ تمام حربے ناکام ہوئے تو پھر مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی ناپاک کوششیں شروع ہو گئیں۔ اس مقصد کیلئے روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ جاٹوں، گوجروں، راجپوتوں، کشمیریوں، غیر کشمیریوں کو برادری کے نام پر اُبھارا گیا اور شہری اور دیہاتی کی تفریق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن حکومت کے یہ ہتھیار اس کے کام نہ آسکے۔ ہمارے مقصد، ہماری جماعت اور ہماری تنظیمی نقل و حرکت میں اتنی طاقت تھی کہ دشمن کی ایک بھی نہ چل سکی۔

میں مسلسل تین چار ماہ تنظیمی مصروفیات کے سلسلہ میں گھر سے باہر رہا۔ تقریباً ہر اہم اور دور دراز مقام پر پہنچا اور مسلمانان ریاست کے نام قائداعظم کا نیا پیغام پہنچا کر ان کے دلوں میں قومی زندگی کی روح پیدا کرنے کی کوشش کی۔

مسلم کانفرنس کے کارکنوں کو قومی کام سے اتنی دلچسپی تھی کہ وہ اسی کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتے تھے۔ خویش و اقارب، بیوی بچوں اور دنیاوی کاروبار کا ہمیں کبھی احساس نہیں ہوا۔ میں چار چار ماہ کیلئے دور دراز علاقوں میں سیاسی دوروں پر رہا۔ لیکن کبھی گھر خط نہیں لکھا۔ جیل میں طویل عرصوں کیلئے رہنے کے باوجود میں نے کبھی گھر والوں کے ساتھ خط و کتابت تک نہیں کی۔ اپنے بچوں کی طرف مجھے بظاہر کوئی خاص کشش نہ تھی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ میں نے اپنی ساری عمر میں ایک دفعہ بھی اپنے کسی بچے کو گود میں لینا تو در کنار زمین سے اٹھایا تک نہیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ عام والدین اس پر یقین نہیں کر سکتے۔ لیکن مجھ میں بھی جذبات

پدری موجود تھے۔ مگر اپنی مخصوص قسم کی جہد مسلسل کی زندگی کی وجہ سے یہ بوجھل پتھر شروع شروع میں اپنے دل پر مجبوراً رکھنا پڑا اور بعد میں عادت، یا بالفاظ دیگر اس معاملہ میں بے حسی پیدا ہوگئی۔ اسی وجہ نے بچوں کی دیکھ بھال، ان کی تعلیم اور ان کے مستقبل کا مجھے کبھی احساس نہیں ہوا۔ مسلسل اسیری کی زندگی نے اس بے حسی اور غفلت میں اور زیادہ اضافہ کر دیا جس کا اب خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔

اس دفعہ پھر علاقہ کی دوری، قدرتی مناظر کی فراوانی اور لوگوں کی محبت کی وجہ سے کشتواڑ بھدرواہ اور ڈوڈہ میں ہمارا بہت زیادہ وقت صرف ہوا۔ اب یہ عالم تھا کہ اس دور افتادہ علاقہ کے صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں اور بچے بھی قائداعظم کی غائبانہ عقیدت اور پاکستان کے جذبہ سے سرشار اور از خود رفتہ نظر آتے تھے۔ بلکہ اس علاقہ کی کوئی ایسی چوٹی نہ تھی جو پاکستان کے نعروں سے نہ گونج اٹھی ہو۔

کشتواڑ سے ہم سنگ پورہ کے راستے عازمِ سرینگر ہوئے۔ سنگ پورہ پہاڑ کی چوٹی قریباً اٹھارہ ہزار فٹ اونچی ہے۔ ہمارے لئے یہ بات موجب مسرت و اطمینان تھی کہ اس آخری پہاڑی علاقہ میں آخری آبادی تک تمام فضا پاکستان اور قائداعظم کے نعروں سے معمور اور بھرپور تھی۔ آج بھی اس علاقہ کے لوگ ہندوستانی مظالم کے باوجود اپنے سیاسی عقیدے پر مستعدی سے قائم ہیں۔

اس پہاڑ کے دامن میں رات بسر کر کے صبح ہم سرینگر کی طرف روانہ ہوئے۔ ہمارے میزبان نے راستہ کیلئے ہمیں پُر تکلف کھانا ہمراہ دیا۔ ہمارا قافلہ کافی بڑا تھا لیکن میں ایک ساتھی کے ہمراہ قافلہ سے آگے بڑھ گیا تا کہ پہاڑ کی چوٹی پر جلد سے جلد پہنچ جاؤں۔ ہم سخت اور تقریباً سیدھی چڑھائی کے باوجود اپنے ساتھیوں سے بہت آگے نکل گئے۔ صبح چھ بجے چل کر ہم تقریباً دو بجے سنگ پورہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے۔ اس کے بعد پہاڑ کی دوسری جانب وادی

کشمیر میں داخل ہونے تک مسلسل دس میل شدید ڈھلوانی سفر تھا اور آبادی تک پہنچنے کیلئے ہمیں تیرہ ہزار فٹ نیچے اترنا تھا۔ بھوک اور پیاس نے مجھے اور میرے ساتھی کو نڈھال کر دیا تھا۔ لیکن خوشی یہ تھی کہ اٹھارہ ہزار فٹ بلند چوٹی پر کھڑے ہو کر ہم اپنے آپ کو دنیا اور دنیا والوں سے زیادہ بلند محسوس کر رہے تھے۔ اوپر صاف اور نیلگوں آسمان تھا جو ہمیں نیچے نگاہ ڈالنے کی وجہ سے اب صرف دو ہاتھ اونچا معلوم ہوتا تھا۔ نیچے کی جانب ایک وسیع و مسلسل سرسبز فضا تھی اور ہماری آنکھیں دور دراز حد نظر تک سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ اتنی بلندی پر بلکہ اس سے بھی بہت نیچے برگ و گیاہ اور درخت تو درکنار، چرندوں، پرندوں کا نام و نشان نظر نہیں آ سکتا۔ اس وقت وہاں صرف ہم دو ذی روح انسان اور ہمارے دو پہاڑی گھوڑے موجود تھے۔ یا پھر خدا جو غیر مرئی طور پر ہمارے بالکل نزدیک ہی محسوس ہوتا تھا۔ اس عالمِ بے خودی میں ہم نے سگریٹ سلگائے اور اپنے ساتھیوں کو یونہی خلاء میں زور زور سے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ لیکن ابھی میں نے سگریٹ کا چوتھا حصہ بھی نہ پیا ہو گا کہ آناً فاناً آسمان بالکل ابر آلود ہو گیا۔ اگلے وقتوں کے لوگوں سے سنتے آئے ہیں بلند پہاڑوں پر زور زور سے آوازیں دی جائیں تو بارش فوراً آ جاتی ہے۔ معلوم نہیں اس بات میں سائنس کیا کہتی ہے۔ لیکن وجہ کچھ بھی ہو ہماری آوازوں کے دو تین منٹ کے اندر اندر گھٹا ٹوپ اور سیاہ بادل فضائے آسمانی پر مسلط اور محیط ہوئے اور برسنا شروع ہو گئے۔ ہم نے پہلے تو خیال کیا کہ جس سرعت سے یہ بارش آئی ہے اسی طرح دو چار منٹ کے اندر اندر ختم ہو جائی گی۔ لیکن اسکا سلسلہ نہ رکا تو ہماری تمام خوشی جاتی رہی۔ اب یہ صورت تھی کہ ہمارے لئے پیچھے جانا بے مطلب تھا۔ وہاں پڑے رہنا خارج از بحث اور آگے

سفر کانا خطرناک اور غیر یقینی۔ اس ذہنی خلفشار اور پریشانی میں نے ہم غلطی سے آگے چلنے کا فیصلہ کرلیا۔ راستہ بالکل ایک ناہموار، بے ترتیب، اسی درجہ کے زاویہ کی نشیب پگڈنڈی تھی۔ سواری ناممکن تھی۔ اس لئے ہم نے گھوڑوں کی باگیں پکڑلیں اور چلنا شروع کردیا۔ لیکن پھسلن سے گھوڑوں کے قدم نہ جمتے تھے اور وہ ہمارے اوپر گرتے تھے۔ اس لئے ہم نے ان کو چھوڑ دیا۔ زناٹے کی بارش اور دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہمیں ایک تنہا مسافر ملا جو اوپر کی طرف آرہا تھا۔ ہم نے اس سے راستہ کی حقیقت حال دریافت کی تو ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ جب اس نے بتایا کہ ابھی آبادی تک پہنچنے کیلئے پانچ گھنٹے کا سفر کرنا ہوگا۔ درختوں کا سلسلہ دو میل کے بعد شروع ہوگا۔ راستہ میں کوئی اوٹ نہیں اور آگے چل کر راستہ چیتوں، ریچھوں اور دوسرے جنگلی جانوروں سے بھرا پڑا ہے۔ مزید دریافت پر اس نے انتہائی نومیدی اور مایوسی کی حالت میں بتایا کہ اس نے سفر اس واسطے جاری رکھا کہ ٹھہرنا اور چلنا موجودہ حالت میں دونوں برابر ہیں اور کہ اسے زندگی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ یہ کہہ کر وہ چل پڑا۔ کئی منٹ تک ہماری آنکھیں اس کی سمت جمی کی جمی رہیں اور آخر اللہ کا نام لے کر ہم نے پھر سفر شروع کردیا۔ راستہ اب جگہ جگہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اور جہاں جہاں ثابت تھا وہاں دو دو فٹ گہرا پانی جاری تھا۔ اکثر موقعوں پر ہمیں برف کے پلوں سے گزرنا پڑا۔ ڈر کی وجہ سے یا تو انسانی سانس پھول جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں شل ہوجاتے ہیں یا بچاؤ کے جذبہ سے جسم میں زیادہ حرکت پیدا ہوجاتی ہے۔

حالات کے لحاظ سے ہماری حالت پہلی نہیں دوسری تھی اور ہم نے دو دو کی بجائے چار چار پاؤں سے سفر شروع کردیا۔ یہ تائید غیبی تھی ورنہ شائد تاخیر کی

وجہ سے ہماری زندگی کا قافلۂ امید یوُں ہی رات کی تاریکی میں کھُو جاتا۔ آگے چل کر درخت شروع ہوگئے اور پہاڑ کے ساتھ ساتھ بہت دور نیچے تیز نالہ۔ بادل اور درختوں کی وجہ سے یہاں فضا زیادہ بھیانک، سونی اور اندھیری ہوگئی۔ پھر یکایک کثرت اور وزن کے لحاظ سے نہایت خطرناک ژالہ باری شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ ہمارے گھوڑے ایک ایک اولے کے گرنے پر زمین سے دو دو فٹ اوپر اچھلتے تھے۔ ہم نے دوڑ کر ایک درخت کے نیچے پناہ لی ہی تھی نالہ کے اس پار پہاڑ کی طرف جو نگاہ اٹھی تو میں نے تیس چالیس ریچھوں کا ایک غول کا غول نیچے نالے کی طرف اترتے دیکھا۔ ہمارا خون جو پہلے ہی مسلسل بارش کی وجہ سے سرد تھا اس منظر کو دیکھ کر بالکل ہی منجمد ہوگیا۔ ہم دونوں درختوں کی اوٹ میں چپ چاپ بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ سانس بھی ٹھیک طور سے نہ لیتے تھے کہ مبادا کہیں اسکی آواز سے ریچھوں کی توجہ ہماری طرف ہوجائے۔ قصہ مختصر ہم رات دس بجے بھوکے پیاسے منزل مقصود پر پہنچے۔ سردی سے ہمارے ہونٹ نیلے ہوگئے تھے اور کپڑے پانی سے شرابور۔ بارش نے شروع سے لے کر آخر تک ہمارا پیچھا نہ چھوڑا۔ لیکن ایک گھنٹہ بعد جب ہمارا قافلہ پہنچا تو یہ دیکھ کر ہماری حیرت اور مزید ذہنی کوفت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ تمام کے تمام ہشاش بشاش اور سوکھے ساکھے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ بارش کا احساس ان کو صرف راستہ کے گیلے ہونے سے ہوا۔ یعنی اس قدر غضب ناک بارش صرف ہمارے لئے ہمارے ہی ساتھ ساتھ رہی اور ان کے آگے آگے گذر گئی۔ اس واقعہ کے بعد میں نے پہاڑی سفر میں قافلہ سے ترک رفاقت کے خلاف پختہ عہد کرلیا۔ دوسرے دن ہم سرینگر پہنچ کر سیاسی کاموں، اجلاسوں اور پارٹی میٹنگوں میں مصروف ہوگئے۔

چوبیسواں باب

ریاست میں "ڈائی آرکی" کا نفاذ

ریاستی اسمبلی کی ۲۱ منتخب نشستوں میں ۱۹ پر مسلم کانفرنس کا قبضہ تھا۔ لیکن جب شیخ عبداللہ ہم سے الگ ہوگئے تو ان میں سے آٹھ ممبران نے انکی نیشنل کانفرنس کی وفاداری کا حلف اٹھایا۔ باقی ۱۲ ممبران مسلم کانفرنس گروپ اور ایک آزادی ممبر کی حیثیت میں چودھری حمید اللہ خان کی لیڈر شپ کے تحت حسب سابق اسمبلی میں اپنا کام کرتے رہے۔ آئنگر کے زمانے میں ایک ایسا وقت آیا کہ نیشنل کانفرنس کا غنڈا پن انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اس بات کی شہ تو ان کو خود آئنگر ہی نے دے رکھی تھی۔ لیکن "میری بلی اور مجھ کو میاؤں" کے مِصداق نیشنل کانفرنس نے اب آئنگر اور اسکی حکومت کو بھی اس گھمنڈ میں گھرانا شروع کر دیا کہ اسلامی تنظیم اور مسلم کانفرنس کے استیصال کیلئے حکومت کی جو خدمت وہ کر رہے تھے اسکی وجہ سے حکومت ان کی خوشامد اور ناز برداری پر ہر حال میں مجبور ہوگی۔ لیکن وہ یہ بھول گئے کہ آئنگر بھی خالص ڈکٹیٹر تھا۔ جس طرح یہ کلیہ ہے کہ ڈکٹیٹر اپنی طبعی موت کبھی نہیں مرتے، اسی طرح یہ مسلم ہے کہ وہ دوسروں کی سرپرستی تو کر سکتے ہیں لیکن اپنے مقابلے پر کسی کی آمریت قطعاً برداشت نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس وجہ سے کچھ عرصہ کیلئے آئنگر اور شیخ عبداللہ کے باہمی تعلقات بگڑ گئے۔ اس کے علاوہ ایوانِ اسمبلی میں حکومت کی جانب سے ہندی کی ترویج اور قانون اسلحہ کی منظوری کیلئے (جس کی رو سے ہندوؤں کو مسلح اور مسلمانوں کو غیر مسلح کر دینا

مقصود تھا) تحریکیں پیش کی گئیں تو مسلم کانفرنس گروپ نے اس سلسلہ میں آسمان سر پر اٹھایا اور حکومت کو نہایت آڑے ہاتھوں لیا۔ لیکن اس کے مقابلہ پر اسمبلی کے چار نیشنل کانفرنسی ممبر گومگوں کی حالت میں رہے۔ جب ایوان اسمبلی سے باہر عوام میں بھی انکے خلاف سخت برا ردعمل ہوا تو شیخ صاحب گھبرا گئے۔ لہٰذا ایک طرف تو آئنگر کو خائف کرنے کیلئے اور دوسری طرف ہندی اور قانون اسلحہ کی وجہ سے پیدا شدہ ندامت کو مٹانے کی غرض سے شیخ صاحب نے ان چار ممبروں کو اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی کرا دیا۔ شیخ عبداللہ کو اور خود ہمیں بھی یقین تھا کہ حکومت اپنے سیاسی ایجنٹوں کو یونہی نہیں ٹھکرائے گی، لیکن آئنگر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ یہ استعفے منظور کر لئے اور نیشنل کانفرنس اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ ادھر ہم نے فوراً مطالبہ شروع کر دیا کہ ان نشستوں کو پُر کرنے کیلئے فوراً ضمنی انتخابات عمل میں لائے جائیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان دنوں ریاست میں "ڈائی آرکی" کا چرچا تھا۔ آئنگر نے ایک گھمبیر اور خرانٹ سیاست دان کی طرح دور اندیشی سے کام لے کر یہ استعفے منظور کر لئے۔ چنانچہ دو تین ہفتوں کے بعد نیشنل کانفرنس نے جو "ڈائی آرکی" کی خوشی میں مہینوں سرشار تھی آئنگر کے حضور سجدہ سہو کیا اور اس نے ان لوگوں سے اچھی طرح ناک رگڑوا کر نیشنل کانفرنس پر یہ احسان کیا کہ ان کی چار مستعفی شدہ ممبروں کو مہاراجہ کے خصوصی اعلان سے اسمبلی کا ممبر نامزد کر دیا۔ اب نیشنل کانفرنس کا یہ اسمبلی گروپ سرکاری گروپ تھا اور مسلم کانفرنس اس بات کو لے اڑی۔

غالباً یکم اکتوبر ۱۹۴۴ء کو مہاراجہ نے یہ اعلان کر دیا کہ ریاست میں اصلاحات کی دوسری قسط کے سلسلہ میں جمہور کی جانب سے دو منسٹر لئے جائیں گے۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں ان کا انتخاب ہوا۔ لیکن مسلم کانفرنس نے متعدد وجوہ کی

بنا پر ایسی ناقص اصلاحات کا بائیکاٹ کر دیا۔ ان منسٹروں کا انتخاب اس اسمبلی نے کیا جس کے پچھتر ممبروں میں سے منتخب ممبر صرف اکیس[21] تھے۔ باقی یا تو ہندو تھے یا حکومت کے نامزد رکن۔ اس لئے حکومت کے سہارے پر نیشنل کانفرنس کا امیدوار کامیاب ہو گیا۔ دوسرے دن سر۔ بی۔ این۔ راؤ نے اپنی گورنمنٹ کے چیف سیکرٹری چودھری نیاز احمد کے ذریعے مجھے اپنے طور پر یہ پیغام بھیجا کہ اس سلسلے میں مسلم کانفرنس کا فیصلہ نہایت ہی مستحسن تھا۔

مسلم کانفرنس کا اسمبلی گروپ اور مجلس عاملہ دونوں مصر تھے کہ منسٹری کا یہ الیکشن لڑنا چاہئے۔ لیکن میں اور صرف ایک دو اور دوست اس کے مخالف تھے۔ چنانچہ ان دونوں اداروں کو راہ پر لانے کیلئے مجھے تین دن صرف کرنے پڑے۔ مسلم کانفرنس کے بعض حلقوں میں اس نمائشی تماشا آرائی کی وجہ سے جو حکومت نے ان دو "پاپولر" منسٹروں کو عوام میں متعارف کرانے کیلئے کی، کچھ بددلی اور گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔ حالانکہ ہر بالغ نظر شہری کے نزدیک نیشنل کانفرنس کی نئی پوزیشن اس کے تابوت میں ایک اور بڑا کیل تھی اور امر واقعہ یہ ہے کہ دو ماہ کے اندر ہی نیشنل کانفرنس مسلمانوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی۔ اس عام قاعدہ کے ماتحت کہ دو متصادم جماعتوں میں سے ایک کی کمزوری اور دوسری کی بالواسطہ طاقت ہوتی ہے۔ نیشنل کانفرنس کی یہ سیاسی افتاد ہماری مزید تقویت کا باعث ثابت ہوئی۔ شیخ صاحب کو سیاسی اعتبار سے یہ منسٹری بہت مہنگی پڑی۔ انہوں نے اپنی روائتی زود پشیمانی کی وجہ سے پھر قلابازی کھائی اور منسٹری سے صرف چند ماہ بعد استعفیٰ دلوا دیا۔

مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس اور سر بی این۔ راؤ:۔

اس دفعہ پھر ہم نے عمداً اجلاس کا مقام راولاکوٹ مقرر کیا۔ سر بی این راؤ

نے اجلاس سے چند یوم قبل ایک دوست کے ذریعے مجھے ذاتی پیغام بھیجا کہ راولاکوٹ کی بجائے سالانہ اجلاس پونچھ خاص میں منعقد کیا جائے۔ چونکہ وہ پہلے پرائم منسٹر تھے جنہوں نے معاملات وسیاسیات کشمیر میں حتی الامکان غیر جانبدار رہنے کی کوشش کی تھی۔ اس لئے ہم نے ان کی یہ بات مان لی۔ جس روز پونچھ میں ہمارا اجلاس شروع ہوا ہمیں اطلاع موصول ہوئی کہ ان کی جگہ پنڈت رام چند کاک وزیراعظم مقرر ہو گئے ہیں۔ انکے سیاسی اور بحیثیت حاکم ماضی کے پیش نظر اسی رات کانفرنس کے کھلے اجلاس میں انکے خلاف عدم اعتماد کا ریزولیشن پاس کیا گیا۔ بعد میں مجھے معلوم کر کے بے حد صدمہ ہوا کہ بی۔ این۔ راؤ کی علیحدگی محض ہمارے سالانہ اجلاس کی بنا پر عمل میں آئی تھی۔ مہاراجہ نے گزشتہ سال بھی پونچھ میں انعقاد اجلاس کی مخالفت کی تھی۔ چونکہ قائداعظم سرینگر میں تشریف رکھتے تھے۔ اس لئے ہم نے سالانہ اجلاس پونچھ کے بجائے سرینگر میں رکھ لیا تھا اور یوں یہ معاملہ ٹل گیا تھا۔ اس دفعہ پھر مہاراجہ نے راولاکوٹ میں اجلاس کی مخالفت کی راؤ پہلے تو ڈٹے رہے لیکن مہاراجہ کو بتائے بغیر مجھ سے کہہ کر مقام اجلاس پونچھ میں منتقل کروا دیا۔ مہاراجہ نے پونچھ خاص کیلئے بھی راؤ سے اتفاق نہ کیا بلکہ ان کو مجبور کیا کہ وہ ہمارے اجلاس کو قانوناً روک دیں۔ راؤ نے صاف انکار کر دیا اور اسی وجہ سے انہیں مستعفی ہونا پڑا۔

سر بی۔ این۔ راؤ اس سے پہلے سر مہاراج سنگھ دونوں وزیراعظم مسلم کانفرنس کے ساتھ (ڈرتے ڈرتے) تھوڑا بہت انصاف کرنا چاہتے تھے۔ لیکن دونوں اسی انصاف پسندی کی بھینٹ چڑھ گئے۔

کاک نیشنل کانفرنس اور ہم :-

کاک کے وزیراعظم بننے پر نیشنل کانفرنس نے خوشی کے شادیانے

بجائے۔ گھی کے چراغ جلائے اور اسے ''مسیح کشمیر'' اپنا اور پہلا کشمیری وزیراعظم اور جانے کیا کیا کہہ کر بانس پر چڑھانے کی کوشش کی۔ حالانکہ ۱۹۳۸ء میں شیخ عبداللہ کی گرفتاری صرف کاک کیخلاف (جو اس وقت چیف سیکرٹری تھا) ایجی ٹیشن کی بنا پر ہوئی تھی۔ ریاستی مسلمانوں میں مسلسل پندرہ بیس سال تک مختلف اتار چڑھاؤ دیکھنے اور عملی سیاسی کی چکی میں پسنے کی وجہ سے اتنا شعور پیدا ہو گیا تھا کہ اب وہ دور کی سوچ سکتے تھے۔ شیخ عبداللہ کی مجبوری ظاہر تھی۔ مسلمانوں میں نیشنل کانفرنس اعتماد کھو چکی تھی ہندو اس پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ اس لئے ان کی زندگی کالے دے کے یہی سہارا رہ گیا تھا کہ وہ تعاونی بن جائیں۔ چنانچہ انہوں نے کاک کو ہر طریقے سے اپنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ لیکن اس کا ردعمل بھی ہمارے لئے بہت اچھا اور خوشگوار ہوا اور ہم نے پھر لوگوں کو اصل صورتحال سے آگاہ کرنے اور نیشنل کانفرنس کی ''کاک نوازی'' یا ''کاک پرستی'' سے پورا فائدہ اٹھانے کی خاطر دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ زیادہ تر پاکستان کا پروپیگنڈا بھی پیش نظر تھا۔

اسی سلسلہ میں مجھے ریاسی جانا پڑا۔ جہاں مقامی مسلم کانفرنس نے علاقہ بھر اور باہر کے کارکنوں کا کنونشن اور تبلیغی کانفرنس کا اعلان کیا تھا اور غازی محمود دھرم پال کو اس تقریب میں دعوت دے کر وہاں کی مقامی بااثر ہندو آبادی کو بھی ایک قسم کی دعوت مبارزت دے دی تھی۔ علاقہ کی عام فضا اسے قبل ہندوؤں کی معاندانہ حرکتوں سے پہلے ہی سخت مکدر اور مسموم ہو چکی تھی۔ کٹرہ سے ریاسی کوئی بارہ میل ہو گا۔ میں، میرے چند ساتھی اور مقامی دوست شام کے قریب جموں سے کٹرہ پہنچے۔ برسات کا

موسم تھا۔ ہمیں چار و ناچار اس وقت پیدل سفر کرنا پڑا۔ رات سخت اندھیری تھی۔ آگے بیاباں ہی بیاباں تھا۔ راستہ زہریلے سانپوں سے بھرا تھا اور شروع سے لیکر آخر تک خالص ہندو آبادی پر مشتمل۔ ریاسی سے اس طرف دو میل کے فاصلہ پر بیچ میں ایک بہت بڑا نالہ پڑتا ہے اور اسے عبور کر کے ریاسی پہنچنے کیلئے مسلسل چڑھائی ہے۔ ہم نالہ پر رات کے بارہ بجے پہنچے اور ابھی نالہ کے وسط میں ہی تھے کہ پہلے ایک طرف مدھم سی روشنی ہوئی اور پھر ہم پر بندوق کے متواتر دو فائر ہوئے۔ لیکن بغیر کسی گھبراہٹ کے ہم دو بجے کے قریب ریاسی پہنچ گئے۔ دوسرے دن جلسہ ہوا لیکن اس واقعہ کا میں نے عمداً ذکر نہ کیا۔ پولیس نے تحقیقات کرنی چاہی لیکن میں نے بیان دینے سے انکار کر دیا۔

میرا عندیہ دراصل یہ تھا کہ اس طرح اس واقعہ کو شہرت ملے گی اور مسلمانوں میں اشتعال اور مایوسی اپنی اپنی جگہ دونوں حالتیں پیدا ہو جائیں گی اور اسکے علاوہ تحقیقات وغیرہ کا نتیجہ بھی کچھ نہ ہوگا۔ ریاسی نے جموں واپس آتے ہوئے ہمیں ایک سکھ ڈرائیور کے ساتھ سفر کرنا پڑا۔ جس نے راستے میں شدید قسم کا حادثہ کر دیا۔ لیکن پہلے بندوق کے فائر سے اور اب اس حادثہ سے ہم بال بال بچ گئے۔ یہ حادثہ ڈرائیور کے شرابی ہونے کی وجہ سے پیش آیا۔ اسی لئے عقل مندوں کا قول ہے کہ شراب اور پٹرول آپس میں نہیں مل سکتے۔ سیاسی دوروں کے اسی سلسلے میں پھر کشتواڑ جانا ہوا۔ یہ سخت قسم کا پہاڑی علاقہ جموں سے کوئی دو سو میل دور ہے۔ اور اس کی آخری سرحدیں چین سے ملتی ہیں۔ دریائے چناب بھی کہیں اس کی سرحدوں کے پار سے آتا ہے۔ کشتواڑ میں نے جب کبھی سفر کیا۔ ہر دفعہ سخت مصیبت

کا سامنا کرنا پڑا اور اب کے بھی یہی صورت پیش آئی۔ ہم نے کشتواڑ سے ڈوڈہ کا سفر ایک نئے دشوار گذار اور غیر معروف راستے سے اختیار کیا۔ دوسرے دن صبح چار بجے چل کر ہم دو بجے دوپہر راستہ کی سب سے اونچی چوٹی پر پہنچے جو تقریباً چودہ ہزار فٹ بلند ہوگی۔ یہاں ہم نے دوپہر کا کھانا کھانے کیلئے پانی کی تلاش شروع کی۔ اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ پہلے واقعہ کی طرح دیکھتے دیکھتے پانچ چھ منٹ کے اندر اندر موسلا دھار بارش شروع ہو گئیں۔ کشتواڑ سے ہمارے ساتھ جو پیش رو آئے تھے وہ بھی راستہ سے ناواقف تھے۔ ہم کھانا وغیرہ بھول گئے اور سفر پھر شروع کر دیا۔ لیکن بدقسمتی سے راستہ بھول گئے۔ اور گھنٹوں لگاتار بارش میں ادھر ادھر بھٹکتے رہے۔ ہمیں بارہ ہزار فٹ نیچے جانا تھا۔ قصہ مختصر رات کے دس بجے ایک پہاڑی مکان نظر آیا وہاں مرد کوئی نہ تھا۔ پہلے تو عورت نے پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن ایک گھنٹے کے تکرار کے بعد وہ بہ امر مجبوری رضامند ہوگئی۔ مکان کا ایک ہی کمرہ تھا جو انسان خانہ بھی اور مویشی خانہ بھی۔ سفر کی تھکان، فاقہ کشی اور سردی کی وجہ سے ہماری حالت بالکل نمونیہ کے مریضوں کی سی ہو رہی تھی۔

اس پر طرہ یہ کہ مکان کھٹملوں اور پسوؤں سے بھرا ہوا تھا جو رات بھر ایک لحہ کیلئے بھی ہماری میزبانی سے غافل نہ ہوئے۔ صبح جب ہم نے سفر کرنا چاہا تو کل کے سفر اور بارش کی خطرناکی کا علم ہمیں اس بات سے ہوا کہ چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کے قریباً تمام پل اور اکثر راستے ٹوٹ کر بہہ گئے تھے اور محکمہ جنگلات کے لاکھوں کی مالیت کے گودام نذر سیلاب ہو گئے تھے۔

جس طرح قید صرف صبر استقلال سے کاٹی جاسکتی ہے، ذرا جی

چھوڑا تو طبیعت کا سنبھلنا کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی اور جس طرح سچی قیادت کے لئے خلوص نیت وعمل، رسوخ عزم وایمان اور عوام کے ساتھ دلی ہمدردی اور باہمی اختلاط واعتماد ضروری ہے اسی طرح لمبا اور مشکل سفر بھی صرف عزم وثبات ہی سے کٹ سکتا ہے۔ اگر منزل کی دوری سے ذرا بھی وحشت اور گھبراہٹ پیدا ہو جائے تو آگے ایک قدم اٹھانا ناممکن ہے۔ شروع شروع میں مجھے سفر سے بے حد وحشت ہوتی تھی لیکن بعد میں ہزاروں میل پہاڑی پیدل سفر کیا ہے اور ایک دفعہ ایک دن میں برابر چالیس میل پیدل سفر میرا ریکارڈ ہے۔ اسی تجربہ کی وجہ سے سفر کی طوالت یا سنگینی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ متذکرہ سفر نے ہماری کمر توڑ دی۔

پچیسواں باب

تحریک ''کشمیر چھوڑ دو''
اور آزاد کشمیر

۱۹۴۶ء کے آغاز میں کاک کو ابھی پرائم منسٹر بنے چھ سات ماہ گزرے تھے کہ اس کی اور شیخ عبداللہ کی ٹھن گئی۔ یہ پھوڑا اندر ہی اندر پک تو چکا تھا لیکن پھوٹا اس وقت جب نیشنل کانفرنس کے فیصلے کے ماتحت مسلمان ''پاپولر'' منسٹر مستعفی ہوگیا اور کاک نے نیشنل کانفرنس کے ایک اور اسمبلی ممبر کو سیاسی جوڑ توڑ کر کے منسٹری کے عہدہ پر نامزد کر دیا۔ اس واقعہ نے نیشنل کانفرنس کے حلقوں میں آگ لگا دی۔ لیکن کاک، جس کے ساتھ کل تک نیشنل کانفرنس کی دوستی کی پینگیں بڑھی ہوئی تھیں، شیخ صاحب کے مزاج اور ہتھکنڈوں سے واقف تھا۔ اسلئے نیشنل کانفرنس اس کو خوفزدہ نہ کر سکی اور کانفرنس کا یہ آخری سہارا بھی ہمیشہ کیلئے ٹوٹ گیا۔

شیخ صاحب کے کمیونسٹ دوست جن میں مسٹر بیدی، ڈاکٹر اشرف اور تاثیر مرحوم پیش پیش تھے، شیخ صاحب کا یہ انجام گوارا نہ کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے نیشنل کانفرنس کیلئے ''کشمیر چھوڑ دو'' کا نعرہ تجویز کیا۔ ساتھ ہی ''نیا کشمیر'' کے نام سے اس جماعت کا انقلابی منشور بھی تیار کر کے شیخ صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا۔

تحریک ''کشمیر چھوڑ دو'' کا پس منظر:۔

شیخ صاحب کی اس تحریک کا پس منظر جس نے ہندوستانی سیاست میں

ایک ہنگامہ اور سنسنی پیدا کردی اور جس کی رو میں اپنے اور بیگانے سب بہہ گئے سمجھنے کیلئے چند مندرذیل نکات یاد رکھنے چاہئے:۔

۱۔ ریاستی مسلمان ہندوستانی مسلمان کا ہمسایہ اور سیاسی ہم خیال اور ڈوگرہ ہندو ذہنیت کا قرنوں سے شکار ہونے کی وجہ سے طبعاً خالص اسلامی سیاست اور تنظیم کا حامی تھا۔ اسلئے شیخ صاحب کا نیشنلزم اسے اپنی طرف نہ کھینچ سکا۔

۲۔ ادھر ریاستی ہندو نے شیخ صاحب کا ساتھ دینے سے بلاتامل انکار کردیا۔ ادھر شیخ صاحب نے کانگریس کے حق میں اور مسلم لیگ کیخلاف نعرے لگا کر ریاستی مسلمانوں میں اپنے آپ کو بے حد غیر ہر دلعزیز اور کمزور کرلیا۔

۳۔ ترویج ہندی، گاؤ کشی کی سزا قانون اسلحہ اور ایسے متعدد معاملات میں، جو مسلمانوں کی غیرت ملی کیلئے چیلنج تھے، نیشنل کانفرنس نے عملی طور پر ہندوؤں اور حکومت کا ساتھ دینے کی کوشش کی۔

۴۔ اسمبلی سے نیشنل کانفرنس گروپ کا مستعفی ہو کر پھر نامزد ہو جانا، "ڈائی آرکی" میں حکومت کی کوشش سے منسٹری حاصل کرنا، حکومت کی شہ پر مسلمانوں کے ساتھ دست بگریباں ہونا، بعد میں کاک ایسے شخص کی تعریف و خوشامد کرنا جسے (دوسرے عیوب سے قطع نظر) شیخ صاحب نے پہلے خود کنڈم کیا تھا، نیشنل کانفرنس کے اثر و نفوذ پر ایک ضرب کاری تھی۔ ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک شیخ صاحب مسلسل حکومت کے حاشیہ بردار رہے۔

۵۔ نیشنل کانفرنس کی کانگریسی دوستی اور مسلم لیگ دشمنی، پاکستان کی مخالفت اور متحدہ قومیت کی حمایت اور پھر کبھی اپنے آپ کو نیشنلسٹ، کبھی کمیونسٹ اور کبھی مسلمان ظاہر کرنا اور کبھی بیک وقت تینوں پہلو اختیار کرلینا اپنوں اور بیگانوں کیلئے نفرت و بیزاری کا باعث بن گیا۔

۶۔ قائداعظم کی کشمیر میں آمد، حکومت کی طرف سے مسلم کانفرنس کو کچلنے کیلئے اعلانیہ اور مسلسل کوشش، اور سب سے بڑھ کر نامساعد حالات کے باوجود نیشنل کانفرنس کے سیاسی اِنحطاط کے مقابلہ پر مسلم کانفرنس کی تنظیمی سرگرمی اور عوام سے متواتر براہ راست روابط نے نیشنل کانفرنس کے وجود کو ۱۹۴۶ء میں عملی طور پر ختم کر دیا تھا۔

متذکرہ صدر اور متعدد دیگر وجوہ کی بنا پر شیخ صاحب کیلئے اب ریاست میں کوئی قابلِ فخر سیاسی پوزیشن نہیں رہی تھی ۔ چنانچہ ان کو نیا نعرہ اور نیا منشور دینے والے دوستوں نے ساتھ ہی جیل جانے کا مشورہ دیا۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ شیخ صاحب کی طبیعت جیل کے معاملہ میں ہمیشہ کمزور رہی ہے اور ایک دفعہ کے سواوہ ہمیشہ چور دروازے ہی سے جیل سے باہر نکلتے رہے ہیں۔

یادرہے کہ شیخ عبداللہ میں اس کمزوری کے علاوہ دنیا کے دوسرے سیاسی کارکنوں کی طرح اور بھی بہت سے سیاسی کمزوریاں رہی ہیں ۔ لیکن خدالگتی بات یہ ہے کہ ان کا روشن پہلو بھی اپنی جگہ بہت نمایاں رہا ہے۔ اور جب تک وہ ہمارے نقطہ نگاہ سے سیاسی حیثیت میں زندہ رہے، بہت بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ برہمن کی چوکھٹ پر "شیخ" کے صرف ایک سجدہ نے ان کو کہیں کا نہ رکھا۔ انہوں نے دنیائے اسلام چھوڑ دی لیکن اپنی مصلحتوں کیلئے بھارت کو نہ چھوڑا۔ دیکھنا اب یہ ہے کہ پنڈت جواہر لعل نہرو کے ذاتی التفات کے باوجود بھارت کب انکو چھوڑتا ہے۔ یہ مقام بھی دیدنی اور عبرت ناک ہوگا ۔ خدا کرے یہ جلد آئے تاکہ باوجود اپنے ماضی کے شیخ عبداللہ پاکستان کی اسلامی مروت، نیک نیتی اور وسعتِ قلبی کے اس طرح براہِ راست قائل ہوسکیں۔

۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک ہم دونوں نے ایک پلیٹ فارم پر ایک

مقصد کیلئے ایک جذبہ کے ساتھ کام کیا۔ یہاں تک کہ ان دنوں ہمارا اُٹھنا، بیٹھنا، سوچنا اور عمل کرنا قریباً ایک ساتھ ہوا کرتا تھا اور یہ عجیب بات ہے کہ اس لمبے عرصے میں ہمارے درمیان کسی اصولی یا فروعی معاملہ میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ مجھے صرف ایک ہی اختلافی واقعہ یاد ہے اور وہ یوں ہے کہ ایک دفعہ توہینِ مذہب کے کسی شاخسانہ کے سلسلہ میں میرواعظ محمد یوسف صاحب نے کشمیری پنڈتوں کیخلاف محاذ قائم کردیا۔ بات اس حد تک طول کھینچ گئی کہ حکومت نے میرواعظ کو گرفتار کرلیا۔ میرواعظ ان دنوں مسلم کانفرنس میں شامل نہ تھے۔ بلکہ ۱۹۳۲ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک وہ اس سے الگ رہے۔ شیخ عبداللہ مولانا محمد یوسف کو ان کی گرفتاری کے بعد اعلانیہ مطعون کرنا چاہتے تھے۔ میں اس بات کا شدت سے مخالف تھا۔ لیکن دس گھنٹے مسلسل بحث کے بعد آخر شیخ عبداللہ مجھ سے متفق ہوگئے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جب بخشی غلام محمد اور ان کے ساتھیوں کو اس فیصلے کا علم ہوا تو وہ برہم ہوگئے اور انہوں نے شیخ عبداللہ کو اپنا ہمنوا کرلیا۔ اسی رات جلسہ عام میں شیخ عبداللہ نے میرواعظ کو کھلے بندوں کنڈم کردیا۔ چونکہ شیخ عبداللہ اور بخشی غلام محمد سے اس بارے میں میری سخت نوک جھونک ہوچکی تھی اسلئے میں نے اس جلسہ میں حصہ نہ لیا۔ مجھے یقین تھا کہ شیخ عبداللہ کے اس فعل سے کم از کم سرینگر میں مسلم کانفرنس کی ساکھ اور ہردلعزیزی کو صدمہ پہنچے گا۔ کیونکہ میرواعظ کی گرفتاری مذہبی توہین کے واقعہ کی وجہ سے عمل میں آئی تھی۔ اسی لئے دوسرے دن صبح میں مخالفانہ ردعمل کا منتظر تھا کہ یکایک شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ میرواعظ کوتوالی سے گرفتاری کے تیسرے دن ہی پولیس کی بدسلوکی کی وجہ سے معافی مانگ کر گھر پہنچ گئے ہیں۔ اس کا ردعمل وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھے۔ شیخ عبداللہ نے بغلیں بجائیں اور میرواعظ پارٹی

بالخصوص اس واقعہ کے بعد برسوں تک بغلیں جھانکتی رہی۔

ہندوستان میں گاندھی کی تکنیک کے رو سے سول نافرمانی اور قید، سیاست یا قیادت کی ہر کمزوری اور خرابی کا درماں سمجھی جاتی رہی ہے۔ شائد اس خیال کے تحت کہ اس طریق کار سے عوام کے دلوں میں ہمدردی اور ہر دلعزیزی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور انسان ہیرو بن جاتا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے شیخ صاحب کے معاملہ میں پانی سر سے گذر چکا تھا۔

شیخ صاحب نے جیل جانے سے قبل مسلم کانفرنس سے سمجھوتہ کرنا چاہا لیکن بات اس کلیہ کے ماتحت اسلئے نہ بن سکی کہ دو نیکیاں یا عارضی طور پر دو بدیاں تو ایک جگہ جمع ہو سکتی ہیں لیکن کسی رنگ اور کسی حالت میں نیکی اور بدی کا اکٹھا ہو جانا ممکن نہیں ہو سکتا۔

نیشنل کانفرنس نے مئی ۱۹۴۶ء میں تخلیہ کشمیر کا نعرہ بلند کر دیا اور لوگوں کو "نیا کشمیر" سے متعارف کرانے کیلئے سرینگر میں جلسے شروع کر دیئے۔ حکومت نے نیشنل کانفرنس کو کافی ڈھیل دی لیکن بعد میں بیک وقت اسکے تمام چیدہ کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔ شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد ہفتہ عشرہ تک کسی ہندو یا مسلمان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ لیکن پنڈت نہرو کی گرفتاری، کانگریس کی طرف سے مالی پشت پناہی، اور کمیونسٹوں کی انڈر گراونڈ منظم تحریک نے جس میں مسٹر غلام محی الدین صدر ڈسٹرکٹ نیشنل کانفرنس نے واقعی بے مثال اور قابل تعریف کام کیا تھا۔ نیشنل کانفرنس کی تحریک میں کچھ جان ڈالی۔ ساتھ ہی نیشنل کانفرنس کے چند چوٹی کے کارکن بخشی غلام محمد کی معیت میں چوری چھپے ہندوستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور لاہور میں مستقل ڈیرے ڈال کر انہوں نے لیگی پریس اور متعدد سر برآوردہ لیڈروں کو ہم خیال بنا لیا۔

"کشمیر چھوڑ دو" کے نعرے کی دلفریبی کے باوجود مسلم کانفرنس کی پوزیشن غیر متاثر رہی۔ لیکن دقت یہ ہوئی کہ پنجاب کے اسلامی پریس نے اس تحریک کی کھلے بندوں حمایت شروع کر دی۔ "زمیندار" نے تو متعدد افتتاحیوں میں مسلم کانفرنس کو رجعت پسندی کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔ لیکن "نوائے وقت" "انقلاب" اور "احسان" نے بھی کافی کچھ لکھا۔ تحریک کا انڈر گراؤنڈ کام اتنا باقاعدہ تھا کہ پنجاب کے تمام مسلم اخبارات کی کاروائی سرینگر میں روزانہ منظر عام پر اشتہاروں اور ٹریکٹوں کی صورت میں آجاتی تھی۔ اس صورتحال نے ہمیں تشویش میں ڈال دیا۔

اندریں حالات ہم نے بمقام سرینگر ۹ رجون کو مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا اور متعدد اہم فیصلے کیے جو کم از کم ریاستی مسلمانوں کیلئے سو فی صد وجہ اطمینان ہوئے۔ تین قراردادیں یہاں درج کی جاتی ہیں تاکہ تحریک تخلیہ کشمیر کے سمجھنے میں سہولیت ہو سکے۔

قرارداد نمبر ۲:۔

مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ نے صدر نیشنل کانفرنس کے مطالبہ "کشمیر چھوڑ دو" پر غور کیا ہے۔ قانونی اور آئینی اعتبار سے معاہدہ امرتسر کی تنسیخ کے جواز وعدم جواز سے قطع نظر پنڈت جواہر لال نہرو صدر منتخب ہندو کانگریس نے صدر نیشنل کانفرنس کے اس نعرہ کی جو مخالفت کی ہے اور اس ضمن میں پنڈت نہرو نے تمام ہندوستانی ریاستوں کے تعلق میں کانگریسی پالیسی کی جو وضاحت کی ہے نیز قائم مقام صدر نیشنل کانفرنس نے پنڈت نہرو سے حال ہی میں متعدد ملاقاتیں کرنے کے فوراً بعد جو بیان گلوب نیوز ایجنسی کی وساطت سے دہلی میں پریس کو دیا پھر اسکے ساتھ ہی شیخ عبداللہ صدر نیشنل کانفرنس نے جیل سے ایک

خط کے ذریعے اپنے مقدمے کی پیروی اور ڈیفنس کے سلسلہ میں پنڈت نہرو کو مختار مطلق قرار دیا ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ نیشنل کانفرنس ''کشمیر چھوڑ دو'' کے نعرے کو کلیتہً ترک کر رہی ہے اور تو اور جیسا کہ اس وقت تک اس نعرہ کو نیشنل کانفرنس کی جانب سے آفیشل پوزیشن بھی حاصل نہیں اور اس تحریک کی سرپرستی اور رہنمائی کلی طور پر ہندو کانگریس کے لیڈروں کے ہاتھوں میں دی گئی ہے اور اس نعرہ کے موجودہ محرک بھی خود جیسا کہ ڈانوں ڈول ہیں۔ انکی پالیسی اس ضمن میں قطعی اور یقینی نہیں اور وہ ہندو کانگریس کے لیڈروں کی جانب سے کی گئی ''کشمیر چھوڑ دو'' کی نئی تعبیریں اپنا رہے ہیں۔ مسلم کانفرنس کیلئے اس معاملہ میں کسی رائے کا اظہار قبل از وقت ہے۔

قرارداد نمبر ۴:۔

ریاست جموں و کشمیر کے مسلمانوں کو موجودہ حکومت کے خلاف شروع ہی سے سنگین قسم کی شکایات چلی آئی ہیں جن کو رفع کرنے کیلئے انہوں نے مسلسل جدوجہد یا ور ہر قسم کی قربانیاں بھی دیں۔ لیکن بدقسمتی سے حکومت نے مسلمانوں کی تالیف قلوب کی کبھی بھی کوشش نہ کی۔ بلکہ اُس کا رویہ روز بروز بد سے بدتر ہوتا گیا۔ یہ وہ تلخ حقیقت ہے جس کا اعتراف خود ریاست کے بعض سابق غیر مسلم وزراء اعظم بھی کر چکے ہیں مسلمانوں کی حق تلفی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ڈوگرہ حکومت کے قیام کو اب پوری ایک صدی گذری ہے۔ ان سو سالوں میں اٹھتیس آدمیوں کو وزیر اعظم نامزد کیا گیا ہے اور حد یہ ہے کہ ان میں ایک بھی مسلمان نہ تھا۔ مسلمانانِ ریاست نے اس کے باوجود پھر بھی وفاداری کے پھندے کو اپنے گلے سے اتارنے کی کوشش نہ کی اور بہتر حالات کی توقع پر وہ خون کے گھونٹ پیتے رہے لیکن اب جب کہ پانی سر سے اونچا ہو چکا

ہے مجلس عاملہ قرار دیتی ہے کہ اگر اس نے گذشتہ سو سال مسلم آزاد پالیسی میں تبدیلی نہ کی تو مسلمان مجبور ہوں گے کہ وہ حکومت کو اس جانبدارانہ پالیسی سے دست کش کرانے کیلئے وہ تمام ذرائع عمل میں لائیں جو ان کے اختیار میں ہیں۔ مجلس عاملہ حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی مندرجہ ذیل شکایات کو بغیر کسی تاخیر کے جلد از جلد رفع کرے۔

ا۔ گاؤ کشی کے جرم کی پاداش میں دس سال قید بامشقت کی سزا کو منسوخ کر دیا جائے۔

۲۔ تبدیلی مذہب پر نو مسلم جائیداد ضبط کرنے اور اس کی بیوی بچوں کو جبراً چھین لینے کے وحشیانہ قانون کو منسوخ کر دیا جائے۔

۳۔ قانون اسلحہ میں جس کی رو سے صرف ہندو راجپوتوں کو آتشیں اسلحہ اور گولہ بارود رکھنے کی اجازت دی گئی ہے اس طرح ترمیم کی جائے کہ تمام اقوام پر ایک جیسی پابندیاں ہوں اور یا سب کو ایک جیسی رعایتیں حاصل ہوں۔

۴۔ ہندی کی جبری ترویج کے احکامات واپس لئے جائیں۔

۵۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو تناسب آبادی کی بنا پر نمائندگی دی جائے اور کلیدی اسامیوں میں ان کی افسوسناک کمی کو فی الفور پورا کیا جائے۔ ریاستی افواج کی نو پیدل پلٹنوں اور ایک گھوڑا سوار رجمنٹ میں صرف ڈیڑھ پیدل پلٹن مسلمانوں پر مشتمل ہے ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ریاستی افواج میں مسلمانوں کو تناسب آبادی کے لحاظ سے بھرتی کیا جائے۔ نیز کشمیری مسلمانوں کو بھی ملٹری کی ملازمت کا اہل قرار دیا جائے۔

۶۔ مسلمانوں کی شہری آزادی کو مفلوج کیا گیا ہے۔ بالخصوص ڈیفنس رولز کے بے رحمانہ استعمال اور مسلم اخبارات پر سخت گیرانہ پابندیوں کو فی الفور

منسوخ کر دیا جائے۔

مجلسِ علاملہ قرار دیتی ہے کہ اگر حکومت کشمیر نے بلا تاخیر مسلمانوں کے ان کم سے کم مطالبات کو پورا نہ کیا تو مسلم کانفرنس ڈائرکٹ ایکشن لینے پر مجبور ہوگی۔ بنابریں مجلس عاملہ مجلس عمل کی اختیار دیتی ہے کہ وہ ایسی صورت میں براہ راست اقدام کا پروگرام مرتب کرے اور عوام کو اس پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرے۔ یہ اجلاس مسلم عوام سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اس غرض کیلئے ابھی سے ہر قسم کی قربانی کیلئے تیار ہو جائیں۔

قرار داد نمبر ۶:۔

''نیشنل کانفرنس کے مسلم زعماء اور مسلم کانفرنس کے نمائندگان کے مابین کئی ماہ تک مصالحت کی گفتگو ہوتی رہی اور نظر بظاہر اس نقطہ پر اتفاق رائے ہو گیا تھا کہ نیشنل کانفرنس چونکہ آٹھ سال کی متواتر جدو جہد کے باوجود مسلمانوں کے مفادات پس پشت ڈال دینے کے باوجود ہندوؤں کا تعاون حاصل نہیں کر سکی۔ اس لئے نیشنلزم کے ڈھونگ کو ختم کر دیا جائے اور نیشنل کانفرنس کے سارے مسلمان ممبر مسلم کانفرنس میں شامل ہو جائیں۔ اس نقطہ کو نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے قریباً بھی مسلمان ممبروں کی ظاہر طور پر تائید حاصل تھی اور ان کے کہنے کے مطابق شیخ محمد عبداللہ بھی ان سے متفق تھے۔ لیکن جب یہ بات چیت آخری مرحلہ میں داخل ہوئی اور متفقہ اعلان کا وقت آیا تو نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبرں نے محسوس کیا کہ انہیں شیخ محمد عبداللہ کا تعاون حاصل نہیں رہا۔ کیونکہ شیخ صاحب اور ہندو کانگریس کے صدر منتخب پنڈت جوہر لعل نہرو کے درمیان جو عہد و پیمان موجود تھا وہ سمجھوتہ کی راہ میں زبردست رکاوٹ بن گیا ہے۔ اس نئی صورت حالات میں نیشنل کانفرنس کی

روش یکسر بدل گئی۔ اس لئے کہ وہ شیخ عبداللہ کی مرضی کے خلاف پہلی بات پر قائم رہنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ یا وہ ایک پراسرار ڈرامہ میں محض اداکاروں کی حیثیت سے کام کررہے تھے اور یہ ساری بات چیت ان کی اداکاری کا ایک حصہ تھی جسکا مطلب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ جن لوگوں کیخلاف وہ گذشتہ آٹھ سال سے حکومت کے آلہ کار بن کر ہلڑبازی اور تشدد کرتے چلے آئے تھے ان کے جذبہ اتحاد بین المسلمین کا ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں کچھ وقت کیلئے احمق بنا سکیں اور ان کے خیمہ برداروں کا کام لے سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ گفتگوئے مصالحت میں طے ہو چکا تھا اور مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے واضح طور پر اعلان کیا جا چکا تھا کہ مصالحت کا متفقہ اعلان نہ کیا جائے نیشنل کانفرنس نے کوئی تحریک شروع کی تو مسلم کانفرنس اس میں شمولیت کی ذمہ دار نہ ہوگی۔ لیکن اس کے باوجود نیشنل کانفرنس نے بالا بالا ہی "تخلیہ کشمیر" کی تحریک شروع کی۔

مجلس عاملہ گفتگو مصالحت کی تفصیلات پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ اس گفتگو میں جہاں تک نیشنل کانفرنس کا تعلق ہے صرف سیاسی داؤ پیچ کے ہتھکنڈے مضمر تھے۔ مجلس عاملہ کو یہ نتیجہ نکالنے میں پنڈت نہرو کے بیانات سے بھی کافی روشنی ملی ان کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر جب کہ نیشنل کانفرنس کے زعماء مسلمانوں کا متحدہ محاذ قائم کرنے کیلئے مسلم کانفرنس سے صلح کی بات چیت مکمل کررہے تھے اس کے دوش بدوش پنڈت نہرو سے شیخ صاحب عہد و پیمان باندھ رہے تھے اور انہیں اپنی غیر مشروط وفاداری کا یقین دلا رہے تھے۔ اگر "کشمیر چھوڑ دو" کی تازہ تحریک کے اتار چڑھاؤ کو بھی مدنظر رکھا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ نیشنل کانفرنس کی دورنگی کچھ مسلم کانفرنس ہی سے مخصوص نہیں تھی بلکہ یہ ہوشیار لوگ خود نہرو جی سے بھی کھیل رہے تھے۔

کیونکہ ایک طرف شیخ صاحب نے اپنے مقدمے کا ڈیفنس پنڈت جی کو سونپ دیا ہے دوسری طرف نیشنل کانفرنس کے انڈر گراؤنڈ کارکن صرف کیمونسٹ پارٹی کی ہدایات اور رہنمائی پر پوری پابندی سے عمل پیرا ہیں اور انہیں یقین دلا چکے ہیں کہ وہ اپنی قسمت کیمونسٹ پارٹی سے وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات نیشنل کانفرنس کے قائم مقام صدر کی ہے جو مسلم کانفرنس کے نمائندوں سے ہمیشہ اتحاد بین المسلمین کے بہت بڑے خواہشمند کی حیثیت سے ملتے رہے۔ پنڈت نہرو کو انہوں نے ہمیشہ ایک سچے کانگریسی کی حیثیت سے چالیس لاکھ باشندگانِ ریاست کی وفاداری کا یقین دلایا اور کیمونسٹ پارٹی کے مہمان کی حیثیت سے تو اپنے آپ کو انہی میں سے ظاہر کرتے ہیں۔ قائم مقام صدر (بخشی غلام محمد) نے بیک وقت تین کشتیوں میں سوار ہو کر ان توقعات کو پورا کیا ہے جو شیخ عبداللہ کا جانشین ہونے کی حیثیت میں شیخ صاحب ان سے رکھ سکتے تھے۔ مجلس عاملہ ان ساری باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسی نتیجہ پر پہنچی ہے کہ شیخ محمد عبداللہ اور ان کے رفقاء بدستور دشمن اسلام عناصر کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں اور پنڈت نہرو تحریک رابطہ مسلم عوام (Muslim Mass Contact) کے اصول کے تحت ان کی تائید وحمایت اس لئے کر رہے تھے تاکہ صوبہ سرحد سے ملحق ایک ایسی مسلمان ریاست کو جو رقبے اور آبادی کے لحاظ سے صوبہ سرحد سے ڈیڑھ گناہ بڑی ہے اپنے ڈھب پر لا کر کشمیر اور سرحد کا ایک مضبوط مخالف پاکستان کانگریسی بلاک بنا سکیں اور اس طرح مرکزی آئین ساز اسمبلی میں مسلمانوں کے کوٹہ میں سے چھ نشستیں ہتیا لینے میں کامیاب ہوں اور اس کانگریسی زدہ مسلم بلاک کو شمال مغربی پاکستان کی پیٹھ پر کاربنکل پھوڑے کی حیثیت سے قائم رکھ سکیں۔ برعکس اس کے کیمونسٹ پارٹی جو ہندوستان کے کسی

صوبے میں بھی مضبوط طور پر اپنے قدم نہیں جما سکی وہ نیشنل کانفرنس لیڈروں کی موقع پرستی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر کشمیر میں اپنا اثر ونفوذ قائم کرے اور اس کے بعد ہندوستان پر جست لگانے کیلئے روس کے ہمسایہ اشتراکی کشمیر کو اڈے (SPRING BOARD) کی حیثیت سے استعمال کر سکے۔

شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھی آگے چل کر سچے دل سے کانگریس کا ساتھ دیں گے یا کیمونسٹ پارٹی کا یہ وہی بہتر جان سکتے ہیں۔ لیکن اتنا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا فکر وعمل مسلم سواد اعظم کے خلاف اور وحدت اسلامیہ کیلئے تباہ کن ہے ان حالات میں جب تک کہ وہ آدھے کانگریسی اور آدھے کیمونسٹ ہیں مسلمان ان کا ساتھ دے کر کشمیر کو پاکستان کا آذربائیجان یا ہندوستان کا دوسرا صوبہ سرحد نہیں بنانا چاہتے۔

بنابریں مجلس عاملہ شیخ محمد عبداللہ صاحب کی پالیسی کو مسلمانوں کیلئے تباہ کن قرار دیتی ہے البتہ اگر اب بھی وہ غیر مسلموں کی سرپرستی کو ترک کر کے اپنی سیاسی خواہشات کو دس کروڑ مسلمانوں کی متفقہ رائے کی تابع کر دیں تو مسلم کانفرنس آج بھی انہیں اپنانے کیلئے تیار ہے"

ان قراردادوں کے مطالعہ سے کم از کم آج یہ بات صاف عیاں ہے کہ مسلم کانفرنس نے "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک اور اس سلسلہ میں کانگریس کی پس پردہ سیاسی چال، ہندوستان کے آنے والے واقعات اور دوسرے کئی اہم مسائل کا ۱۹۴۶ء میں صرف ٹھیک تجزیہ ہی نہیں کیا، بلکہ عبداللہ اور ہندو انڈیا کے غلط عزائم کے متعلق مسلمانان ہندوستان کو بروقت آگاہ بھی کر دیا۔

مجلس عاملہ کے اجلاس کے اختتام پر جناب حفیظ جالندھری میری قیام گاہ پر تشریف لائے۔ ان کے میرے ساتھ پرانے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات

تھے اور مجھے شیخ صاحب کا پیغام دے کر اپنی طرف سے فرمایا کہ عبداللہ ختم ہو چکا ہے تم اس کو بچا سکتے ہو اس کیلئے کچھ کرو۔ تمام پس منظر اُن پر عیاں کرنے کے بعد میں نے متذکرہ صدر قرادادیں بغیر تمہید کے ان کے سامنے رکھ دیں جو اس وقت پریس کیلئے ٹائپ ہو رہی تھیں۔ حضرت حفیظ انہیں پڑھ چکنے کے بعد خاموش ہو گئے۔ میں نے کہا اب جو ارشاد ہو اس کی تعمیل کروں گا۔ انہوں نے مشکل سے سکوت توڑ کر فرمایا "آپ حق بجانب ہیں" اور پھر حقہ نوشی اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔

چند دن بعد میں قایدِ اعظم سے ملنے دہلی چلا گیا۔ وہ پہلے ہی اس تحریک کے خلاف تھے اور کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے فرمایا کہ میں نے تمہارے ریزولیشن پڑھ لئے ہیں۔ بالکل مناسب اور بروقت ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے سکرٹری مسٹر خورشید کے ذریعہ اس تحریک کیخلاف ایک بیان بھی لکھوایا۔

بعد میں میں مسٹر ساغر کے ہمراہ لاہور آیا اور سب سے پہلے حضرت مولانا ظفر علی خان صاحب سے ملاقات کی، جن کی سیاسیات کشمیر سے گہری سے گہری دلچسپی آغاز تحریک ہی سے مسلمہ تھی۔ مولانا اختر علی خان صاحب بھی موجود تھے۔ ہم نے شیخ محمد عبداللہ کی تحریک کے نشیب و فراز سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن اختر صاحب کشمیر کے معاملہ میں بالخصوص جذباتی رہے ہیں پہلے تو وہ پٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دیتے تھے لیکن کافی لے دے کے بعد وہ قدرے مطمئن ہو گئے۔ جناب میکش سے بھی یہی ماجرا ہوا آخر میں ہم برادرم حمید نظامی کے پاس پہنچے لیکن میرے تعجب اور افسوس کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے ان کو اس معاملہ میں دوسروں سے بھی زیادہ سخت پایا۔ ٹھنڈے دل کا مالک ہونے کے علاوہ وہ میرے گہرے دوست بھی تھے۔ دوران بحث جب میں نے قائداعظم کے حالیہ

بیان کا حوالہ دیا تو حمید صاحب نے فوراً مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ قائداعظم نے یہ بیان تمہارے ایما پر دیا ہے۔ اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ لیکن میں نے اتنی بات ان سے کہہ دی کہ آپ کے قائداعظم کے متعلق ہماری رائے بہت اونچی ہے۔ مہرو سالک کے انقلاب کا جھکاؤ ہمیشہ ہماری طرف رہا تھا۔ لیکن اس دفعہ ان دونوں بزرگوں کے تیور بھی بدلے ہوئے تھے۔

بہر حال شیخ عبداللہ نے عدالت میں پنڈت نہرو کی موجودگی میں بیان دیکر اپنی تحریک کا گلا کاٹ دیا۔ اس بیان میں انہوں نے کانگریس کے ایماء پر یہ بتایا کہ تخلیہ کشمیر کی تحریک سے اُن کا واضح مطلب یہ تھا کہ ریاست میں مہاراجہ کے زیر سایہ مکمل ذمہ دارانہ نظام حکومت قائم کیا جائے۔ مسٹر گاندھی ہم سے زیادہ ہوشیار تھے۔ انہوں نے بھانپ لیا کہ آگے چل کر مہاراجہ کی ناراضی مہلک ثابت ہوگی۔ غالباً اُسی لئے انہوں نے پنڈت نہرو کو جب وہ شیخ محمد عبداللہ کی حمایت میں گرفتار کر لئے گئے تھے مشورہ دے کر واپس بلا لیا اور اس واقعہ کے چند ہی روز بعد مہاراجہ پر ڈورے ڈال کر پنڈت جی کو باعزت طریقہ سے سرینگر بھیجا اور شیخ عبداللہ کو اپنا رویہ اور بیان تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔ ساتھ ہی شیخ محمد عبداللہ کو ہاتھ میں رکھنے کیلئے ان کی گرفتاری کے بعد پہلے بیگم عبداللہ کے پاس کرپلانی کو سرینگر بھیجا جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے۔ اور پھر خود سرینگر صرف بیگم عبداللہ سے اظہار افسوس کرنے آئے اور گھنٹوں اس کے پاس بیٹھے رہے۔ بہر حال شیخ عبداللہ کی اس خلاف توقع حرکت اور قلابازی سے ریاست کے مسلمان ان کو بالکل بھول گئے۔ لیکن بعد میں وہ اتنے یاد آتے رہے ہیں کہ اُن کو بھول جانا دنیائے اسلام کے بس کا روگ نہیں۔

ہماری تحریک خالصتاً فرقہ وارانہ تھی :-

تحریک "تخلیہ کشمیر" کے سلسلہ میں ایک اور اہم بات قابلِ ذکر ہے کہ شیخ صاحب نے اس وقت اور اُس کے بعد آج تک دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُن کی تحریک غیر فرقہ وارانہ تھی اور وہ خود روزِ اول سے پکے قوم پرست تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ شیخ محمد عبداللہ صاحب نے اپنی سیاسی زندگی ایک اشد اور کٹر فرقہ پرست کی حیثیت میں شروع کی اور جب انہوں نے تحریک کے آخری ادوار میں قوم پرستی کی قبا اوڑھی تو محض ہوا کا رُخ دیکھ کر۔ ورنہ تحریک حریت کشمیر کی ابتدا خالص فرقہ وارانہ مسائل اور مطالبات سے ہوئی۔ شیخ صاحب پہلے مسلم ایسوسی ایشن اور اسکے بعد برسوں مسلم کانفرنس کے رکن رہے۔ یہ دونوں جماعتیں اپنے اغراض و مقاصد اور عمل کے لحاظ سے ہندوؤں مسلمانوں اور حکمرانوں کی نگاہ میں فرقہ وارانہ تھیں۔ شیخ عبداللہ کے سابقہ خطباتِ صدارت، بیانات، تقریریں، ان کا فرقہ وارانہ فسادات میں علانیہ حصہ لینا، گلانسی کمیشن میں ان کا مسلمانوں کی جانب سے گواہ پیش ہو کر ہندوؤں کے خلاف ڈٹ کر بیان دینا، یہ ایسی چند باتیں ہیں جواب بھی بطور ثبوت پیش ہو سکتی ہیں۔ امر واقع یہ ہے کہ شیخ صاحب خالص اسلامی فرقہ فرستی کی سیاسی پیداوار ہیں۔ اب نیشنل کانفرنس اپنے آقاؤں کا حق چکانے کیلئے جو کچھ بھی کرے اور کہے "درست" ہے۔

چھبیسواں باب

مسلم کانفرنس کا کنونشن

چونکہ سرینگر میں جلسوں اور جلوسوں پر ابھی پابندی تھی اس لئے جولائی ۱۹۴۶ء میں مسلم کانفرنس کے کارکنوں کا وسیع ترین پیمانے پر ایک کنونشن سرینگر میں میری صدارت میں ہوا۔ اس کنونشن میں مندوبین اور دوسرے کارکن بہت زیادہ تعداد میں شامل ہوئے۔ اس موقع پر کافی غور وفکر کے بعد مسلم کانفرنس نے دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر اپنا نیا سیاسی منشور جاری کیا۔ اس کی رو سے قیام پاکستان، پاکستان کے ساتھ ریاست کا الحاق، اور ریاست میں عوام کیلئے ان کی اپنی ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کیا گیا۔ اور مہاراجہ کشمیر کیلئے صرف آئینی حکمران کا درجہ تجویز کیا گیا موجودہ آزاد کشمیر کا نعرہ بھی اس کنونشن میں نئے سیاسی منشور اور نشان کے طور پر اپنایا گیا۔ اسی نعرہ نے نیشنل کانفرنس کی کمر ہمت توڑ دی۔ ہندو اس پر بوکھلا گئے اور یہی نعرہ مہاراجہ کی موت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ کیونکہ اسی نعرہ سے ریاستی مسلمانوں کے سینوں میں نئے اور دیگر انقلابی عزائم پیدا ہوئے۔

کنونشن نے ایک ماہ بعد مظفر آباد میں سالانہ اجلاس کے انعقاد کا بھی فیصلہ کیا۔ لیکن حکومت نے اجلاس پر پابندی عائد کر دی اور ہم نے اسکی خلاف ورزی قومی مصلحت کے منافی سمجھ کر مقام اجلاس ۲۵۔۲۷ اکتوبر کو سرینگر مقرر کر دیا۔

مسلم کانفرنس کا آخری سالانہ اجلاس:۔

اجلاس سے صرف دو تین یوم پہلے سکرٹری مجلس استقبالیہ مسلم کانفرنس کو حکومت کی جانب سے اطلاع موصول ہوئی کہ دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کی وجہ سے جلسہ کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کے اراکین سرینگر میں موجود تھے میں نے اُسی وقت مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا۔ جس میں متفقہ طور پر قرار پایا کہ عام سول نافرمانی شروع کی جائے۔ میر واعظ محمد یوسف صاحب بھی اجلاس میں شریک تھے۔ کھلے اجلاس میں شریک ہونے والے مندوبین کو تار، ڈاک، اور قاصدوں کے ذریعہ اپنے اپنے علاقوں میں رہنے کیلئے اطلاعات ارسال کردیں تاکہ اس طرح سول نافرمانی کی صورت میں وہ سرینگر میں گرفتار نہ کئے جائیں بلکہ اپنے اپنے علاقوں میں تحریک کو جاری رکھیں۔

اسی دن شام کے قریب ایک دوست نے آکر مجھے بتایا کہ میر واعظ کے بھائی اور سکرٹری مسلم کانفرنس سرینگر کو حکومت نے بلوا کر کچھ کہا سنا ہے۔ جس کی وجہ سے میر واعظ سول نافرمانی کے فیصلہ سے منہ موڑ گئے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آیا لیکن عام سول نافرمانی کی قرارداد جو شہر میں مشہور ہوچکی تھی اتفاق سے ابھی تک پریس میں نہیں گئی تھی۔ میں نے اُسے احتیاطاً روک لیا۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد متذکرہ خبر کی تصدیق ہوگئی۔ جس سے مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ میری طویل اور مسلسل سیاسی زندگی میں یہ سانحہ بڑا ہی شدید تھا کیونکہ ایک طرف حکومت اپنے مقصد میں کامیاب ہورہی تھی دوسری طرف نیشنل کانفرنس کی خوشی اور طنز دونوں ہمارے لئے سوہان روح تھے۔ علاوہ ازیں اپنے کثرت رفقاء کو بھی جو میر واعظ کے پرانے نکتہ چین اور مخالف تھے۔ ایک بالکل صحیح اور

جائز بات ہاتھ آ گئی۔ لیکن سب سے بڑی اُلجھن اور مشکل یہ تھی کہ اب کُھلے اِجلاس اور عام سِول نافرمانی کے سلسلہ میں کیا کیا جائے دوسرے دن صبح پھر مجلسِ عاملہ کا اجلاس طلب کیا گیا، کھلے اجلاس میں صرف چند گھنٹے باقی تھے اور ہماری پریشانی میں دم بدم اضافہ ہو رہا تھا۔ حالت بے دلی میں میری تجویز پر یہ قرار پایا کہ میں بحیثیت صدر اور آغا شوکت علی (جو ابھی ابھی ملازمت ترک کر کے جماعت میں شامل ہوئے تھے) بحیثیت جنرل سکرٹری، صرف ہم دونوں بطور احتجاج انفرادی سول نافرمانی کریں۔

اگر ''جنوں' عرفِ عام میں دماغی عدم توازن کا دوسرا نام ہے تو میرے نزدیک ہر وہ کام خواہ وہ نیک، معقول اور درست ہی کیوں نہ ہو، جس میں اعتدال سے بہت زیادہ استغراق، مستعدی، اور لگن کا اظہار کیا جائے۔ یعنی انسان بالکل اسی کام میں فنا ہونے کی حد تک پہنچ جائے تو یہ کام بھی ''جنوں'' کی ایک کیفیت یا قسم ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے ہم 'جنوں صالح'' کہہ سکتے ہیں۔ قومی معاملات میں مسلم کانفرنس کے چند کارکنوں کی مسلسل دُھن بھی اُن کے اسی جنوں کی ایک نشانی تھی۔ خارزار اسیری میں قدم رکھنے کیلئے جو آئے دن ہمارا تلوا کھجلاتا تھا اس کی بھی یہی وجہ تھی اور سلسلہ میں یہ عجیب بات ہے کہ ہماری خلاف قانون کاروائیوں کا آغاز اکثر موسم بہار کی ابتدا ہی میں ہوتا رہا ہے۔

بہرحال جیل میں جانیکا جنوں پھر سر پر سوار ہوا۔ اسی رات کھلے اجلاس میں حکومت کی عائد کردہ پابندی کو توڑ کر آغا شوکت علی، مولوی نورالدین اور میں گرفتار ہو گئے۔ میں نے اپنی تقریر میں انفرادی سول نافرمانی کے وجوہ بیان کرتے ہوئے کارکنوں کو شدید قسم کی ہدایات دیں کہ وہ کسی صورت میں بھی سول نافرمانی کر کے جماعتی ڈسپلن کو خراب نہ کریں۔ بلکہ آنے والی آئینی

صورت حال کا مقابلہ کریں اور انتخابات اسمبلی میں اپنی جماعتی اور قومی قوت کا ثبوت دیں۔ اس موقع پر یہ بات عجیب سی ہوئی کہ میر واعظ یوسف شاہ صاحب کو، جنہوں نے اس خلاف قانون کھلے اجلاس میں پورا حصہ لیا، حکومت نے گرفتار نہ کیا۔ لیکن اس کے برعکس مسٹر ساغر جو میری ہدایات کے مطابق پنڈال سے میلوں دور رہے، میری قیام گاہ پر رات کے بارہ بجے میرے ساتھ ہی گرفتار کر لئے گئے اور اس طرح مسٹر محمد اسماعیل ساغر اور مسٹر محی الدین راہبر آف سرینگر بھی پکڑے گئے۔

چودھری حمید اللہ خان صاحب قائد مسلم کانفرنس اسمبلی گروپ کو میں نے بہ مشورہ مجلس عاملہ اپنی غیر حاضری میں قائم مقام صدر مسلم کانفرنس نامزد کر دیا۔

عام سول نافرمانی کے فیصلہ کو توڑ کر انفرادی سول نافرمانی چونکہ اچانک ہماری مرضی اور خواہش کے خلاف عمل میں آئی اس لئے اس وقت مجھے اس کا بے حد صدمہ ہوا۔ لیکن جس طرح دنیا میں اکثر چیزیں جنہیں ہم اپنے لئے اچھا سمجھتے ہیں وہ بطور نتیجہ مضر ثابت ہوتی ہیں اور اس کے برعکس کئی باتیں جنہیں ہم بُرا سمجھتے ہیں وہ فی الواقع ہمارے حق میں اچھی ہوتی ہیں اسی طرح عام سول نافرمانی کے فیصلے میں تبدیلی قومی نقطہ نگاہ سے درست ثابت ہوئی کیونکہ اس دفعہ ہمیں خلاف توقع معمولی اور ٹیکنیکل سے جرم کی پاداش میں دو تین تین سال جیل میں رکھا گیا اگر عام نافرمانی عمل میں آئی ہوتی تو سینکڑوں کارکن اس قتل عام میں جو قیام پاکستان کے بعد ہوا۔ جیل خانوں کی تاریک کوٹھڑیوں کے اندر ہی اندر ابدی نیند سُلا دیئے جاتے۔

اس بات کی تفصیل کہ میں اور مسٹر ساغر اُس وقت جیل میں کس طرح بچ گئے اپنے مقام پر آئے گی۔ بہر حال تقسیم ہند کے تعلق میں نئے پیدا شدہ حالات

کے مقابلے کیلئے کانفرنس کے کارکنوں کا جیل سے باہر رہنا بے حد مفید ثابت ہوا۔

ریاست میں ہماری آخری قید کے زمانے میں خوشگوار اور ناخوشگوار دونوں قسم کے کئی انقلاب آئے۔ پاکستان بنا، مشرقی پنجاب اور ریاست جموں و کشمیر میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ گو میں نے اس خونی ہولی کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن جیل کی چار دیواری کے اندر بیٹھ کر مارنے والوں کی گولیوں کی آوازیں مرنے والے مظلوموں کی آخری چیخیں، اغوا ہونے والی سینکڑوں معصوم دوشیزاؤں کی بے اثر آہیں اور فریادیں ایک مجبور قیدی کی حیثیت میں کلیجہ تھام کر اپنے کانوں سے سنیں۔ اسی آخری زمانہ قید میں جہاد کشمیر کی ابتدا ہوئی اور جب

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

غلام عباس

مری ۱۹۵۰ء

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

ریاست جموں و کشمیر میں حضرت قائد اعظم محمد علی جناح
کے دست راست اور تحریک پاکستان کے قافلہ سالار
قائد کشمیر رئیس الاحرار

چوہدری غلام عباس مرحوم

یوم پیدائش۔ ۴ر فروری ۱۹۰۴ء
یوم وفات۔ ۱۸ر دسمبر ۱۹۶۷ء

PIONEERS OF FREEDOM
CHAUDHRY GHULAM ABBAS
PAKISTAN پاکستان

چوہدری غلام عباس